بلاک: 4 مغل حکومت

فہرست

اکائی 14 : مغلیہ حکومت کا قیام، عروج اور استحکام

اکائی کے اجزاء

14.1 مقصد

اس اکائی میں بتایا جائے گا کہ مغلیہ حکومت کب قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں بابر کا کیا رول ہے۔ مغلیہ حکومت کے عروج و استحکام میں کن کن حکمرانوں کی کیا خدمات ہیں۔ ملک کی ترقی، خوشحالی، رعایا کی فلاح و بہبود، امن و امان کی بحالی اور عدل و انصاف کے قیام اور معاشرتی اصلاح کے لیے کیا اقدامات کیے۔

14.2 تمہید

ہندوستان کی تاریخ میں مغلیہ حکومت کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور کے حکمرانوں نے ہندوستان کو ایک متحدہ اکائی بنایا، اور توسیع کی۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ٹھوس اقدامات کیے۔ رواداری کی پالیسی اختیار کی۔ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اہم پالیسی بنائی اور اس کو

نافذ کیا۔ملک کے نظم و نسق کو مضبوط بنایا۔علم و ادب کی خوب خوب سرپرستی کی اور فن تعمیر و فنون لطیفہ میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔

14.3 مغلیہ حکومت کا قیام

14.3.1 ظہیر الدین محمد بابر (عہد حکومت 1530-1526ء)

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد ظہیر الدین محمد بابر نے 1526ء میں رکھی۔ظہیر الدین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا کی والدہ کا نام قتلغ نگار خانم تھا۔والد کی طرف سے اس کا سلسلہ نسب امیر تیمور سے اور والدہ کی طرف سے چنگیز خان سے ملتا ہے۔تیمور سے اس کا سلسلہ نسب اس طرح ہے:بابر بن عمر شیخ مرزا بن ابو سعید مرزا بن مرزا سلطان بن میران شاہ بن تیمور۔

بابر اپنے والد عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد جون 1494ء میں گیارہ سال کی عمر میں فرغانہ کا حکمراں بنا۔لیکن سیاسی حالات نے اسے چین نصیب نہ ہونے دیا۔اس کی ابتدائی زندگی مشکلات سے گھری ہوئی تھی۔یہ مشکلات اس کے مخالف چچا اور ماموں نے پیدا کی تھیں۔جو فرغانہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔اس نے 1497ء اور 1503ء میں سمرقند پر جو تیمور کا پایہ تخت تھا۔قبضہ کرنے کی کوشش کی لیکن خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔اس کے بعد وہ کابل چلا آیا۔

1504ء میں اس نے اپنے چچا الغ بیگ مرزا کی وفات کے بعد کابل پر قبضہ کرلیا۔وہاں ایک مضبوط حکومت قائم کرلی۔تیموری حکمراں اب تک مرزا کہلاتے تھے۔بابر نے پہلی مرتبہ 1507ء میں شاہ کا لقب اختیار کیا۔1511ء میں بابر نے ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی کی مدد سے سمرقند،بخارا اور خراسان پر فتح حاصل کرلی۔لیکن یہ فتح دیرپا ثابت نہ ہوسکی۔اور 1512ء میں بابر کو کابل واپس جانا پڑا۔سمرقند پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کے بعد بابر نے اپنے موروثی علاقوں کے حکمراں بننے کے دیرینہ خواب کو خیرباد کردیا۔اور اپنی پوری توجہ ہندوستان کی طرف مرکوز کردی۔بابر ہندوستان کے ان علاقوں پر جو تیمور فتح کرچکا تھا اپنا خاندانی اور موروثی حق سمجھتا تھا اور اس پر حکومت کرنے کا دعویٰ رکھتا تھا۔اسی لیے اس نے ہندوستان کی فتح کا منصوبہ بنایا۔اپنی فوجی طاقت کو منظم و مضبوط کرنے کی بھرپور کوشش کی۔دو ترکی توپچیوں استاد علی رومی اور دوسرے ماہر مصطفیٰ رومی کی مدد سے ایک جدید توپ خانہ فراہم کیا۔1419ء میں بابر نے باجور کا محاصرہ کیا اور قبضہ کرکے اپنی حکومت میں شامل کرلیا۔اس کے بعد اس نے دریائے سندھ پار کیا اور پنجاب کا رخ کیا،جس کو تقریباً 120 سال پہلے تیموری ریاست کا حصہ بننے کے سبب وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

ابراہیم لودھی کے دو امیروں دولت خاں گورنر پنجاب اور ابراہیم کے چچا علام خاں علاء الدین نے جو اپنے بادشاہ ابراہیم لودھی سے ناراض ہوگئے تھے،بابر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی۔اس دعوت پر بابر نے ہندوستان پر پانچ حملے کیے۔1524ء میں بابر نے ہندوستان پر اپنا چوتھا حملہ کیا اور لاہور اور دیپال پور کو فتح کرلیا۔1525ء میں ہندوستان پر پانچواں حملہ کیا اور پنجاب میں اپنے مخالفین کو شکست دے کر دہلی کی جانب بڑھا۔دہلی کا بادشاہ ابراہیم لودھی بھی بابر سے مقابلہ کے لیے پنجاب کی طرف بڑھا۔بابر کے سپاہیوں کی کل تعداد کا تخمینہ 8 سے 24 ہزار تک کیا جاتا ہے،لیکن وہ انتہائی منظم تھے۔ان کے ساتھ جدید اور کارکرد توپ خانہ تھا اور رائق جنرل کمانڈر تھا۔ابراہیم کی فوج تقریباً ایک لاکھ تھی۔لیکن وہ نہ تو اتنی تجربہ کار تھی اور نہ ہی منظم تھی۔21 اپریل 1526ء کو دونوں افواج پانی پت کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل صف

آراء ہوئیں۔ جنگ صبح دس بجے سے شروع ہوئی۔غروب آفتاب تک جاری رہی۔اس جنگ میں بابر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔پندرہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ ابراہیم لودھی بھی مارا گیا۔اس کے بعد فوری طور پر دہلی اور آگرہ بابر کے قبضے میں آ گئے۔اس طرح ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد پڑی جو آگے چل کر اپنی وسعت' آبادی' وسائل اور تہذیب کے لحاظ سے ایک عظیم الشان حکومت بن گئی۔

پانی پت کی تاریخی فتح کے بعد بابر نے اپنی فوج کا ایک دستہ اپنے لڑکے مرزا ہمایوں کی قیادت میں آگرہ پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا اور مہدی خواجہ کو' جو کہ بابر کا برادر نسبتی تھا' دہلی کی طرف روانہ کیا۔جمعہ 27 اپریل کو دہلی کی مسجد جامع میں بابر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا' اور غرباء و فقراء کو خیرات تقسیم کی گئی۔10 مئی 1526ء کو بابر دہلی سے آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔آگرہ میں ہمایوں نے اس کو کوہ نور ہیرا پیش کیا جو اس نے گوالیار کے راجہ وکرماجیت کے اہل وعیال سے حاصل کیا تھا۔متعدد افغان سرداروں نے آگرہ میں آکر بابر کی حکمرانی کو قبول کیا۔بابر کے سپاہیوں نے سنبھل' اٹاوہ' قنوج' کالپی' دھول پور' بیانہ وغیرہ کے علاقوں پر قبضہ کر کے ان کو حکومت میں شامل کر لیا۔16 مارچ 1527ء کو بابر نے میواڑ کے راجپوت والی رانا سانگا سے جنگ کی۔جو کہ بابر کی دوسری اہم جنگ ہے۔خانوہ کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔جس میں راجپوتوں کو شکست ہوئی اور رانا سانگا زخمی ہوا اور کچھ دنوں بعد اس کی وفات ہو گئی۔رانا سانگا کی موت سے راجپوتوں کی قوت کمزور ہو گئی۔

ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد افغان سردار مشرق کی جانب فرار ہو گئے تھے اور بہار میں اپنا پیر جمانے کی کوشش کرنے لگے۔وہاں انہوں نے بنگال کے حکمراں نصرت شاہ کی مدد بھی حاصل کی۔لیکن بابر نے ان کو بہار اور اودھ کی سرحد پر گھاگرہ ندی کے کنارے 6 مئی 1529ء کو ایک بار پھر شکست فاش دی۔اس فتح سے بہار پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا اور اب مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گوالیار اور چندیری تک پھیل گئی۔

1528ء سے بابر کی صحت آہستہ آہستہ گر رہی تھی۔بابر جسمانی وذہنی طور پر کمزور ہوتا جا رہا تھا۔آخر کار بیمار پڑا اور 26 دسمبر 1530ء کو 47 سال کی عمر میں آگرہ میں وفات پائی۔

بابر غیر معمولی لیاقت واستعداد کا مالک تھا اس کی شخصیت بڑی دلکش تھی۔وہ صرف ایک نہایت محتاط سپہ سالار اور قابل حکمراں ہی نہیں نہ تھا بلکہ وہ ایک نقاش' باغوں اور گلزاروں کا شوقین اور ایک باکمال شاعر اور مصنف بھی تھا۔وہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔اس کی کتاب ''تزک بابری'' ترکی ادب کا ایک شاہکار سمجھی جاتی ہے۔بابر کی ایک تصنیف اس کا دیوان ہے' جس کا اکثر حصہ ترکی زبان میں ہے اور جو نظم کی ہر صنف سخن پر مشتمل ہے اس میں چند نظمیں فارسی زبان میں بھی ہیں۔وہ خطاط بھی اعلیٰ درجہ کا تھا اور ایک خاص خط ایجاد کیا تھا جسے خط بابری کہا جاتا ہے۔

14.4 نصیر الدین محمد ہمایوں (1556-1508)

ہمایوں بابر کی وفات کے بعد ہندوستان کا دوسرا مغل حکمراں بنا۔ہمایوں کا پورا نام نصیر الدین محمد ہمایوں ہے۔وہ بابر کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔6 مارچ 1508ء کو کابل کے محل میں پیدا ہوا۔اسے باپ کی زندگی ہی میں کئی ایسے مواقع میسر آئے جن سے فائدہ اٹھا کر اس نے فوجی اور مملکت داری کے تجربے حاصل کیے۔بادشاہ بننے سے پہلے بابر نے اپنی زندگی میں دو بار بدخشاں کی حکومت اس کے سپرد کی۔پہلی مرتبہ 1520

ء سے 1525ء تک اور دوسری مرتبہ 1527ء سے 1529ء تک۔ ہندوستان میں 1529ء میں کچھ عرصہ کے لیے وہ ایک بہت ہی شورش پسند علاقہ ''سنبھل'' کا بھی گورنر رہا۔ بابر کی وفات کے چار روز بعد 29 دسمبر 1530ء کو شہر آگرہ میں ہمایوں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت 23 سال تھی۔ امراء و افسران حکومت نے غیر مشروط وفاداری کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد ہمایوں نے امرا و افسران کی گذشتہ کارروائیوں کی جانچ پڑتال کیے بغیر ان کو اپنے اپنے عہدوں پر برقرار رکھا۔

ہمایوں کو باپ سے وراثت میں ایک وسیع مملکت ملی تھی جو کہ دریائے آمو سے بہار تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے مغربی علاقے قندز' بدخشاں' کابل' غزنی اور قندھار تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ملتان' پنجاب' اتر پردیش اور بہار کا کچھ علاقہ اس کی حکمرانی میں شامل تھا۔ بیانہ' تھنبور' گوالیار' الور اور چندیری اس کی سلطنت اور راجپوتانہ و مالوہ کی ریاستوں کے درمیان ایک غیر مستقل حیثیت رکھتے تھے۔ اس سلطنت کا نظم و نسق غیر مستحکم تھا۔ نیز ہمایوں کے مخالفین میں قریبی عزیز تھے۔ بابر نے جب وفات پائی تو ہمایوں کا بھائی کامران کابل اور قندھار پر قابض تھا' ہمایوں نے سنبھل کی حکومت اپنے دوسرے بھائی ہندال کے سپرد کی اور میوات اپنے تیسرے بھائی عسکری کو دیا۔ کامران سازشی تھا۔ ہندال اور عسکری کمزور تھے۔ دوسری طرف افغان اپنے سردار محمود دلودی اور شیر خاں سوری کی قیادت میں اپنی طاقت کو منظم و مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنگال کا حکمران نصرت شاہ ابھی بھی افغانوں کا حلیف تھا۔ گجرات میں بہادر شاہ ایک طاقتور حکمران تھا اور ہمایوں کا حریف تھا۔

ہمایوں نے کالنجر کی فتح پر توجہ مرکوز کی اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ مزید دباؤ ڈالنے کے لیے اس نے جونپور اور چنار گڑھ کا بھی محاصرہ کر لیا جہاں اس نے شیر شاہ سوری کو شکست دی۔ 1532ء میں گجرات کے سلطان بہادر شاہ کے خلاف فوج کشی کی اور لاماڈو کے قلعہ پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر شاہ کے تعاقب میں چمپانیر فتح کرتا ہوا آگے تک پہنچا کیونکہ اس نے باغی مغلوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ گجرات کی تسخیر ہمایوں کے لیے ایک عظیم کامیابی تھی۔ اپنے برادر خورد مرزا عسکری کو گجرات کا حاکم مقرر کر کے ہمایوں آگرہ واپس چلا آیا۔ گجرات سے ہمایوں کی غیر موجودگی اور فوج کی نااہلی کا فائدہ اٹھا کر بہادر شاہ نے یکے بعد دیگرے گجرات کے اہم فوجی مرکزوں پر پھر سے قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہمایوں کی کامیابی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

اسی اثناء میں بہار کے افغانی حکمران شیر شاہ سوری نے ہمایوں کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر اپنی طاقت کو مستحکم کر لیا۔ ہمایوں نے شیر خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور اس سے پیدا ہونے والے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اکتوبر 1537ء میں اس کے خلاف فوج کشی کی اور چنار کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ چھ مہینے کی پیہم جدوجہد کے بعد مارچ 1538ء میں ہمایوں نے چنار پر فتح حاصل کر لی۔ پھر ایک طویل مہم کے بعد اگست 1538ء کو ہمایوں نے بنگال کے دارالحکومت گور پر بھی فتح حاصل کر لی۔ شیر خاں نے اس دوران مغل حکومت کے شمالی علاقوں پر حملہ کر کے تلیا گڑھی سے قنوج تک کے سارے علاقوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اسی دوران آگرہ میں ہمایوں کے چھوٹے بھائی ہندال نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ ان نازک حالات کے مدنظر ہمایوں نے مجبوراً گور سے آگرہ جانے کا فیصلہ کیا۔ مارچ 1539ء میں ہمایوں گور سے رخصت ہوا اور مونگیر کے راستے جون 1539ء میں بکسر سے کچھ فاصلہ پر شمال مغرب میں واقع چوسا کے مقام پر قیام کیا۔ 25 جون 1539ء کی رات کو شیر خاں نے مغل فوجوں پر شب خون مارا اور زبردست شکست دی اور ہمایوں کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔

شیر خاں نے چوسا کی جنگ میں تاریخی کامیابی کے بعد اپنا لقب شیر شاہ اختیار کیا' اپنی تخت نشینی کا اعلان کیا اور آگرہ کی جانب چل پڑا

۔اس کے سرداروں نے لکھنؤ اور قنوج پر قبضہ کرلیا۔قنوج کی جنگ میں ہمایوں کو دوسری مرتبہ پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ہمایوں کے سامنے اپنے باپ کی بنائی ہوئی مملکت کو خیر باد کہنے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا تھا۔چنانچہ ہمایوں نے اپنے بھائیوں کی نا اتفاقی اور سرداروں کی نا اہلی کے پیش نظر نومبر 1540ء میں ہندوستان کو خیر باد کہہ کر راجپوتانہ کے راستے سندھ چلا گیا۔سندھ میں قیام کے دوران ہمایوں نے شیخ اکبر جامی کی بیٹی حمیدہ بانو سے 29 اگست 1541 میں شادی کرلی۔اسی بیگم کے بطن سے 15 اکتوبر 1542ء جلال الدین محمد اکبر پیدا ہوا۔

ہمایوں ہرات پہنچا تو شاہ ایران نے قزوین میں استقبال کیا اور تخت کی بازیابی میں شاہ طہماسپ نے اس کی بھرپور مدد کی۔1544ء میں شاہ طہماسپ نے ایک بڑی فوج کے ساتھ ہمایوں کو قندھار روانہ کیا۔اس نے قندھار و کابل پر فتح حاصل کرلی۔یہی وہ زمانہ تھا جب شیر شاہ کے بعد جانشین اپنے اپنے حق کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے۔اس طرح سے سوری حکومت اپنی فوجی و سیاسی طاقت کھو چکی تھی۔شیر شاہ سوری (وفات 1545ء) اور اسلام شاہ سوری (وفات 1553) کے بعد سوری حکومت طوائف الملوکی اور آپسی نا اتفاقی کا شکار ہوگئی۔اور سوری حکمراں عادل شاہ سوری کے خلاف علم بغاوت بلند ہونے لگا۔

ہمایوں نے حالات موافق پا کر ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت کو دوبارہ حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور قندھار اور کابل پر قبضہ کرنے کے بعد 25 دسمبر 1554ء میں پیشاور پہنچا۔پیشاور پر قبضہ کے بعد لاہور پر فتح حاصل کی۔پھر مغل فوج نے یکے بعد دیگرے دیپال پور، ہریانہ اور جالندھر پر قبضہ جمالیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد اس کے وفادار مصاحب بیرم خاں کی قیادت میں مغل فوجوں کی افغانوں سے ماچھی واڑہ کے میدان میں 15 مئی 1555ء کو معرکہ آرائی ہوئی۔اس جنگ میں افغانوں کو شکست ہوئی۔پھر دوسرا مقابلہ مغلوں اور افغانوں کے درمیان 22 جون 1555ء میں سرہند میں ہوا۔اس جنگ میں مغل افواج نے سکندر شاہ سوری کو شکست دی۔ اس جنگ کے بعد دہلی کی فتح کے لیے راستہ ہموار ہوگیا۔جب 23 جولائی 1555ء میں دہلی پہنچا تو اس کی کوئی مزاحمت نہ ہوئی اور اس طرح سے وہ اپنی کھوئی ہوئی حکومت دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ہمایوں نے اپنے بیٹے جلال الدین اکبر کو پنجاب کا گورنر مقرر کیا اور خود اس نے نظام حکومت قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ہمایوں کا یہ دوسرا دور مشکل ہی سے چند مہینے ہی گزرا تھا کہ 24 جنوری 1556ء کی شام کو دہلی میں شاہی کتب خانہ کے زینہ سے گر کر شدید زخمی ہوا اور وفات پائی۔مرنے کے بعد ''جنت آشیانی'' اسکا لقب ہوا۔اس کی بیوہ حاجی بیگم نے دہلی میں اس کے لیے ایک عظیم الشان مقبرہ تعمیر کروایا۔

ہمایوں فطری طور پر کریم النفس تھا جب کسی کو سزا دینا چاہتا تو وہ اسے معاف کردیتا۔زندگی میں وہ ایک پرخلوص دوست اور ساتھی تھا۔لیکن ان سب کے باوجود حکمراں کی حیثیت سے اس میں فوجی فراست، تدبر، مہارت اور سیاسی دانائی کی کمی تھی۔کتب بینی کا دلدادہ تھا۔شاعر بھی تھا۔اس کا ایک دیوان بھی ہے۔تمدنی اقدار کا بھی عاشق تھا۔

14.5 جلال الدین محمد اکبر (1556-1605)

ابوالفتح، جلال الدین محمد اکبر بن ہمایوں بن بابر، ہمایوں کی وفات کے بعد ہندوستان میں خاندان مغلیہ کا تیسرا حکمراں بنا۔جلال الدین محمد اکبر 15 اکتوبر 1542ء کو امرکوٹ (سندھ) میں پیدا ہوا۔اکبر کی عمر 13 سال کی ہوئی تو اس کے والد ہمایوں کا انتقال ہوگیا۔وفات کے

وقت اکبر دہلی سے دور کالانور (ضلع گورداس پور، پنجاب) میں تھا۔ 14 فروری 1556ء کو بیرم خاں نے اکبر کی بادشاہت کا اعلان کردیا، اور تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی ۔اکبر کی تخت نشینی کے وقت مغل حکومت کے سامنے بہت سنگین مسائل تھے۔

عادل شاہ سوری کا وزیر ہیمو بقال نے دہلی اور آگرہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا اور خود تخت کا دعویدار بن بیٹھا۔اس کی خبر اکبر کو جالندھر میں ملی تو مغل فوج تیزی سے اکبر اور اس کے اتالیق بیرم خاں کی سرگردگی میں دہلی کی طرف روانہ ہوئی۔5 نومبر 1556ء میں پانی پت کے تاریخی میدان میں مغل فوج اور افغان فوج کے درمیان گھمسان کی جنگ ہوئی۔جس میں افغان فوج ہار گئی اور ہیمو بقال زخمی ہو کر گرفتار ہوا اور بعد میں قتل کر دیا گیا۔اس فتح کے بعد دہلی اور آگرہ پر اکبر کا پھر سے قبضہ ہو گیا۔

سلطنت کے استحکام کے لیے ضروری تھا کہ ارد گرد کی خود مختار ریاستوں اور سرکش و باغی سرداروں کو مطیع کیا جائے، خصوصاً افغان سرداروں کے ذہن سے بادشاہت کا خیال نکال دیا جائے، چنانچہ سب سے پہلے سکندر سور کے خلاف اقدامات کیے گئے، جو مان کوٹ میں محصور ہو گیا تھا۔24 مئی 1557ء کو اس نے اطاقت قبول کر لی اور بہار چلا گیا۔اس طرح پورا پنجاب اس کے ماتحت آ گیا۔اسی سال اجمیر پر اور 1559ء میں گوالیار پر قبضہ ہو گیا۔1559ء تک خان زماں نے عادل شاہ کے امراء کو شکست دے کر سنبھل سے لکھنو اور الہ آباد سے جونپور تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ان فتوحات سے ہندوستان میں مغل حکومت کو کافی استحکام حاصل ہوا۔مغلیہ حکومت کے دائرہ کی یہ توسیع بڑی حد تک اتالیق بیرم خاں کی کوشش و محنت کا ثمرہ تھی

جلال الدین محمد اکبر نے 1556ء سے 1560ء تک اپنے اتالیق بیرم خاں کی سرپرستی میں حکومت کی۔بیرم خاں کے حریفوں اور مخالفین کی کوششیں رنگ لائیں۔1560ء میں اکبر نے ایک فرمان کے ذریعہ بیرم کو اس کے عہدے سے سبکدوش کر کے حجاز جانے کی اجازت دیدی اور تمام شاہی اختیارات خود سنبھال لینے کا اعلان کر دیا۔آخر کار سفر حرمین کے دوران ہی کھمبایت میں مبارک خاں لوحانی کے ہاتھوں 31 جنوری 1561ء میں بیرم خان قتل کیا گیا۔

توسیع سلطنت

بیرم خان کے قتل کے بعد اکبر نے عنان حکومت مکمل طور سے اپنے ہاتھوں میں لے لی اور بیرم خاں سے ملک گیری اور عملی سیاست کے جو گراں قدر تجربات حاصل کیے تھے انہیں استعمال میں لاتے ہوئے اپنی پوری توجہ توسیع مملکت کی طرف مبذول کر دی اور ایک بہت ہی مختصر مدت میں مالوہ (1561ء) ،گونڈوانہ (1561ء)، رنتھمبور (1569ء) کالنجر (1569ء) گجرات (1572-1573ء) اور بنگال (1575ء) کے علاقے اپنی حکومت کے حدود میں شامل کر لیے۔اکبر نے ایک طرف تو کالنجر، رنتھمبور، گوالیار اور چتور جیسے اہم مستحکم قلعے فتح کر کے اپنی عسکری قابلیت اور مستحکم فوجی قوت کا ثبوت پیش کیا اور علاقائی فرمانرواؤں کو یہ احساس بھی دلایا کہ ان کی حکومتیں اور جاگیریں اب شہنشاہ کی اطاعت کے بغیر باقی نہیں رہ سکتیں تو دوسری جانب ادہم خان، خان زماں، بہادر خان اور عبد اللہ خاں ازبک جیسے نامور اور طاقتور سرداروں کی بغاوت کا خاتمہ کر کے ثابت کر دیا کہ مغل حکومت مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہے۔1976ء تک اکبر کی حکومت کے حدود میں کم و بیش پورا شمالی ہند آ چکا تھا۔ اس کے بعد بھی حدود مملکت میں توسیع کی پالیسی قائم رہی اور بعض ایسے صوبے بھی فتح کر لیے گئے جو اب تک سلطنت دہلی کی حدود میں کبھی نہیں آئے تھے۔ 1586ء میں کشمیر، 92-1591ء میں سندھ، 1594ء میں بلوچستان و مکران اور 1595ء میں قندھار فتح کیا گیا۔پھر اکبر نے دکن کا

رخ کیا اور 1591ء میں جنوبی ہند کی چار آزاد ریاستوں خاندیش، احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کے حکمرانوں کے یہاں مغلیہ سلطنت کا باجگوار بن جانے کا پیغام دے کر اپنے نمائندوں کو بھیجا۔ لیکن صرف خاندیش کے حکمراں راجہ علی خاں فاروقی نے اس کے پیغام کو قبول کیا۔ 1593ء میں اکبر نے ایک فوج عبدالرحیم خانخاناں اور شہزادہ مراد کی سرکردگی میں احمد نگر کی فتح کے لیے روانہ کی لیکن سات سال کی مسلسل فوج کشی کے باوجود بھی احمد نگر کی مہم میں مغلوں کو مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اسی اثناء میں راجہ علی خان کے جانشین اور خاندیش کے حکمراں میراں بہادر شاہ فاروقی نے بغاوت کا پرچم بلند کیا اور اسیر گڑھ کے قلعہ میں قلعہ بند ہو کر مغل فوج کے خلاف لڑائی لڑی۔ اکبر نے بنفس نفیس 1599ء میں خاندیش پر حملہ کیا اور دارالحکومت برہان پور پر قبضہ کر لیا اور چاروں طرف سے اسیر گڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ بالآخر میراں بہادر شاہ نے شکست مان لی اور 6 جنوری 1601ء کو اسیر گڑھ پر مغل پرچم لہرا دیا گیا اور خاندیش کو اکبر نے اپنی مملکت کی حدود میں شامل کر لیا۔ ایسے ہی دکن کی دیگر ریاستوں کے خلاف بھی اکبر فوجی مہم کا ارادہ رکھتا تھا لیکن الہ آباد میں اپنے بڑے لڑکے شہزادہ سلیم کی بغاوت کے سبب مجبوراً دکن کی تسخیر کی پالیسی کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ رخصت ہونا پڑا۔ اکبر کو اپنی آخری عمر میں بہت سے صدمات برداشت کرنے پڑے۔ راجہ ٹوڈرمل، بیربل کے بعد اپنے عالم و فاضل دوست ابوالفضل سے بھی محروم ہونا پڑا۔ شہزادہ مراد 1599ء اور شہزادہ دانیال 1604ء کی موت نے بھی اسے بے حد کمزور کر دیا۔ 10 ستمبر 1604ء کو اس کی ماں حمیدہ بانو بیگم کا بھی انتقال ہو گیا۔ اکبر کی زندگی کے آخری ایام شہزادہ سلیم کی باغیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اور بھی تکلیف دہ بن گئے تھے۔ اکبر 3 اکتوبر 1605ء کو بیمار پڑا اور تین ہفتوں کی علالت کے بعد 26 اکتوبر 1605ء کو 63 سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔

اکبر کا شمار دنیا کے عظیم فاتح حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ذہین و فطین حکمراں تھا، اس نے انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں کئی ایجادات کیں۔ اس کا عظیم کارنامہ نظام محاصل ہے۔ اس کے ذریعہ پچھلی دس سالہ جمع بندی کے تحت آئندہ دس برسوں کی جمع بندی کی گئی۔ لگان وصول کرنے کے ضابطے مقرر ہوئے۔ زراعت کو ترقی دینے کے طور طریقے اور مزارعین کی اصلاح کے تعلق سے قوانین جاری ہوئے۔ اکبر کے عہد سے پہلے فوجیوں کو جاگیریں اور انعامات ملا کرتے تھے۔ اکبر نے اپنے دور میں پہلی مرتبہ تنخواہ دینے کی شروعات کی۔ اس کے دور میں پورے ملک میں اصول انصاف کی باقاعدہ سختی سے پابندی کرائی جاتی۔ ہندوؤں کے فیصلے پنڈتوں کے سامنے اور مسلمانوں کے فیصلے قاضیوں کی عدالت میں ہوتے تھے۔ اوزان پیمائش، غذائی اشیا کی جانچ پڑتال اور جرائم کے سدباب کے لیے صوبوں میں محتسب مقرر کیے جاتے تھے۔ غیر مسلم رعایا کے مذہبی رجحانات کا احترام کیا جاتا تھا۔ مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے 1526ء میں جنگی قیدیوں کو جبریہ غلام بنانے کے قانون کو منسوخ کر دیا گیا۔ 1563ء میں ہندو زائرین پر لگایا جانے والا 'یاتری محصول' معاف کر دیا گیا۔ 1564ء میں غیر مسلموں پر لگایا جانے والا مذہبی محصول جزیہ کو معاف کر دیا گیا۔ غیر مسلموں کو فوج اور حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کر کے اکبر نے مذہبی وسیع النظری اور آزادی کی ایک بہترین مثال قائم کی۔

اکبر اہل علم و فضل کا بہت قدردان تھا۔ اس کے دور میں علوم و فنون کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اس کے دربار سے ابوالفضل، فیضی، عبدالقادر بدایونی، عبدالرحیم خانخاناں، نقیب خان، نظام الدین بخشی، ملا مبارک اور میر فتح اللہ شیرازی جیسے مشہور و معروف علماء وابستہ تھے۔ جنھوں نے علم و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ عرفی، نظیری، شکیبی اور رحیدری تبریزی جن میں فارسی کے بڑے شعراء اس کے دربار سے وابستہ تھے۔ نیز کئی مصور، خطاط، ماہر معمار اور ماہر موسیقی کار کا تعلق بھی اس کے دربار سے تھا۔ جیسے میر سید علی تبریزی، خواجہ عبدالصمد، اشرف خاں، سید حسینی، رام

داس،میاں چاند محمد حسین کاشمیری، تان سین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اکبر کا ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ سنسکرت، عربی اور ترکی کی کئی اہم کتابوں کے ترجمے کروائے اور فارسی میں نئی کتابیں تصنیف کروائیں۔تراجم میں مہابھارت، رامائن، پنچ تنتر، اتھرو وید، لیلاوتی، سنگھاسن بتیسی، تزک بابری، حیاۃ الحیوان، معجم البلدان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔فن تعمیر کے متعدد قابل قدر نمونے اکبر کی یادگاریں ہیں جیسے دہلی میں، ہمایوں کا مقبرہ، سیکری میں مقبرہ سلیم چشتی: اسی طرح اٹک، آگرہ، فتح پور سیکری، لاہور اور الہ آباد کے قلعے قابل دید ہیں۔

14.6 نورالدین جہانگیر (1605-1627)

اکبر کے بعد اس کا بڑا شہزادہ نورالدین محمد جہانگیر دہلی میں خاندان مغلیہ کے چوتھے بادشاہ کے طور پر تخت نشین ہوا۔جہانگیر کی والدہ مریم الزمانی تھی۔اس کی پیدائش 31 اگست 1569ء میں آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کے مقام پر ہندوستان کے مشہور بزرگ شیخ سلیم چشتی کی خانقاہ میں ہوئی۔اس بزرگ ہستی کے نام پر شہزادے کا نام بھی سلیم ہی رکھا گیا۔لیکن اکبر ہمیشہ شہزادے کو شیخو بابا کے نام سے پکارتا تھا۔کیونکہ اکبر احتراماً بزرگ شیخ کا نام زبان پر لانا نہیں چاہتا تھا۔

اکبر کی وفات کے آٹھ روز بعد 3 نومبر 1605ء کو جہانگیر ابوالمظفر نورالدین محمد پادشاہ غازی کے لقب سے تخت نشین ہوا۔تخت نشینی کے چھ ماہ بعد ہی جہانگیر کو اپنے سب سے بڑے بیٹے خسرو کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔خسرو اکبر کا چہیتا پوتا تھا اور حکومت کے بعض امراء جن میں راجہ مان سنگھ اور مرزا عزیز خان کوکہ شامل تھے اس کو سلیم کی جگہ پر اکبر کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔لیکن اکبر نے اپنی حیات میں ہی سلیم کو اپنی پگڑی اور تلوار دے کر اپنا جانشین مقرر کرایا تھا۔خسرو کی بغاوت کے بعد اگرچہ بادشاہ جہانگیر اور خسرو میں مصالحت ہوگئی لیکن جہانگیر نے اپنے بیٹے کی اس گستاخی کو کبھی معاف نہیں کیا۔بالآخر خسرو نے 1622ء میں برہان پور کے مقام پر انتقال کیا۔اس کے انتقال سے جہانگیر کی ایک بڑی پریشانی دور ہوگئی۔

1611ء میں جہانگیر نے نور جہاں سے شادی کی۔نور جہاں غیاث الدین کی بیٹی تھی، جو اعتماد الدولہ کے نام سے مشہور ہے۔اس کے ساتھ ہی ایک حکمراں کی حیثیت سے جہانگیر کے ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔شہنشاہ جہانگیر سے شادی ہو جانے کے بعد نور جہاں نے آہستہ آہستہ تمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور سلطنت پر کافی اثر انداز ہونے لگی اور اس کا نام شہنشاہ کے نام کے ساتھ طلائی سکوں پر کندہ ہونے لگا۔

میواڑ کی تسخیر جہانگیر کے دور حکومت کا ایک اہم واقعہ ہے۔اکبر اپنے دور میں بہت کوششوں کے باوجود اس کو مکمل طور پر فتح کرنے میں ناکام رہا تھا۔شہنشاہ جہانگیر نے اپنے دور میں باپ کے چھوڑے ہوئے اس ادھورے کام کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔1605ء میں اس نے اپنے بیٹے شہزادہ پرویز کو فتح میواڑ کی مہم پر مامور کیا لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔جہانگیر نے متعدد امرا کو اس کام کے لیے تعینات کیا لیکن کامیابی نہیں ملی۔فتح میواڑ کے لیے آصف خاں کو جے پور کے راجہ جگن ناتھ کو شریک کار کی حیثیت سے کمان دی گئی۔اس کے بعد مہابت خان کو 1608ء میں اور پھر عبداللہ خاں کو 1609ء میں کمان دی گئی۔آخر کار 1614ء میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اس مہم پر روانہ کیا۔اس کے بعد شہزادہ خرم کی سیاسی اور فوجی تدبیریں کام آئیں اور 1615ء میں راجہ امیر سنگھ نے صلح کی درخواست کی۔خرم کے آگے رانا نے

اطاقت قبول کی اور فراخدلانہ شرائط پر معاہدہ امن ہوا جو کہ مغل ۔راجپوت تعلقات کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔

1608ء میں جہانگیر نے عبدالرحیم خانخاناں کو احمد نگر کی مہم پر مامور کیا۔لیکن احمد نگر کے حبشی سردار ملک عنبر نے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔پھر 1610ء میں جہانگیر نے شہزادہ پرویز اور آصف خاں کو احمد نگر کے خلاف فوج کشی کا حکم دیا لیکن یہ مہم بھی ناکام رہی۔آخر کار 1617ء میں شہزادہ خرم کو احمد نگر پر اہم فتح حاصل ہوئی۔ جہانگیر نے اس فتح کا جشن منایا اور خرم کو شاہ جہاں کا لقب دیا۔1620ء میں ملک عنبر نے صلح کی شرائط توڑ کر احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ایک مرتبہ پھر شہزادہ خرم کو دکن کی مہم پر جانا پڑا۔بالآخر 1621ء میں فریقین میں ایک مرتبہ پھر معاہدہ ہو گیا اور ملک عنبر نے احمد نگر سلطنت کے کچھ اور علاقے مغلوں کے حوالے کر دیے۔احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ نے 12 لاکھ 18 لاکھ اور 20 لاکھ روپے سالانہ محصول کے طور پر مغل حکومت کو دینا قبول کر لیا۔

1622ء میں جہانگیر کے بیٹے شہزادہ خرم نے اپنے باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔اس بغاوت میں شہزادہ خرم اور نور جہاں کی باہمی رنجش کا بڑا دخل تھا۔شہزادہ خرم کی شادی نور جہاں کے بھائی آصف خاں کی لڑکی سے ہوئی تھی اور شہریار جو جہانگیر کا چھوٹا بیٹا تھا اس کا عقد نور جہاں کی بیٹی لاڈو بیگم سے ہوا جو نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن سے تھی۔نور جہاں کی خواہش یہ تھی کہ جہانگیر کے بعد اس کا داماد جانشین بنے۔خرم کی بغاوت خاصی پھیل گئی اور 1625ء سے 1626ء تک خرم شاہی افواج سے لوہا لیتا رہا۔آخر کار اس نے مہابت خاں کے سامنے ہتھیار ڈالا دیے اور باپ سے معافی مانگ لی۔

1626ء میں جہانگیر کابل کے لیے روانہ ہوا۔جہلم کے کنارے جب شاہی کیمپ قائم تھا تو مہابت خاں نے اچانک شہنشاہ کو اپنی تحویل میں لے لیا لیکن آخر کار نور جہاں نے اسے آزادی دلانے میں کامیابی حاصل کی۔اس کے بعد مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے 1627ء میں لاہور میں اس کا انتقال ہو گیا۔انتقال کے وقت اس کی عمر 58 سال تھی۔اس نے کل 22 سال حکومت کی۔لاہور میں ہی دفن کیا گیا۔جہاں اس کی بیوہ نے اپنے خرچ سے ایک شاندار مقبرہ تعمیر کروایا۔

جہانگیر کے دور حکومت کے دو مشہور واقعات قاضی نوراللہ شوستری کا قتل اور حضرت مجدد الف ثانی کی اسیری ہے۔جنہیں جہانگیر کے حکم پر گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا تھا، لیکن کم و بیش ایک سال کے بعد بادشاہ نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے انہیں رہا کر دیا۔

جہانگیر ایک عالم و فاضل شخص تھا۔وہ مردم شناس اور مسائل میں گہری نظر رکھنے والا تھا۔وہ نرم دل اور کریم النفس بھی تھا۔انصاف پسند اور عادل بادشاہ تھا۔اس نے اپنے محل کی دیوار کے ساتھ سونے کی ایک زنجیر مع گھنٹیوں کے نصب کروائی تھی اور حکم دے رکھا تھا کہ جس شخص کو کوئی شکایت ہو اور ہم سے ملنا چاہتا ہو وہ رات کے وقت بھی اس زنجیر کو ہلا کر بادشاہ سے فریاد کر سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں۔اس کا دور حکومت رعایا کے لیے امن و خوشحالی کا دور تھا۔اس دور میں صنعت و تجارت کو بھی خوب فروغ حاصل ہوا اور سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال و استحکام پیدا ہوا۔

جہانگیر ادب، فنون لطیفہ اور بالخصوص مصوری کا نہایت دلدادہ تھا۔وہ فارسی، ترکی، عربی اور ہندوستانی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا۔ بابر کی طرح اس نے بھی اپنی سوانح حیات خود اپنے ہاتھوں سے تصنیف کی اور اس کا نام ''تزک جہانگیری'' رکھا۔اس کی سرپرستی میں فن مصوری نے بہت ترقی کی اور مصوری کا وہ دبستان جس کو مغل مصوری کہا جاتا ہے۔اس کے عہد میں اپنے معراج کو پہنچ گیا تھا۔استاد ابوالحسن نادرالزماں،

استاد منصور، بشن داش اور گوردھن اس دور کے ممتاز مصور تھے۔

14.7 شہاب الدین شاہجہاں (1627-1657)

جہانگیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا خرم ' شہاب الدین محمد شاہجہاں پادشاہ غازی کے نام سے تخت نشین ہوا۔ تحت نشینی کو ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ بندیل کھنڈ کے راجا ججھر سنگھ نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے شاہجہاں فوری طور پر گوالیار پہنچا۔ ججھر نے شاہی فوج سے مقابلہ کرنا بے سود سمجھا اور مہابت خان کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد 1629ء میں خان جہاں لودھی نے بغاوت کر دی اور دکن فرار ہو گیا۔ بالآخر 1631ء میں شیہونڈا کے مقام پر (جو ضلع باندہ میں ہے) مادھو سنگھ راجپوت کے نیزے سے زخمی ہو کر مارا گیا۔

شاہجہاں نے 1629ء میں دکن کی نامکمل تسخیر کو پائے تکمیل تک پہنچانے کے لیے دکن پہنچ کر احمد نگر اور بیجاپور کے خلاف مہم کا آغاز کیا اور بالاگھاٹ' ناسک اور سنگم نیر پر فتح حاصل کی۔ 1691ء میں شاہجہاں کی محبوب بیوی ممتاز محل کی 7 جون 1631ء کو وفات ہوگئی۔ ممتاز محل کی موت کی وجہ سے شاہجہاں کو دکن کی مہم کو نامکمل چھوڑ کر آگرہ کے لیے روانہ ہونا پڑا۔ پھر 1632ء میں مہابت خاں کو جنوبی مہم پر مامور کیا گیا۔ مہابت خاں نے 1633ء میں احمد نگر سلطنت کے قلعہ دولت آباد پر قبضہ کر لیا اور احمد نگر کے سلطان حسین نظام شاہ کو گوالیار میں قید کر دیا گیا اور یوں احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ 1636ء میں ایک مرتبہ پھر دکن کی تسخیر کے لیے شاہجہاں خود دولت آباد روانہ ہوا اور آخر کار بیجاپور کے سلطان سے مصالحت ہوگئی۔ صلح کی شرائط کے مطابق سلطان بیجاپور نے 20 لاکھ روپے سالانہ ادا کرنا منظور کیا' نیز مراٹھوں کے خلاف مہم میں مغلوں کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ شہنشاہ شاہجہاں نے بیجاپور کے سلطان کو پارندہ اور کونکن کے علاقے جاگیر میں عطا کیے۔ 1936ء میں ہی ریاست گولکنڈہ کے سلطان عبداللہ قطب شاہ سے بھی مصالحت ہوگئی۔ اور مئی' جون 1636ء میں عبداللہ قطب شاہ نے مغل شہنشاہ کی مرضی کے مطابق ایک معاہدہ پر دستخط کر دیا۔ اس معاہدے میں یہ بات شامل تھی کہ خلفائے راشدین کے نام کے ساتھ ساتھ مغل شہنشاہ کا نام بھی خطبے میں پڑھا جائے گا اور سکوں پر بھی ان کا نام کندہ ہوگا۔ گولکنڈہ کے حاکم نے یہ وعدہ کیا کہ وہ ہمیشہ شہنشاہ کا مطیع رہے گا' اگر بے وفائی کی تو ریاست چھین لی جائے گی۔ نیز قطب شاہ نے سالانہ دو لاکھ ہن یا چھ لاکھ روپیہ پیش کش دینا قبول کیا۔

سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں پرتگالی ایک تاجر کی حیثیت سے ہندوستان آئے اور جلد ہی ہندوستان کے مغربی ساحل کی اہم بندرگاہوں کو چین' گوا' دمن اور دیو پر اپنا قبضہ جما لیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہگلی کی بندرگاہ پر بھی قبضہ کر لیا اور بنگال کی تجارت میں مداخلت شروع کر دی۔ 1632ء میں بنگال کے صوبہ دار قاسم خان نے شاہجہاں سے پرتگالیوں کے خلاف فوج کشی کی اجازت مانگی۔ شہنشاہ نے اجازت دے دی۔ تقریباً چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد پرتگالیوں کو سخت شکست ہوئی اور ہگلی کو پرتگالیوں سے چھین لیا گیا۔ 1634ء میں شاہجہاں نے ایک چھوٹی مہم بلتستان (تبت خورد) کے حکمراں ابدال کے خلاف بھیجی اور ابدال کو مغل شہنشاہ کا اقتدار قبول کرنے اور سالانہ پیش کش دینے پر مجبور کیا۔

ہندوستان اور ایران دونوں کے درمیان عرصہ سے قندھار کے تعلق سے نزاع چلا آ رہا تھا۔ شاہ ایران کے وزیر سے شدید اختلافات کی وجہ سے قندھار کے ایرانی حاکم علی مردان خاں نے مغلوں سے مدد مانگی اور قندھار کو حوالہ کرنے کی پیش کش کی۔ 1638ء میں غزنی کا کمانڈر اور

کابل کا گورنر قلعہ میں داخل ہوگیا اور علی مردان نے مغل شہنشاہ سے وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے قلعہ حوالے کردیا۔ اس طرح سے قندھار مغلوں کے قبضہ میں آ گیا اور علی مردان خاں کو مغل کی طرف سے انعام واکرام سے نوازا گیا اور کچھ دنوں کے بعد علی مردان کو کشمیر کا صوبہ دار مقرر کردیا گیا' لیکن ایرانیوں نے 1649ء میں قندھار کو دوبارہ لے لیا' اور قندھار کا قلعہ مغلوں کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔

شاہجہاں کے دورِ حکومت کا ایک اہم واقعہ وسط ایشیا کے خلاف فوج کشی کا ہے۔ شاہجہاں نے شہزادہ مراد کو اس مہم کا سربراہ بنایا۔ جولائی 1645ء میں مراد بدخشاں میں داخل ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک طاقتور فوج کی مدد سے بلخ پر حملہ کرکے فتح کرلیا۔ بلخ کے حاکم اور ازبکوں کے سردار نذر محمد مراد کی کامیابی سے پریشان ہوکر ایران فرار ہوگیا لیکن مراد نے اس مہم کی زیادہ دنوں تک قیادت نہیں کی اور باپ کی حکم عدولی کرکے کابل واپس چلا آیا۔ شاہجہاں نے مراد کی جگہ شہزادہ اورنگ زیب کو اس مہم کی قیادت کے لیے مقرر کیا اور مہم جاری رکھنے کا حکم دیا' لیکن شہزادہ اورنگ زیب بھی اس مہم کو زیادہ دیر قائم نہ رکھ سکا اور ان علاقوں پر تسلط قائم کرنے میں ناکام رہا اور وہاں سے واپسی پر مجبور ہوگیا۔ اس طرح سے وسط ایشیا کی مہم ناکام ہوگئی۔

1652ء میں شہزادہ اورنگ زیب کو دوبارہ دکن کا صوبہ دار مقرر کیا گیا' جہاں اس کی جارحانہ حکمت عملی کو شاہجہاں نے روکا اور حکم دیا کہ حاکم گولکنڈہ عبداللہ قطب شاہ ' جس پر اس نے حملہ کردیا تھا' سے صلح کرلے۔ چنانچہ 1656ء میں مغلوں اور گولکنڈہ کے درمیان صلح ہوگئی' لیکن اورنگ زیب نے بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کے خلاف فوج کشی کرکے بیدر اور کلیان پر قبضہ کرلیا۔

ستمبر 1657ء میں شاہجہاں شدید بیمار ہوا تو اس کی علالت کی خبر پاکر اس کے چاروں بیٹوں دارا شکوہ' شجاع' اورنگ زیب اور مراد بخش میں حصول اقتدار کے لیے آپس میں کشمکش شروع ہوگئی۔ اورنگ زیب نے دارا شکوہ کو ساموگڑھ میں شکست فاش دی اور شاہ شجاع کو الہ آباد کے قریب کھجوہ کے مقام پر شکست دی اور وہ اراکان کے جنگلوں میں فرار ہوگیا جہاں اس کی وفات ہوگئی اور مراد بخش کو قید کرکے قتل کرا دیا۔ نیز شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کرکے خود آگرہ میں تخت نشین ہوگیا اور شاہجہاں نے طویل نظر بندی کے دن گزارنے کے بعد 22 جنوری 1666ء کو 74 سال کی عمر میں وفات پائی۔

شاہجہاں کا تیس سالہ دورِ حکومت مغلیہ سلطنت کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس کا دور خوشحالی کا دور تھا۔ تہذیبی امور میں شاہجہاں کے عہد حکومت میں ہندوستان نے کافی ترقی کی۔ اس دور میں علم وادب کا بھی خوب فروغ ہوا۔ شاہجہاں کے دو بیٹے دارا شکوہ اور اورنگ زیب صاحب تصنیف اور انشاء پرداز تھے۔ اس کی بیٹی جہاں آراء بیگم کی کتاب مونس الارواح کافی مشہور ہے۔ اس کے امراء میں ظفر خاں احسن اور نواب شکر اللہ خان بھی صاحب تصنیف تھے۔ بادشاہ خود فارسی اور سنسکرت ادب کے دلدادہ تھا۔ سنسکرت کے عظیم شاعر جگناتھ پنڈت' چنتامنی اور سندر داس اس کے دربار سے متعلق تھے۔ ایسے ہی حاجی محمد' جان قدسی' ملک الشعراء ابو طالب کلیم' غنی کاشمیری' منیر لاہوری وغیرہ اسی دور سے متعلق تھے۔

فن تعمیر اور فنون لطیفہ کو بھی اس دور میں کافی ترقی ملی۔ آگرہ کی تزئین وآرائش' شاہجہاں آباد کی تعمیر' جامع مسجد دہلی' لال قلعہ دہلی' تاج محل آگرہ وغیرہ کی تعمیر عہد شاہجہانی کی عظمت اور شان وشوکت کی آج بھی شہادت دے رہی ہے۔ فن موسیقی میں تان سین کا داماد لال خاں اور ماہر موسیقی جگن ناتھ بہت مقبول ہوئے۔ عہد شاہجہانی میں شبیہ سازی کو بڑی ترقی ملی اور تصویریں رنگ وحواشی کے لحاظ سے زیادہ شاندار ہوگئیں۔ فن خطاطی بھی اس عہد میں اوج کمال تک پہنچی۔ چنانچہ عبدالرشید دیلمی مشہور خطاط کا تعلق اسی زمانے سے ہے۔ اس کا خط نستعلیق خاص ندرت

رکھتا ہے۔کندہ کاری‘نگینہ کاری‘مہر سازی جیسے فنون کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔

14.8 محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (1658-1707)

ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر 3 نومبر 1618ء کو مالوہ میں پیدا ہوا۔ابتدائی زمانے ہی سے اس کی تعلیم وتربیت کا اچھا انتظام کیا گیا اوراس نے عربی‘ فارسی‘ قرآن وحدیث کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور شاہجہاں کے دورحکومت میں کئی اہم عہدے پر فائز رہا۔ستمبر 1657ء میں جب شاہجہاں شدید بیمار ہوا اوراس کے چاروں بیٹوں کے درمیان حصول تخت کے لیے چپقلش بڑھی تو جون 1658ء میں اورنگ زیب نے شاہجہاں کو آگرہ کے قلعے میں نظر بند کردیا اور سلطنت مغلیہ پر فرمانروائی کا آغاز کردیا۔

اورنگ زیب نے اپنی تخت نشینی کی پہلی رسم دہلی کے قریب باغ اعزآباد میں (جو بعد میں شالیمار باغ کے نام سے مشہور ہوا) نہایت سادگی کے ساتھ ادا کی اور ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی کا لقب اختیار کرکے 31/جولائی 1658ء میں اپنی بادشاہت کا باضابطہ اعلان کیا۔اس نے حصول تخت کے خواہاں دیگر بھائیوں سے نمٹنے کے بعد اپنی دوسری رسم تخت نشینی شان وشوکت کے ساتھ 5/جون 1659ء کو دہلی میں ادا کی۔

اورنگ زیب نے پچاس سال دو ماہ اور ستائیس دن حکومت کی۔اس نے اپنی طویل دور حکومت میں توسیع سلطنت اور استحکام وتحفظ مملکت کے لیے کئی جنگیں لڑیں اور بغاوتوں کو ختم کیا اور اصلاحات کیں۔اپنی دور حکومت کے پہلے پچیس سال شمالی ہندوستان میں بغاوتوں کو ختم کرنے اور اصلاحات نافذ کرنے اور آخری پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں صرف کیے۔

اورنگ زیب نے تخت نشین ہوتے ہی اہم صوبوں میں اپنے آدمی مقرر کیے‘چنانچہ دکن کی ذمہ داری شائستہ خان کے سپرد کی اور میر جملہ کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا۔بنگال کا صوبہ دار میر جملہ ایک کامیاب سپہ سالار اور منتظم تھا۔میر جملہ نے کوچ بہار کے قلعہ پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔اس کے بعد میر جملہ نے دریائے برہم پتر کو عبور کیا اور آسام کو فتح کرکے اسے پہلی مرتبہ مغل بادشاہ کا باجگذار بنایا۔میر جملہ کی وفات کے بعد اورنگ زیب نے اپنے ماموں شائستہ خان کو بنگال کا صوبہ دار مقرر کردیا۔شائستہ خان نے کئی اہم کارنامے انجام دیے۔اس علاقے میں سواحل پر ماگ قوم فرنگی قزاقوں سے مل کر لوٹ مار کرتی رہتی تھی۔اورنگ زیب نے شائستہ خان کو حکم دیا کہ ان غارت گروں کی سرکوبی کرے اور استیصال کرے‘چنانچہ 1666ء میں شائستہ خان نے اپنے بڑے بیٹے امین خان کو باقاعدہ اس مہم پر روانہ کیا۔پرتگیز حلیفوں نے تو لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیا‘لیکن اراکان کے رئیس اور راجہ ان کے حامی بن گئے اور کئی دریائی معرکے ہوئے۔آخر کار چٹگانگ کے مضبوط قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔اس کامیابی پر بادشاہ نے شائستہ خان اوراس کے ساتھیوں کو انعام واکرام سے نوازا اور شائستہ خان کو ہفت ہزاری کا منصب بھی دیا۔شائستہ خان نے بنگال کے نظم ونسق کو اچھی طرح درست کیا۔اس کے دور میں متعدد مدرسے‘مسجدیں‘پل اور سڑکیں تعمیر ہوئیں اوراشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول کیا گیا۔

پنجاب اور کابل کے درمیان جنگجو قبائل تھے‘وہ اکثر بغاوتیں اور شورشیں کرتے رہتے تھے۔اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں بھی اس علاقے کے قبائل نے بغاوتیں کیں۔خصوصاً یوسف زئیوں نے 1667ء میں سوات‘باجور اور پیشاور کے علاقے میں علم بغاوت بلند کیا اور

آفریدیوں نے 1672ء میں اپنے سردار اکمل خان کی قیادت میں بغاوت کی اور علی مسجد کی جنگ میں افغانستان کے حاکم محمد امین خان کو شکست دی۔ خٹک قبائل نے آفریدیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح سے اورنگ زیب کے لیے ان علاقوں میں انتظامی مسئلہ پیدا ہوگیا۔ مزید صورت حال کو بگڑتا دیکھ کر بادشاہ بذات خود حسن ابدال روانہ ہوا اور وہاں ڈیڑھ سال قیام کر کے قبائل پر قابو پانے کی کوشش کی۔ تادیبی دستے ہر طرف پھیلا دیے۔ چند مہینوں میں باغیوں اور شرکشوں نے سزا پائی۔ ہرنا کے پرشاہی فوج تعینات ہوئی اور جنگی چوکیاں قائم ہوئیں۔ اس طرح سے ان قبائل کی بغاوت کو ختم کرنے میں کامیابی ملی۔ 1676ء میں اورنگ زیب نے امیر خاں کو کابل کا صوبہ دار مقرر کیا امیر خان نے اپنی وفات (1698ء) تک کابل پر حکمرانی کی اور مغلیہ حکومت کی شمال مغربی سرحدوں پر نظم و نسق بحال رکھا۔

1668-1675ء کے درمیان متھرا میں جاٹوں نے 'نارنول میں ستنامیوں (جوجوگیوں کا ایک فرقہ تھا) نے اور پنجاب میں سکھوں نے بغاوتیں کیں۔ مشہور مورخ پروفیسر عرفان حبیب کے مطابق یہ بغاوتیں بہت حد تک کسانوں کی تھیں جو کہ زرعی محصول یا مالگزاری کے نظام میں تبدیلی کی وجہ سے حکومت سے ناراض تھے۔ ان بغاوتوں کو دبایا گیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کو 1678ء سے 1681ء کی مدت میں مارواڑ (جودھپور) اور میواڑ (اودے پور) کے راجپوتوں کی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا۔ 10/دسمبر 1678ء میں مارواڑ کے لاولد راجہ جسونت سنگھ کی وفات ہوگئی' اس کے بھتیجے اندر سنگھ کو جودھپور کا راجہ مقرر کیا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد متوفی کی دو رانیوں سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ جن میں ایک پیدائش کے بعد ہی فوت ہوگیا اور دوسرا بیٹا اجیت سنگھ بعد میں جودھپور کا راجہ بنا۔ اجیت سنگھ کی ماں "ٹھاکر درگا داس اور دیگر حامیوں نے اورنگ زیب سے اجیت سنگھ کو راجہ بنانے کا مطالبہ کیا۔ بادشاہ اورنگ زیب کے انکار کرنے کے بعد ٹھاکر درگا داس اور دیگر راجپوت سرداروں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ صوبائی حکام نے اس کی سرکوبی کرنی چاہی لیکن وہ بھاگ کر میواڑ (اودے پور) پہنچ گیا۔ اودے پور کا رانا سنگھ بھی اس کا حامی و مددگار بن گیا۔ نتیجتاً راجپوتوں نے بغاوت کر دی۔ بغاوت کو کچلنے کے لیے ستمبر 1679ء میں شہزادہ اکبر کو بھیجا گیا۔ راجپوتوں نے مجبوراً سازش کی راہ تلاش کی۔ رانا اودے پور اور ٹھاکر نے شہزادہ اکبر کو بادشاہی کے سبز باغ دکھائے۔ اور خود اس کی اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اس طرح سے شہزادہ اکبر کو باپ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے اورنگ زیب بذات خود اجمیر کی طرف روانہ ہوا اور اجمیر سے دس میل جنوب دو ہارا میں قیام پذیر ہوا۔ اورنگ زیب نے حالات کا نہایت ثابت قدمی سے مقابلہ کیا۔ ہوشیاری اور حکمت عملی سے کام لے کر شہزادہ اکبر اور راجپوتوں کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اس نے راجپوتوں کو شہزادے سے علاحدہ کر دیا۔ بادشاہی فوج ایک پچیس سالہ شہزادے کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ چند ہی دنوں میں بہت سے سردار اور سپاہی شہزادہ اکبر کو چھوڑ کر اجمیر چلے آئے جہاں اس وقت اورنگ زیب مقیم تھا۔ اورنگ زیب نے از سر نو لشکر مرتب کیا۔ اکبر شکست کھانے کے بعد اپنے راجپوت حلیفوں کے ساتھ دکن فرار ہوگیا اور پھر وہاں سے ایران چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

درگا داس ٹھاکر بھی اکبر کے ساتھ ہی راجپوتانے سے فرار ہوگیا تھا' اودے پور کا رانا بھی پہاڑوں میں جا چھپا تھا۔ مگر وہاں بھی اورنگ زیب کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ مجبوراً معافی طلب کی' اور دو پرگنے اورنگ زیب کو پیش کیے۔ اورنگ زیب نے درگزر سے کام لیا اور ان کی ریاست بحال کر دی اس طرح سے ان علاقوں میں حالات معمول پر آگئے اور امن قائم ہوگیا۔

اورنگ زیب نے اپنے دورِحکومت میں دکن کی نامکمل تسخیر کو پائے تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔1665ء میں اس نے راجہ جے سنگھ کو دکن کا صوبےدار مقرر کر کے بیجاپور اور مراٹھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی سرکوبی کا حکم دیا۔دکن میں مراٹھا سردار شیواجی نے (جو شاہ جی بھونسلے کالڑ کا تھا) اپنی طاقت بہت بڑھالی تھی۔شیواجی اعلیٰ درجہ کا مدبر' گوریلا طرز جنگ کا ماہر سپاہی تھا' اس نے دکن کے کئی قلعوں پر قبضہ جمالیا تھا۔ راجہ جے سنگھ نے دکن پہنچنے کے بعد شیواجی کے خلاف محاذ قائم کیا اور اسے شکست دے کر صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ جے سنگھ نے معاہدہ پورندھ کے ذریعہ شیواجی کو مجبور کیا کہ اپنے 37 قلعوں میں سے 23 قلعے مغلوں کے حوالے کردے۔شیواجی نے بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے کے بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کے خلاف جنگ میں مغلوں کی حمایت کا یقین دلایا۔جے سنگھ نے اس فتح کے بعد بیجاپور کے خلاف مہم چھیڑی لیکن اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔1666ء میں اورنگ زیب نے اسے واپس بلالیا۔جے سنگھ کے بعد دیگر صوبیداروں بہادر خاں اور دلیر خان نے بھی بیجاپور کے محاذ میں ہزیمتیں اٹھائیں۔اس لیے ستمبر 1681ء میں اورنگ زیب کو برہان پور خود آنا پڑا۔اورنگ زیب نے برہان پور پہنچنے کے بعد سب سے پہلے مراٹھوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔چاروں طرف سے مراٹھا حکمراں شمبھاجی کے علاقوں پر حملہ کیا' لیکن کامیابی حاصل نہ ہوئی۔آخر کار مقرب خاں کی قیادت میں 1689ء میں مغل فوج نے رتناگری کے قریب قائم مراٹھا کیمپ پر اچانک حملہ کر دیا۔شمبھاجی اور اس کا وزیر مقرب خاں کے ہاتھوں گرفتار ہوا اور بعد میں دونوں کو سزائے موت ہوئی۔

مراٹھوں کے خلاف محاذ آرائی میں بادشاہ اورنگ زیب کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ مراٹھا قوت پوری طرح اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی ہے جب تک کہ بیجاپور اور ریاست گولکنڈہ سے نہ نپٹ لیا جائے۔چنانچہ 1685ء میں شہزادہ محمد معظم کی قیادت میں مغل فوج نے بیجاپور کا محاصرہ کرلیا۔بالآخر بیجاپور والوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔22 / ستمبر 1686ء کو بیجاپور کے سلطان سکندر عادل شاہ نے قلعہ اورنگ زیب کے حوالے کردیا۔عادل شاہ کو خاں کا لقب ملا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ بطور پنشن دے کر سبکدوش کر دیا گیا اور بیجاپور کو سلطنت مغلیہ کا حصہ بنالیا گیا۔پھر اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر چڑھائی کی۔آٹھ ماہ تک گولکنڈہ کا محاصرہ چلا پھر بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔آخر کار اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے ایک افغان امیر عبداللہ کی مدد سے قلعہ کو فتح کیا۔اس طرح گولکنڈہ کی ریاست کا خاتمہ ہوگیا اور اس کو مغلیہ سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح کے بعد اورنگ زیب نے 1689 ء سے 1707ء تک مسلسل مراٹھوں کی طاقت کو ختم کرنے میں لگا رہا۔سب سے پہلے بسنت گڑھ فتح ہوا پھر ستارا' تورنا اور کھیلنا وغیرہ کے قلعے تسخیر ہوئے۔پرنالا اور بھوسان گڑھ کے قلعوں پر بھی قبضہ ہوگیا۔لیکن مغل سرداروں کی آپسی چپقلش اور سازش کی وجہ سے مراٹھوں کی طاقت کو مکمل طور سے کچلنے میں اورنگ زیب کامیاب نہ ہوسکا۔سخت محنت اور مسلسل فوج کشی نے اورنگ زیب کی صحت پر برا اثر ڈالا اور اورنگ زیب کا 89 سال کی عمر میں 3 مارچ 1707ء کو احمد نگر میں انتقال ہوگیا۔

اورنگ زیب کا شمار مغلیہ حکومت کے اہم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔تخت نشینی کے بعد رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے اورنگ زیب نے کئی اہم اصلاحی اقدامات کیے۔مغلیہ دور میں سکوں پر کلمہ طیبہ لکھا جاتا تھا۔اورنگ زیب نے کلمہ طیبہ کی بے حرمتی کا خیال کرتے ہوئے آئندہ کے لیے سکوں پر کلمہ کا کندہ کرانا بند کرادیا۔بھنگ کی کاشت بھی ممنوع قرار دیا گیا۔مسلمانوں کے اخلاق و اطوار کی اصلاح کے لیے محکمہ احتساب قائم کیا۔ ملک کے اندر تمام قصبوں اور شہروں میں بڑے مستعد محتسب مقرر کیے جو لوگوں کو معاشرتی برائیوں یعنی شراب پینے' جوا کھیلنے سے منع کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید و فروخت کو بھی ممنوع قرار دیا گیا۔دربار میں ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کی رسم رائج تھی اسے بھی ختم کر دیا گیا۔دربار میں گانا بجانا اور

رقص وسرور کی محفلیں بند کردی گئیں ۔جشن نوروز بند کردیا گیا ۔بادشاہ کے ماتھے پر تلک لگانا، زمین بوسی اور جھروکے درشن کی رسمیں موقوف کردی گئیں ۔جشن ولادت اور جشن تخت نشینی سادہ طریقے سے منانے کا حکم دیا گیا ۔بادشاہ کو سونے اور چاندی میں تو لنے کی رسم ختم کردی گئی ۔درباری لباس میں اصلاح کی گئی ۔امراء کے لیے زیورات اور ریشمی کپڑے پہننا ممنوع قرار دیا گیا ۔ستی کی رسم ممنوع ہوگئی ۔ملک میں اسّی کے قریب ناجائز ٹیکس وصول کیے جارہے تھے ۔ان میں محصول راہ داری جو اشیا تجارت پر مالیت کے اعتبار سے دس فیصد شرح سے عائد تھا معاف کردیے گئے ۔ٹول ٹیکس اور مختلف دیگر محصول جن کو ابواب کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا اور گنگا جمنا پر نہانے کا ٹیکس وغیرہ بھی معاف کردیا گیا ۔ان اقدامات سے عام آدمی کو فائدہ پہنچا۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ حکومت تقریباً 150 سال تک قائم رہی ۔اورنگ زیب کے بعد اس کے جانشینوں کے دورحکومت میں بڑی تیزی سے مغل حکومت کا زوال ہونے لگا ۔اس کے جانشینوں میں بہادر شاہ اول (عہد حکومت 1707-1712ء) ایک طاقتور حکمراں تھا اور اس کے دور میں مغلیہ حکومت کی سرحدیں تقریباً اتنی ہی تھیں جتنی اورنگ زیب کے وفات کے وقت تھی ۔اس کے بعد فرخ سیر (عہد حکومت 1712-1719) کے زمانہ میں اگرچہ حکومت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئی تھیں، لیکن اس کے باوجود اس وقت تک مغلیہ حکومت کے اثر و اقتدار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔پھر محمد شاہ (عہد حکومت 1719-1754) تخت نشین ہوا ۔اسی دور سے مغلیہ حکومت کے زوال کا آغاز ہوگیا ۔اسی زمانے میں ایرانی حکمراں نادر شاہ کا حملہ (1739ء) دہلی پر ہوا ۔محمد شاہ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے احمد شاہ (عہد حکومت 1748-1754) عالمگیر ثانی (عہد حکومت 1754-1759)، شاہ عالم ثانی (عہد حکومت 1759-1806)، اکبر شاہ ثانی (عہد حکومت 1806-1837) اور بہادر شاہ ظفر (عہد حکومت 1837-1857) نے حکومت کی ۔اس طرح ہندوستان میں جس حکومت کی بنیاد بابر نے 1526ء میں رکھی تھی- 1857ء میں ہمیشہ کے لیے اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

14.9 خلاصہ

ظہیر الدین محمد بابر نے 21/اپریل 1926ء کو ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں تاریخی شکست دی اور ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیا ڈالی ۔اور کئی علاقے فتح کر کے مغلیہ حکومت کو وسیع کیا ۔اس کی کوششوں سے مغلیہ حکومت کی حدود سندھ سے بہار تک اور ہمالیہ سے گوالیار اور چندیری تک پھیل گئی ۔بابر کی وفات کے بعد اس کا لڑکا نصیر الدین محمد ہمایوں تخت نشین ہوا ۔اس نے اپنے دور میں اٹھنے والی بغاوتوں کو ختم کیا اور آخر کار چوسا کی جنگ میں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران چلا گیا ۔پھر شاہ ایران سے مدد حاصل کی اور ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا ۔ہمایوں کے بعد جلال الدین محمد اکبر 13 سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔اس نے ابتداء میں اپنے اتالیق بیرم خان کی سرپرستی میں حکومت کی ۔بیرم خان کے قتل کے بعد اکبر نے عنان حکومت مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لی ۔اپنی حکومت کی حدود کو وسیع کیا۔نظام محاصل کو درست کیا۔انتظام سلطنت اور مذہبی امور میں کئی ایجادات کیں ۔نورالدین جہانگیر کے بعد دور حکومت میں بھی کئی بغاوتیں ہوئیں ۔ان بغاوتوں کو ختم کیا۔میواڑ کی تسخیر اس دور کا اہم واقعہ ہے ۔اس کے دور میں سیاسی لحاظ سے سلطنت میں استقلال اور استحکام پیدا ہوا ۔اس دور کے عدل و انصاف کی کہانیاں اب تک مشہور ہیں ۔اس دور میں خصوصاً مصوری کو بہت فروغ ملا ۔جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا ۔اس دور میں بھی کئی علاقے فتح کیے گئے ۔شاہجہاں کا دور تہذیبی لحاظ سے کافی اہم شمار کیا جاتا ہے ۔اس کا تیس سالہ دور

خوشحالی کا دور تھا۔اس کے بعد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بنا۔اورنگ زیب نے اپنی دورِحکومت کے پچیس سال دکن کے حالات درست کرنے میں صرف کیے۔اورنگ زیب کے بعد مغلیہ حکومت زوال پذیر ہوگئی۔اس کے نا اہل جانشینوں نے حکومت کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ بالآخر 1857ء میں مغلیہ حکومت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

14.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھیے۔

1. بابر کے بارے میں آپ اپنی معلومات تحریر کیجیے۔
2. جلال الدین محمد اکبر کی فتوحات کو تفصیل سے لکھیے۔
3. اورنگ زیب کے دورِحکومت میں دکن کی تسخیر سے متعلق اپنی معلومات تحریر کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4. ہندوستان میں مغلیہ حکومت کی بنیاد کیسے پڑی؟ روشنی ڈالیے۔
5. ہمایوں نے ہندوستان میں اپنی کھوئی ہوئی سلطنت دوبارہ کیسے حاصل کیا۔
6. شاہجہاں کی حکومت پر روشنی ڈالیے۔

14.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ: (حصہ دوم) ثروت صولت۔مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔نئی دہلی
2. مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال: آر۔پی۔ترپاٹھی۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
3. اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر۔شبلی نعمانی ۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔
4. تزک بابری۔بابر
5. منتخب التواریخ۔عبدالقادر بدایونی
6. اکبرنامہ۔ابوالفضل
7. تاریخ فرشتہ۔محمد قاسم فرشتہ

اکائی 15 : مغلیہ حکومت کا نظم ونسق

اکائی کے اجزاء

15.1 مقصد

اس اکائی میں یہ بتایا جائے گا کہ مغلیہ دور حکومت کا نظم ونسق کیسا تھا؟ اس میں بادشاہ کی کیا حیثیت تھی، اور روزمرہ کے کام کا کیا معمول

تھا؟ حکومت چلانے میں مدد کرنے والے کون کون سے محکمے تھے اور وہ محکمے اپنے امور کو کیسے انجام دیتے تھے اور ان کی ذمہ داریاں کیا تھیں؟ اسی طرح اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ مغلیہ عہد کا فوجی نظام کیسا تھا اور یہ نظام کتنا موثر تھا۔

15.2 تمہید

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ایک طویل عرصہ تک قائم رہی۔ اس وسیع حکومت کا نظم ونسق مضبوط بنیادوں پر قائم تھا۔ اس کا معمار بادشاہ اکبر تھا۔ ملکی امور کو انجام دینے کے لئے کئی اہم شعبے تھے۔ شعبوں کے عہدہ داران قابل، فرض شناس اور بادشاہ کے وفادار ہوتے تھے۔ تمام اعلیٰ عہدیداران بادشاہ کی نگرانی میں اپنے امور انجام دیتے تھے اور بادشاہ کے سامنے جوابدہ تھے۔

15.3 بادشاہ

مغلیہ دور تقریباً 331 سالوں پر محیط ہے۔ اس وسیع حکومت کی عظمت واستحکام کا انحصار اس کے بہترین نظم ونسق پر تھا۔ اس نظم ونسق کا معمار بادشاہ اکبر تھا۔ یہی نظم حکومت معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں قائم رہا۔ مرکزی حکومت کے انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے بادشاہ اکبر نے کئی اہم شعبے قائم کئے۔ ہر شعبہ کی نگرانی ایک بڑے عہدیدار یا وزیر کے سپرد کی گئی۔ حکومت کا سب سے اعلیٰ اور بڑا عہدیدار خود بادشاہ ہوتا تھا۔ وہ مطلق العنان ہوتا تھا، اسے غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔ وہ صدر مملکت، افواج حکومت کا سپہ سالار، عدل وانصاف کا سرچشمہ، سب سے بڑا قانون ساز اور حکومت میں قطعی اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ امور حکومت کی انجام دہی اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے بادشاہ مرکزی حکومت میں کئی عہدیداروں سے مدد لیتا تھا۔ ان میں ایک اہم عہدیدار وکیل یا وزیر اعظم ہوتا تھا۔ وکیل کے عہدہ کی مستقل حیثیت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وکیل کا عہدہ ہمیشہ پُر نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ عام طور سے بادشاہ کی کم سنی یا کمزوری یا خرابی صحت کے دور میں مقرر کیا جاتا تھا۔ اس عہدے پر خاندانی امیروں کی اجارہ داری نہ تھی بلکہ موزوں اشخاص کا انتخاب چھوٹے درجہ کے لوگوں میں سے بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس طرح سے وکیل کے تقرر کا انحصار کلی طور پر بادشاہ کی مرضی پر تھا۔ لیکن جب بھی کسی کو سلطنت کے وکیل کے عہدہ پر مقرر کیا جاتا تھا تو وہ بادشاہ کے بعد حکومت کے سربراہ کے طور پر اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔

نظام حکومت کو چلانے کے لئے حکومت کے فرائض واختیارات چار وزیروں میں تقسیم تھے۔

(1) دیوان۔ وزیر مال وفینانس

(2) میر بخشی۔ وزیر فوج

(3) میر سامان۔ وزیر کارخانہ جات اور اسٹور

(4) صدر۔ وزیر عدالت اور امور مذہبی

اس طرح سرکاری محکمہ جات کا انتظام تو ان چار وزیروں کے ذمہ رہا، لیکن مجالس مشاورت میں وزیروں کے علاوہ دوسرے لوگ بھی

شریک کئے جاتے تھے۔دربار میں، دوروں اور مہمات میں بادشاہ کی موجودگی اور نظم ونسق کی سرگرمیوں پر اس کی گہری نظر سے یہ مرکزی نظام موثر اور کارکردہ بن گیا تھا۔

15.3.1 بادشاہ اور کارِ مملکت

بادشاہ کا تصور یہ تھا کہ بادشاہ خدا کا خلیفہ ہوتا ہے اور اسے بادشاہت کرنے کا حق خدا کی جانب سے ملتا ہے۔وہ اپنے دائرہ کار میں اعلیٰ ترین فرد ہوتا ہے۔خدا کے اس عظیم عطیہ کو حاصل کرنے کی صورت میں بادشاہ پر اس کی عبادت اور شکریہ ادا کرنا فرض ہے اور اس کے لئے عبادت کا سب سے بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ اپنے رعایا کے تمام متعلقہ فرائض بہ حسن وخوبی انجام دیتا رہے۔

بادشاہ اکبر نے جو مغلیہ سلطنت کے نظم ونسق کا معمار تھا، شہنشاہیت کے تصور کو اپنے عمل کے ذریعہ حمایت بھی کی، اکبر نے اپنے عہد حکومت میں جھروکہ درشن کی رسم کو رائج کیا۔اس دور کے مورخ ابوالفضل کا کہنا ہے کہ ''اس رسم کا مقصد یہ تھا کہ خاص وعام بلا روک ٹوک بادشاہ کے حضور میں باریاب ہونے کا شرف حاصل کرسکیں''، یہ رسم بادشاہ اکبر کے بعد اس کے بعض جانشینوں کے دور میں بھی رائج رہی۔عقیدت مند صبح کے وقت جھروکے کے نیچے اکٹھا ہوتے تھے جن میں خواص وعوام، سپاہی، تاجر، سوداگر، اہل حرفہ اور دیہاتی ہر طرح کے لوگ درشن کے لئے جمع ہوتے تھے۔بادشاہ اکبر جھروکے میں نمودار ہوتا اور درشن دینے کے بعد دربار عام منعقد کرتا تھا۔

اکبر روزانہ امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے خلوت گاہ سے تین دفعہ باہر نکلتا تھا۔پہلی دفعہ طلوع آفتاب کے بعد درشن کیلئے جھروکہ درشن کے بعد ہی دربار عام منعقد کرتا تھا۔جس میں ہندو، مسلم خاص وعام اور مرد وعورت ہر ایک کو اپنی معروضات اور درخواست پیش کرنے اور اپنے مقدمات کو براہ راست بیان کرنے کی اجازت تھی۔دوسری مرتبہ دوپہر کے بعد جب وہ ان جانوروں کا معائنہ کرتا تھا جن کی نگرانی کا کام مرکزی حکومت کے سپرد تھا۔اس کے بعد وہ کارخانوں اور دیگر امور کا جائزہ لیتا۔اگر کام زیادہ ہوتا تو غروب آفتاب کے بعد تک اجلاس جاری رہتا تھا۔اس طرح سے دن میں تین مرتبہ شاہی دربار منعقد کرنے سے انتظام سلطنت پر گہرا اثر پڑتا تھا۔دن کا درمیانی وقت شاہی حرم کے معاملات کے لئے وقف ہوتا تھا۔یہ وقت اندرون خانہ صرف ہوتا تھا۔یہاں بیگمات اور دیگر عرضی گزار خواتین کے معاملات پر توجہ دی جاتی تھی۔ رات کا وقت صرف نجی مجالس کے لئے تھا۔اس مجلس میں علماء، دانشوران، حکماء شریک ہوتے۔اور مختلف موضوعات پر بحث ومباحثہ ہوتا۔کبھی کبھی اس وقت بھی امور سلطنت انجام دیئے جاتے تھے۔ایسی صورت میں صرف متعلقہ امور کے عہدیداران اور چند خدمت گار ہی کو اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوتی تھی۔

15.3.2 دیوان خاص وعام کا طریقہ کار

صبح میں امور سلطنت انجام دینے کے بعد دوبارہ دوپہر کے وقت بادشاہ پورا دربار منعقد کرتا تھا۔یہ مجلس دیوان خاص وعام میں منعقد ہوتی تھی۔اور وہاں روزمرہ کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔اور جانوروں کا معائنہ ہوتا تھا۔اسی دربار میں نئے خریدے ہوئے جانوروں کی قیمت طئے کی جاتی تھی۔اور پرانے جانوروں کی حالت کا معائنہ کرکے ان کے نگرانوں پر جرمانہ عائد کیا جاتا تھا۔یا انہیں انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

مرکزی حکومت کے کارخانوں اور مال گوداموں میں جو کام ہتھیاروں، جواہرات، کپڑوں، زر دوزی، نقاشی، خطاطی، مصوری وغیرہ سے متعلق ہوتا تھا اسے بھی بادشاہ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ نیز تراجم اور ادبی تصانیف سے متعلق جو کام تھا وہ بھی پیش کیا جاتا تھا۔ عہدوں پر نئے تقررات کئے جاتے تھے۔ اسی دربار میں عہدیداروں کو ترقیاں دی جاتی تھیں اور مستحق افراد کو جاگیریں بخشی جاتی تھیں۔ ممتاز اشخاص، سفرا اور غیر ملکی حکمراں پہلے عام دربار میں حاضر ہوتے تھے اگر ضرورت محسوس ہوتی تو بعد میں انہیں مخصوص کمرے میں حاضر ہونے اور گفتگو کرنے کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات جنگی قیدی، شکست یافتہ دشمن اور گرفتار باغی بھی اس دربار میں پیش کئے جاتے تھے۔

غسل خانہ (خلوت خانہ یا پرائیویٹ چیمبر)

دیوان خانہ اور حرم سرا کے درمیان ایک کمرہ تھا۔ اس کمرہ میں گنے چنے قابل اعتماد اشخاص کو ملاقات کا موقعہ دیا جاتا تھا۔ بعد میں دیوان اور بخشی بھی امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے وہیں طلب کئے جانے لگے۔ بعض امرائے دربار کو بھی حاضری اور رکنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح امور مملکت وہیں انجام دیئے جانے لگے۔ اور غسل خانہ سے یہ کمرہ متصل تھا اس وجہ سے اس کمرے کو "غسل خانہ" کہا جانے لگا۔ شاہجہاں نے اپنے عہد میں اس کمرے کا نام "دولت خانہ خاص" رکھا۔ اس کے زمانے میں یہ کمرہ اسی نام سے مشہور تھا۔

سہ پہر اور شام کا دربار

اس اجلاس میں بھی صبح کی طرح سلطنت کے کام انجام دیئے جاتے تھے۔ یہ اجلاس صبح کے اجلاس کے مقابلے میں زیادہ محدود نوعیت کا تھا۔ اس میں زیادہ تر وزراء اور اعلیٰ عہدیداران سلطنت ہی شریک ہوتے تھے۔ یہ اجلاس صرف ضابطے کے معمولی کاموں کے لئے ہوتا تھا۔

اسی طرح شاہی دربار منعقد کرنے سے انتظام سلطنت پر گہرا اور اچھا اثر پڑتا تھا۔ اور امور سلطنت کی انجام دہی میں کافی آسانیاں ہوتی تھیں اور کھلے دربار منعقد کرنے کے رواج نے بادشاہ اور رعایا کے درمیان مضبوط روابط اور رشتے قائم کردیئے تھے۔

15.4 دیوان (وزیر مال وفینانس)

دیوان ۔ وکیل کے بعد دوسرا بڑا عہدیدار دیوان یا وزیر ہوتا تھا جو محکمہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ جس کی ذمہ داری مالی معاملوں کی نگہداشت اور خصوصاً محصولات کی وصولی ہوتی تھی۔ اس کا انتخاب حیثیت یا درجہ کا لحاظ کئے بغیر ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں اور بادشاہ سے وفاداری کی بناء پر عمل میں آتا تھا۔

15.4.1 دیوان کا محکمہ اور اس کے دفتر کا کام

محکمہ دیوان، دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا۔

1- دیوان خالصہ۔ (خالصہ اراضی کے لئے)

2- دیوان تان (تنخواہوں کے لئے)

3- مشرف ۔(محاسب خاص)

4- مستوفی (حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا)

ان میں سے ہر عہدیدار کے ماتحت ایک ذاتی مددگار یا سیکریٹری ہوتا تھا۔اس کے علاوہ دفتر کے متعدد محافظ اور اہل کاروں پر مشتمل ایک بڑا عملہ ہوتا تھا۔یہ تمام محکمے کے طریقہ کار سے واقف اور اس کے متعلق خاص طور سے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔

دیوان محکمہ مالیات کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے وہ ہر اس عہدیدار پر نظر رکھتا تھا جو جاگیر سے اپنی تنخواہ وصول کرتا تھا۔محکمہ مال کے اختیارات کے علاوہ صوبوں اور عہدیداران صوبہ پر بھی اختیارات حاصل تھے۔ان عہدیداروں میں حاکم صوبہ سے لے کر عامل اور پٹواری تک سبھی شامل تھے۔محکمہ مالیات کا وزیر ہونے کی حیثیت سے شاہی خزانہ میں پہنچنے والی یا اسے باہر جانے والی رقم پر اس کی نظر رہتی تھی۔اسی طرح صوبہ کے نظم و نسق کے سبھی شعبوں تک اس کی رسائی تھی۔اس عام نگرانی کی وجہ سے حکومت کے تمام وزراء میں اسے ممتاز ترین حیثیت حاصل تھی۔

15.5 میر بخشی (وزیر فوج)

سلطنت مغلیہ کے میر بخشی کو محکمے کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے کئی اہم اختیارات حاصل تھے۔اور دربار میں اسے بادشاہ کی قربت حاصل ہونے کے بناء پر اس کا وقار بڑا تھا۔اپنے محکمہ کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے اس کا ہر منصبدار سے تعلق تھا۔اور اسی وجہ سے دربار میں اس کی حاضری اس کے فرائض کا ایک اہم جز و تھی۔وہ دربار میں تخت شاہی کے داہنے جانب کھڑا ہوتا اور اپنے محکمے سے متعلق تمام معاملات بادشاہ کے حضور پیش کرتا تھا۔وہ ملازمت کے امیدواروں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔نئے سپاہیوں اور منصبداروں کے گھوڑوں کو داغ ونشانی کے بعد بادشاہ کے سامنے بخشی پیش کیا کرتا تھا۔ ایسے ہی مستقل عہدہ داروں کے سپاہیوں اور گھوڑوں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔نیز وہ صوبوں سے آنے والے تمام عہدیداراں دارالحکومت سے اپنے صدر مقامات کو جانے والے عہدیداران اور دوسرے ملک سے آئے ہوئے سفرا اور معزز مہمانوں کو بھی بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کا کام انجام دیتا تھا۔میر بخشی محل کے محافظوں کا اعلیٰ عہدیدار ہونے کی حیثیت سے محافظین کے نام بادشاہ کے سامنے انعامات کے لئے پیش کیا کرتا تھا۔

میر بخشی غسل خانے (خلوت گاہ) میں بھی بادشاہ کے ساتھ رہتا۔یہاں بھی وہ بادشاہ کے دائیں جانب کھڑا ہوتا۔اور معمول کے مطابق عہدیداروں کو بادشاہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔حکومت کے اعلیٰ عہدیدار اور محکمہ فوج کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے محافظین کی فہرست میر بخشی کے پاس رہتی تھی۔مختلف صوبہ جات سے وقائع نویسوں کے ارسال کردہ خبرناموں کو وصول کرنے اور بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کی ذمہ داری بھی ہوتی تھی۔اپنے محکمہ کا سربراہ اور بادشاہ و منصبداروں کے درمیان واسطے کا خاص ذریعہ ہونے کی وجہ سے میر بخشی دوروں اور سیر وشکار میں ہمیشہ بادشاہ کے ساتھ ہوتا تھا۔اور شاہی خیموں کی نگہداشت اور تمام منصبداروں کا ان کے مرتبے کے لحاظ سے جگہ متعین کرنا بھی اس کے فرائض میں داخل تھا۔اسی کے ذریعہ دورے پر جانے والے عہدیدار اور منصبدار بادشاہ کی خدمت میں شرف حاضری کی اجازت حاصل کرتے تھے۔نیز فوجوں کے آرام اور آمد و رفت وغیرہ کا انتظام اسی کے سپرد تھا۔میر بخشی یا اس کے رفقائے کار میدان جنگ میں بھی مختلف حیثیتوں سے حاضر رہتے تھے۔

فوج کے ہر شعبے کا ایک علاحدہ بخشی ہوا کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر وقائع نویسی کے فرائض وہی انجام دیتا تھا۔ بادشاہ کے یہاں پوری پابندی سے اطلاعات بھیجی جاتی تھی۔ قرضے کی تقسیم، پیشگی رقم دینا اور میدان جنگ میں تنخواہیں تقسیم کرنا، میدان جنگ میں سرگرم فوجوں کے بخشی کا کام تھا۔ میر بخشی اور اس کے شریک کار خود میدان جنگ میں جاتے اور دوسرے عہدیداروں کی طرح جنگ بھی کرتے تھے۔

میر بخشی کے محکمہ میں درج ذیل کاغذات محفوظ رکھا جاتے تھے۔

1- مرکز اور صوبوں میں متعین منصبداروں کی فہرست

2- منصبداروں کے ذمہ واجب الادار قوم کا حساب و کتاب

3- تنخواہوں کی ادائیگی کے گوشوارے

4- ایسے ضوابط جن کا تعلق تنخواہوں، جاگیروں اور جاگیروں کے بعد نقد تنخواہوں میں تبدیل کئے جانے سے ہوتا تھا۔

5- وہ فہرستیں جن میں منصبداروں کے درجے ان کی تنخواہیں اور تنخواہ وصول کرنے کے طریقے درج ہوتے تھے۔

6- ایسے کاغذات جن میں منصبداروں اور سواروں کا حلیہ درج ہوتا تھا۔

7- وہ کاغذات جو گھوڑوں کو داغنے اور ان کے معائنے سے متعلق تھے۔

8- صوبوں اور مختلف فوجوں میں منصبداروں کی حاضری کے کاغذات

9- محافظین محل کی حاضری کے کاغذات

10- فوجوں کی فہرستیں اور دشمنوں سے مقابلے میں ان کی ترتیب

اس طرح سے اختیارات، حیثیت اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے میر بخشی کا دائرہ کار وسیع تھا۔ میر بخشی محکمہ فوج کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے منصبداروں کا خاص نمائندہ ہوتا تھا لیکن اس کی وجہ سے فوج پر اسے کوئی خاص اثر و رسوخ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہ تو سلطنت کے فوجوں کا سپہ سالار ہوتا تھا اور نہ ہی اپنے عہدے کی وجہ سے اسے کسی مہم کی قیادت کرنے کا حق حاصل تھا۔ یہ کلی طور پر بادشاہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ جس طرح چاہے مہم کی نوعیت، فوج کی ترتیب اور منتخب کردہ سپہ سالاروں کو دیکھتے ہوئے مناسب انتظامات کرے۔ اکثر مہم پر جانے کے لئے علاحدہ بخشی کا تقرر ہوتا تھا جنہیں عسکر یا بخشی لشکر کہا جاتا تھا۔ اور ان کا انتخاب نہ تو میر بخشی کرتا تھا اور نہ ہی اس کا محکمہ بخشی سے ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ وہ صرف بخشی کی نگرانی میں کام کرتا تھا۔

15.6 میر ساماں

کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم تھا جس کا سربراہ میر سامان کہلاتا تھا۔ دوسرے عہدیدار حسب ذیل تھے۔

دیوان بیوتات: یہ دوسرا اعلیٰ عہدیدار ہوتا تھا جو خاص طور سے محکمے کے مالی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

مشرف کل وجز: (چھوٹی بڑی تمام چیزوں کا محاسب) یہ محکمے کا محاسب ہوتا تھا۔ محکمے کے ہر شعبے میں اس کا ایک مشرف ہوتا تھا۔

داروغہ: ہر شعبے یا کارخانے میں ایک داروغہ مقرر ہوتا تھا۔ جو براہ راست اپنے شعبے کے کاریگروں سے کام لیتا' کاریگروں کے روزمرہ کے کام ان کے درمیان تقسیم کرتا اور ان کے پاس روزانہ جو سامان باقی بچ جاتا اسے اپنی تحویل میں لے لیتا تھا۔

تحویلدار: ہر کارخانے میں ایک تحویلدار ہوتا تھا جس کی تحویل میں وہ نقد رقم اور سامان رہتا تھا جس کی اس شعبہ میں ضرورت پڑتی تھی۔

مستوفی: کارخانوں کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا مستوفی کے حوالے تھا۔

داروغہ کچہری: دفتری عملے کی نگرانی اس عہدیدار کے سپرد تھی۔

ناظر: محکمے کے دیوان کے بعد دوسرا سب سے بڑا عہدیدار یہی ہوتا تھا۔ ناظر کا کام محکمہ دیوان کے کاموں پر نظر ثانی کر کے اس پر مہر لگانا تھا۔

میر سامان کی ذمہ داریاں:

میر سامان محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے انتظامی امور انجام دیا کرتا تھا۔ نیز ہر شعبے کے اندرونی طریقہ کار کا نگران بھی تھا۔ میر سامان داروغہ' مشرف اور تحویلدار کی تقرری و برخواستگی کے تعلق سے ابتدائی کاروائی کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اور ان کے خلاف تادیبی کاروائی کرنے کا بھی حق حاصل تھا۔ وہ محکمے کے تمام کام انجام دیتا تھا۔ اور صوبوں سے کارخانے کے نام آنے والی تمام فرمائشوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ تمام اہم امور اور تجارتی معاملات کی جانب بادشاہ کی توجہ دلاتا تھا۔

15.7 صدر : (محکمہ عطیات اور امور مذہبی کا سربراہ)

مرکزی حکومت کے دوسرے محکموں کی طرح صدر کے ماتحت بھی ایک مستقل عملہ ہوتا تھا۔ جو تمام امور صدر کے احکام کے مطابق انجام دیتا تھا۔ محکمے سے مدد معاش سے متعلق جو حکم یا صداقت نامہ جاری ہوتا تھا اس پر صدر کی مہر ضروری ہوتی تھی۔ اراضی عطا کرنے اور نقد بھتے اور وظیفے دینے میں بھی صدر کا اہم رول تھا۔ وہ تخت کے دائیں جانب کھڑا ہوتا تھا۔ شاہجہاں کے دور میں اسے اس بات کا بھی موقع فراہم کیا گیا تھا کہ وہ ''غسل خانے'' میں ایسے درخواست گذاروں کو پیش کرے جنہیں وقت کی قلت کی وجہ سے دربار میں نہیں پیش کیا جاسکتا تھا۔ یا جن کی طرف وہ بادشاہ کو خاص طور سے متوجہ کرنا چاہتا تھا۔

صدر کی ایک دوسری ذمہ داری یہ بھی ہوتی تھی کہ وہ غریبوں اور مفلسوں کی خبر گیری کرے اور اپنی تحویل میں رکھی ہوئی اس مد کی رقم سے ان کی ضروریات پوری کرے۔ اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ خاص خاص مواقع یا قحط کے زمانہ میں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اور ٹھنڈی کے موسم میں پہننے کے لئے گرم کپڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ صوبہ جات میں بھی صدروں کا تقرر ہوتا تھا۔ صوبائی صدر کا تقرر محکمے کی تنظیم کے لئے کیا جاتا تھا۔

15.8 نظام عدلیہ

بادشاہ ایک قاضی القضاۃ یعنی صدر کا تقرر کرتا جسے ایک جج کے اختیارات حاصل ہوتے تھے۔صدر کو ماتحت قاضیوں کی تقرری کا اختیار حاصل تھا۔لیکن ایسے تمام تقررات میں بادشاہ کی منظوری اور مرضی کا شامل ہونا ضروری تھا۔ایک شہر میں ایک سے زائد قاضی اپنے اپنے فرائض کی تصریح کے ساتھ مقرر ہوسکتے تھے۔قاضی کے ساتھ میر عدل کا تقرر بھی عمل میں آتا تھا۔اور اس کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔بادشاہ فوج کے لئے قاضی عسکر بھی مقرر کرتا تھا۔اور اس کے ساتھ بھی میر عدل ہوتا تھا۔صرف مرکز‘صوبائی صدر مقامات اور دوسرے بڑے شہروں ہی میں قاضی نہیں ہوتے تھے۔بلکہ چھوٹے چھوٹے علاقوں‘قصبوں اور پرگنوں میں بھی قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔اوزان‘پیمائشوں اور اشیائے خوردنی کی جانچ پڑتال‘انسداد گداگری‘معالجوں کی اسناد کی چھان بین‘غلاموں کی حالت کی نگرانی‘لوگوں کو جوے بازی اور شراب نوشی سے روکنے اور صوم وصلوٰۃ کا پابند بنانے کے لئے مرکز اور صوبوں میں محتسب کا تقرر عمل میں آتا تھا۔غیر مسلم فریقین کے جو مقدمات وراثت اور شادی بیاہ وغیرہ سے متعلق ہوتے تھے وہ ان کے مذہبی رہنماؤں کے سامنے پیش ہوتے اور ان کے قانون کے مطابق طئے پاتے۔سرکاری عدالتوں کے علاوہ قدیم دیہی نظام اور ادارے یعنی پنچایت وغیرہ حسب دستور قائم رہے۔

حصول انصاف کا دوسرا ادارہ بادشاہ کا دربار ہوتا تھا۔بادشاہ روزانہ کھلے دربار میں معمولی مقدمات کی شنوائی کرتا تھا اور اہم معاملات کی سماعت جن میں شہادات اور جرح کرنے کی ضرورت ہوتی تھی‘ہفتہ میں ایک متعینہ دن کو کیا کرتا تھا۔بادشاہ اکبر نے جمعرات‘جہانگیر نے منگل اور شاہجہاں نے بدھ کا دن اس کام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔خاص طور سے ان دنوں میں بادشاہ مظلوموں کی دادرسی کرتا تھا۔ان بادشاہوں کی عدالتوں میں صداقت وانصاف کا بول بالا تھا۔بادشاہ اپنی فوجی مہموں‘تفریحی سفروں اور مختلف صوبوں کے سفر کے دوران بھی مقدمات کی شنوائی کا معمول جاری رکھتا تھا۔وہ دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات کی سماعت کرتا تھا۔اس کی عدالت ابتدائی عدالت کے ساتھ ساتھ عدالت عظمیٰ بھی تھی‘جسے اپیل سننے کے اختیارات بھی حاصل تھے۔بادشاہ کے سامنے دیوانی مقدمات کے بہ نسبت فوجداری مقدمات زیادہ پیش ہوتے تھے۔دیوانی مقدمات کے دونوں فریقوں کو براہ راست بادشاہ کے پاس مقدمات پیش کرنے کا حق حاصل تھا۔یا قاضیوں کے فیصلوں کے خلاف بادشاہ سے اپیل کرنے کا حق حاصل تھا۔ ایسے ہی فوجداری مقدمات میں بھی ملزم کو اپیل کرنے کا حق تھا۔فوجداری مقدمات کی شنوائی کرنے والے مجسٹریٹوں کو بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ مقدمات کی شنوائی خود کریں یا بادشاہ کے پاس بھیج دیں۔مغلوں کے نظام عدل کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ سختی کے ساتھ انصاف کے اصولوں کی پابندی کرتے تھے اور حق وانصاف کا بے انتہا لحاظ رکھتے تھے۔کسی کے ساتھ کسی طرح کی رعایت نہیں کرتے اور قانون کی نگاہ میں سب کو برابر سمجھتے تھے۔

15.9 نظام فوج

بادشاہ اکبر نے سلطنت کی منظم فوج تیار کی۔اس کا بانی درحقیقت وہی سمجھا جاتا ہے۔مغلیہ سلطنت ایک طرح کی فوجی مطلق العنان حکومت تھی۔چنانچہ ہر صوبے کا حاکم سپہ سالار کہلاتا تھا۔ہر پرگنے یا ضلع کے ایک حصے کے حاکم کو فوجدار کہتے تھے۔اور عام طور پر تمام عہدیدار اور

درباری حتیٰ کہ ان لوگوں کے مراتب جو شہری یا عدالتی عہدوں پر فائز تھے سواروں کے سرداروں کی حیثیت سے متعین ہوتے تھے۔ سواروں کی قیادت کو منصب کہتے تھے۔ اور ایسے عہدیدار کو منصب دار کہتے تھے۔ جن عہدیداروں کو برائے نام پانچ سو سے دو ہزار پانچ سواروں کا قائد سمجھا جاتا تھا' اِسے ''امیر'' کہتے تھے۔ وہ لوگ جو اس سے زیادہ تعداد کے قائد نامزد کئے جاتے تھے انہیں امیر کبیر کا خطاب حاصل ہوتا تھا۔ یہ سپہ سالاریاں اعزازی ہی ہوتی تھیں۔ جن کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ منصب دار کی حیثیت اور مرتبہ معلوم ہو سکے۔ اور ان کے منصب کو ''منصب ذاتی'' شمار کیا جاتا تھا۔ ان لوگوں میں سے جنہیں واقعی فوجی اختیارات حاصل ہوتے تھے ہر ایک کو اس کے منصب ذاتی کے علاوہ منصب سواری بھی حاصل ہوتا تھا۔ جن منصب داروں کا منصب سواری ان کے منصب ذاتی کے برابر تھا۔ ان کو اول درجہ کا منصب دار مانا جاتا تھا۔ جن منصبداروں کا سوار منصب ان کے منصب ذاتی کے نصف یا اس سے زیادہ ہوتا تھا ان کو دوئم درجہ کا منصب دار مانا جاتا تھا۔ جن کا سوار منصب ان کے منصب ذاتی کے نصف سے کم ہوتا تھا وہ تیسرے درجے کے منصبدار کی فہرست میں آتے تھے۔ ہر منصب دار کو اپنے منصب کے مطابق گھوڑے' ہاتھی' اونٹ وغیرہ رکھنے ہوتے تھے۔ جنگ کے وقت میدان جنگ میں منصب دار اپنے سواروں اور جانوروں کے ساتھ جاتے تھے بہت کم منصب داروں کو نقد تنخواہ دی جاتی تھی جن کی نقدی منصب دار کہا جاتا تھا۔ لیکن عموماً منصب داروں کو ان کی تنخواہ کے برابر آمدنی والی جاگیر عطا کی جاتی تھیں۔

مغلیہ دور میں ''داغ ومحلی'' یعنی جانوروں کو داغنے لگانے کا قاعدہ بھی جاری تھا۔ جانوروں کے معائنے اور حاضری کے وقت جاگیردار اِدھر اُدھر سے بیگاری اور مانگے ہوئے گھوڑے اور ہتھیار لے کر حاضر ہو جاتے۔ ظاہر ہے ایسی فوج میدان جنگ میں دشمن کے سامنے کہاں تک ٹھہر سکتی تھی۔ اس کی اصلاح کے لئے بادشاہ اکبر نے فوجیوں کو حتی الامکان خزانے سے نقد تنخواہ دینا شروع کی۔ ہر سپاہی کا حلیہ فوج کے کاغذات میں درج کرایا اور داغ ومحلی کے قواعد جاری کئے جن کے ماتحت آدمیوں اور گھوڑوں کے صحیح اعداد و شمار محفوظ رکھے جانے لگے۔ اور گھوڑوں کو یہ جانچنے کے بعد کہ وہ جنگی استعمال کے لائق ہیں داغ دیا جاتا۔ اور اجتماعی پریڈوں کے مواقع پر صرف انہیں لوگوں کو تنخواہ دی جاتی تھی جو داغ شدہ گھوڑے لاتے تھے۔

شہزادوں اور منصب داروں کے فوجی دستوں کے علاوہ بادشاہ کی ذاتی فوجیں بھی ہوتی تھیں۔ اس کا ذاتی حفاظتی عملہ ایک فوج پر مشتمل ہوتا تھا جسے ''والاشاہی'' کہتے تھے۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جو اس کی شہزادگی کے زمانے میں اس کی ملازمت میں تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور بڑا گروہ ایسے سواروں کا تھا جو تنہا کام کرتے تھے یہ ''احدی'' کہلاتے تھے۔ اور کسی فوج میں داخل نہ ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہ اہلیت پر منحصر تھی جو عام سواروں سے زیادہ ہوتی تھی۔

پیادہ فوج ہر لحاظ سے فوج کا ایک ادنیٰ بازو خیال کی جاتی تھی۔ اور اس کے سپاہیوں کا شمار دربانوں' پہرا داروں' ہر کاروں' مخبروں' تیغ زنوں' پہلوانوں اور پالکی برداروں کے ضمن میں ہوتا تھا۔ لیکن ان میں سے جنگ میں حصہ لینے والے سپاہیوں میں بندوقچی' تیر انداز اور نیزہ باز ہوا کرتے تھے۔ ان سپاہیوں کے علاوہ بعض اور سپاہی ہوتے تھے۔ جنہیں ''داخلی'' کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک چوتھائی حصہ بندوقچیوں اور تین چوتھائی حصہ تیر اندازوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ وہ سپاہی تھے جنہیں پرگنوں یا تحصیلوں میں فوجداروں کو رکھنے کی اجازت تھی تا کہ وہ انہیں امن وامان قائم کرنے اور مالگذاری وصول کرنے میں مدد کر سکیں۔

توپ خانہ دوطرح کا تھا۔ایک تو بھاری اور دوسرا ہلکا۔ بھاری توپ خانے کا انتظام عموماً عثمانی ترکوں یا پرتگیزی تومسلموں اور بعض اوقات دیگر ملکوں کے افسروں اور کسی حد تک توپچیوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ہلکا توپ خانہ میدانی توپوں' دیواروں پر رکھنے والی توپوں وغیرہ ہلکی قسم کی توپوں پر مشتمل تھا۔جنہیں چھکڑوں پر لاد کر لے جاتے تھے۔سارے توپ خانے کا ایک افسر اعلیٰ ہوتا تھا جسے "میر آتش" کہتے تھے۔ایک سو توپچیوں کے افسر کو "صدی وال" کہتے تھے اور "میر دھہ" یعنی دس کا افسر ہوتا تھا جس کے ماتحت صرف چند یا ایک توپ ہی ہوتی تھی۔تمام فوجوں کا سپہ سالار اعلیٰ بذات خود بادشاہ ہوا کرتا تھا۔لیکن فوجی نظام کا مہتمم اعلیٰ ایک افسر بخشی الممالک ہوتا تھا اس کے ماتحت تین بخشی اور کئی محرر ہوتے تھے۔اس شعبے کی ذمہ داریوں میں بھرتی کرنا' حاضری لینا' منصب داروں اور سواروں کی تنخواہوں کی ادائیگی کا حکم جاری کرنا شامل تھا۔اور وہ دیکھتے تھے کہ لوگ جانوروں کو داغ دینے کے ضوابط پر عمل کرتے ہیں یا نہیں۔بخشی سال میں دو مرتبہ اس پوری سوار فوج کا جو دربار میں حاضر ہوتی تھی جائزہ لیتا تھا۔سب گھوڑوں کا معائنہ کرتا اور یہ دیکھتا کہ ان میں سے کوئی زیادہ عمر کے اور کام کے نا قابل تو نہیں ہو گئے۔اگر وہ ایسا پاتا تو ان کے مالکوں کو ان گھوڑوں کو علاحدہ کر کے نئے گھوڑے خریدنے کا حکم دیتا تھا۔

15.10 صوبائی نظام

بادشاہ اکبر نے اپنے عہد حکومت میں صوبوں کا ایک موثر نظام قائم کیا۔ 1580ء میں اس نے سلطنت کو 12 صوبوں میں تقسیم کیا تھا۔ 1605ء میں صوبوں کی یہ تعداد بڑھ کر 15 ہو گئی تھی۔ (1) کابل مع کشمیر (2) لاہور (3) ملتان مع سندھ (4) دہلی (5) اودھ (6) آگرہ (7) اجمیر (8) احمد آباد (9) مالوہ (10) الہ آباد (11) بہار (12) بنگال (13) خاندیش (14) برار (15) احمد نگر۔شاہجہاں کے عہد حکومت میں صوبوں کی تعداد بڑھ کر 19 ہو گئی تھی اور اورنگ زیب کی وفات تک سلطنت میں کل 21 صوبے تھے۔ہر صوبے کا سب سے اعلیٰ عہدیدار صوبہ دار ہوتا تھا۔اسے سپہ سالار اور ناظم بھی کہا جاتا تھا۔اس کے فرائض میں صوبے میں امن و امان قائم رکھنا' بغاوت ختم کرنا اور بیرونی دشمنوں سے صوبے کی حفاظت کرنا تھا۔صوبے کے مالی نظام کے محکمہ کا سربراہ دیوان ہوتا تھا جو مرکزی دیوان کے ماتحت اپنا کام انجام دیتا تھا۔اور عام طور سے اس کا عہدہ صوبہ دار کے عہدے کے برابر ہوتا تھا۔ ہر صوبہ میں صوبائی بخشی اور صوبائی صدر بھی مقرر ہوتے تھے جو مرکزی میر بخشی اور صدر الصدور کی ماتحتی میں اپنے امور انجام دیتے تھے۔اور صوبہ کے فوجی اور مذہبی امور کے اعلیٰ عہدیدار ہوتے تھے۔صوبائی بخشی عموماً صوبہ کی واقعہ نویسی کا کام بھی انجام دیتا تھا۔ان عہدہ داروں کا تقرر خود بادشاہ کرتا تھا۔صوبوں کو سرکاروں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔سرکار کا اہم ترین عہدیدار فوجدار ہوتا تھا۔سرکار میں امن و امان بحال کرنے کا کام اس کے سپرد تھا۔اس کی مدد کے لئے سرکار کے اہم علاقوں میں کوتوال تعینات کئے جاتے تھے جو محکمہ پولیس کا اعلیٰ عہدیدار ہوتا تھا وہ ایک منصف' پولیس افسر' حاکم اور محتسب کے فرائض انجام دیتا تھا۔سرکار کے شعبہ مالیات کی ذمہ داری کروڑی اور عامل کے سپرد تھی۔ ہر سرکار کے تحت کئی پرگنے تھے۔ پرگنے یا محال کا اعلیٰ عہدیدار شق دار تھا۔امین پرگنہ شعبہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔ہر پرگنہ میں فوتہ دار یا خزانچی مقرر ہوتا تھا جو پرگنہ کے خزانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔پرگنوں میں قانون گو بھی مقرر تھے جو پرگنے کے کسانوں کی زمینوں اور پیدا ہونے والی فصلوں کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ ہر پرگنہ کے ماتحت کئی گاؤں تھے۔گاؤں کے اہم اہل کاروں میں پٹواری اور چوکیدار ہوتے تھے۔

15.11 خلاصہ

مغلیہ حکومت کی عظمت واستحکام کا انحصار اس کے بہترین نظام حکومت پر تھا جس کا معمار بادشاہ اکبر تھا یہی نظام معمولی تبدیلیوں کے ساتھ تمام مغلیہ دور میں قائم رہا۔مرکزی حکومت کے انتظامی امور کو انجام دینے کے لئے کئی اہم شعبے قائم تھے ہر شعبہ کا سربراہ ایک اعلیٰ عہدیدار یا وزیر ہوتا تھا۔حکومت کا سب سے بڑا اور اعلیٰ عہدیدار بادشاہ ہوتا تھا۔وہ مطلق العنان تھا۔بادشاہ امور حکومت کو انجام دینے اور نظم ونسق قائم رکھنے کے لئے کئی عہدیداروں سے مدد لیتا تھا۔ان میں ایک اہم وکیل یا وزیر اعظم ہوتا تھا۔لیکن یہ غیر مستقل عہدہ تھا۔حکومت کے فرائض واختیارات چار وزیروں میں تقسیم تھے۔ (1) دیوان (وزیر مالیات)(2) میر بخشی (وزیر فوج)(3) میر سامان(وزیر کارخانہ جات اور اسٹور)(4) صدر(وزیر عدالت اور امور مذہبی)اس طرح یہ چار بڑے وزراء تھے۔

بادشاہ اکبر نے اپنے دور حکومت میں جھروکہ درشن کی رسم کو رائج کیا۔طلوع آفتاب کے بعد خاص وعام ہر طبقہ کے لوگ بادشاہ کے درشن کے لئے جمع ہوتے۔بادشاہ جھروکے میں آتا اور لوگ درشن کرتے تھے۔پھر دربار عام منعقد ہوتا اور لوگ اپنے معروضات بادشاہ کے سامنے پیش کرتے تھے۔اس طرح سے روزانہ امور حکومت کو انجام دینے کے لئے تین مرتبہ شاہی دربار لگتا تھا۔جس کا انتظام سلطنت پر گہرا اور اچھا اثر پڑتا تھا۔غسل خانہ (خلوت خانہ) میں مخصوص اور چند قابل اعتماد افراد کو ہی ملاقات کا موقعہ دیا جاتا تھا۔بعد میں بعض امرائے دربار کو بھی حاضری کی اجازت مل گئی۔اس طرح سے امور مملکت وہیں انجام دیئے جانے لگے۔حکومتی معاملات کو انجام دینے کے لئے سہ پہر اور شام کو بھی دربار منعقد ہوتا تھا۔

مغلیہ حکومت کا ایک بڑا عہدیدار دیوان تھا جو محکمہ مالیات کا سربراہ ہوتا تھا۔محکمہ دیوان' دیوان اعلیٰ کے علاوہ دیوان خالصہ (خالصہ اراضی کے لئے) دیوان تان (تنخواہوں کے لئے) مشرف (محاسب خاص) اور مستوفی (حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا) جیسے اہم عہدیداران پر مشتمل ہوتا تھا۔اسی طرح میر بخشی (وزیر فوج) بھی ایک اہم عہدیدار تھا۔یہ فوج کی تنخواہ' جانوروں کو داغنے اور فوجوں کے بھرتی اور حاضری وغیرہ کے متعلق امور انجام دیتا تھا۔کارخانہ جات اور ذخائر سامان کی نگرانی کے لئے ایک مستقل محکمہ تھا جس کا سربراہ میر ساماں کہلاتا تھا۔صدر بھی ایک اہم عہدہ دار تھا جو محکمہ عطیات اور مذہبی امور کا سربراہ ہوتا تھا۔صوبوں میں بھی صدر مقرر ہوتے تھے۔جو اپنے محکمہ سے متعلق فرائض انجام دیتے تھے۔حصول انصاف کے لئے عدلیہ کا بہترین نظام قائم تھا۔عدالتوں کے علاوہ شکایتوں کے ازالہ اور انصاف وحق کے حصول کے لئے بادشاہ کا دربار بھی تھا جس میں خاص وعام اپنے مقدمات براہ راست پیش کرسکتے تھے۔ہر صوبہ کا اعلیٰ عہدہ دار صوبہ دار ہوتا تھا۔اسے سپہ سالار اور ناظم بھی کہا جاتا تھا۔صوبوں میں بھی مرکز کے طرز پر محکمے قائم تھے جو مرکزی محکموں کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔

15.12 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

-1 مغلیہ حکومت میں بادشاہ کی حیثیت اور کار مملکت پر روشنی ڈالئے۔

-2 مغلیہ حکومت میں میر سامان کی حیثیت اور اس کی ذمہ داریاں کیا تھیں واضح کیجئے۔

-3 مغلیہ حکومت کے نظام عدلیہ کو بیان کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

-1 مغلیہ حکومت کے فوجی نظام پر روشنی ڈالئے۔

-2 میر بخشی سے متعلق اپنی معلومات قلمبند کیجئے۔

-3 مغلیہ حکومت کا صوبائی نظام کیا تھا؟ تفصیل کے ساتھ واضح کیجئے۔

15.13 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

-1 سلطنت مغلیہ کا مرکزی نظام حکومت۔ ابن حسن۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

-2 اورنگ زیب کے عہد میں مغل امراء۔ محمد اطہر علی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

-3 آئین اکبری۔ ابوالفضل

-4 اکبرنامہ۔ ابوالفضل

-5 مغلیہ حکومت کا عروج وزوال۔ آر۔ پی۔ ترپاٹھی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اکائی 16 : نظامِ عدل اور سماجی و مذہبی حالات

اکائی کے اجزاء

16.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مغل دور کے نظام عدل سے روشناس کرانا ہے تا کہ انھیں اس بات کی مکمل آگہی ہو سکے کہ مغل عہد کا عدالتی نظام کن اصولوں پر مبنی تھا؟ مغل عہد میں کون کون سے عدالتی عہدے دار ہوا کرتے تھے اور اس عہد کی عدالتوں کے ذریعے عوام الناس کو انصاف کس حد تک مل پاتا تھا؟ ملک کے انتظامی امور میں عدالتوں کا قیام کن کن سطحوں پر تھا اور یہ عوام الناس کے لیے کس حد تک سودمند ثابت ہو رہے تھے؟

اس اکائی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ کو مغل دور کے سماجی ڈھانچے کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی جائیں تا کہ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ ہو سکیں کہ مغل سماج کی کیا حالت تھی؟ عوام الناس کن کن خانوں میں تقسیم تھے اور ان کی سماجی و معاشرتی زندگی کس طرح گزر رہی تھی۔ ساتھ ہی اس اکائی کا مقصد یہ بھی کہ طلبہ کو مغل دور کی مذہبی حالت کے بارے میں بھی واقفیت حاصل کرائی جائے اور انھیں اس بات کا علم ہو سکے کہ ہندوستان میں مغل عہد حکومت میں کون کون سے مذاہب پائے جاتے تھے اور ان کی صورت حال کیا تھی؟ ان مذاہب میں آپسی تال میل کس حد تک تھا؟ کون کون سی مذہبی تحریکیں رونما ہوئیں اور انھوں نے مغل سماج پر کیا اثرات مرتب کیے؟

16.2 تمہید

عدلیہ کسی بھی ملک یا علاقے کے انتظامی ڈھانچے کی بہت ہی اہم کڑی ہوتی ہے کیوں کہ سماجی اور معاشرتی انصاف کا دار و مدار اسی نظام پر ہوتا ہے۔ اگر عدالتی نظام چست اور درست نہیں ہوگا تو پورا سماجی و معاشرتی ڈھانچہ بکھر جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا اور عوام الناس کو انصاف نہ ملنے کی صورت میں معاشرتی افراتفری اور بگاڑ کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ عدالتی نظام کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر انسانی تاریخ کے تمام

ادوار میں نہ صرف اس کے قیام و استحکام بلکہ اسے فعال بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ہندوستانی تاریخ میں مغل عہد اس اعتبار سے ممتاز دور شمار کیا جاتا ہے کہ اس عہد میں نہ صرف عدالتی نظام کو مستحکم بنایا گیا تھا بلکہ اس کی تنظیم اس طرح سے کی گئی تھی کہ ہر حالت میں عوام الناس کو انصاف مل سکے۔

مغل عہد حکومت کی سماجی و مذہبی حالت سابقہ روایت پر ہی مبنی رہی۔سماجی اعتبار سے عوام الناس مختلف بنیادوں پر طبقات میں منقسم تھے۔ان کی پہچان عمومی طور پر حرفے اور پیشے کے ذریعے ہوتی تھی۔مذہبی اعتبار سے ہندوستانی تاریخ کا مغل دور بہت اہم شمار کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس عہد میں نہ صرف بڑے پیانے پر مذہبی تکثیریت کو فروغ حاصل ہوا بلکہ تمام مذاہب ایک دوسرے کے قریب آئے اور لوگوں میں مذاہب کے مطالعے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا جس کے نتیجے میں بڑے پیانے پر علمی وادبی سرمایہ اکٹھا ہوگیا۔اس کے ساتھ ہی مذاہب کے آپسی میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل دور کے ہندوستان میں مختلف طرح کی مذہبی تحریکوں کو ابھرنے اور فروغ پانے کا موقع ملا اور ان تحریکوں نے مغل عہد کی سماجی زندگی پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔

16.3 نظام عدل

ہندوستانی عدالتی نظام کی تاریخ میں مغل دور حکومت کا کردار بہت نمایاں رہا ہے۔مغلوں نے اپنے عہد کے عدالتی نظام میں نئی تبدیلیوں کو روشناس کر کے ہندوستانی عدالتی نظام پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔مورخین کے مطابق موجودہ عہد کے ہندوستانی عدالتی نظام پر مغل عدالتی نظام کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔دوسرے انتظامی ڈھانچوں کی طرح مغل عہد کا عدالتی نظام بھی بہت ہی مستحکم اور فعال شمار کیا جاتا ہے، جس کی سب سے اہم خصوصیت معاملات کا فوری حل تھا۔مغلوں نے ملک میں امن وسکون کو رواج دینے کے لیے انصاف کے قیام پر خاص زور دیا جس کے لیے انھوں نے نچلی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک عدالتی نظام کا ایک جال بچھادیا تاکہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی طرح کی کوئی پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔

مغل ہندوستان کے ایک اہم مورخ ابن حسن کے مطابق مسلم حکومت کا تقاضہ تھا کہ حکمراں قرآنی قوانین کے مطابق حکومت کرے اور اپنی سلطنت میں شریعت کا نفاذ کرے۔ابن حسن کے بقول مغل دور حکومت میں عوام الناس کو مسلم اور غیر مسلم کے خانوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور بادشاہ کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ نہ صرف اس بات کو ممکن بنائے کہ مسلم عوام ایک حقیقی مسلم کی زندگی گزاریں بلکہ ان کی نگرانی بھی کرے اور ذمی کی حیثیت سے غیر مسلم رعایا کے تمام حقوق کی ذمے داری پوری کرے۔ان کے جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب سبھی کی حفاظت کرے۔اس طرح مسلم نظام حکومت کا پہلا عنصر یہ ہے کہ حکمراں تمام ملکی ذمے داریوں کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کے وقار کو بھی بچائے رکھے اور اسلامی شریعت کے مطابق حکومت چلائے۔مسلم نظام حکومت کا دوسرے بنیادی عنصر تمام رعایا کو چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم جان و مال، عزت و آبرو، امن وچین اور خوش حالی و انصاف کی ضمانت دینا ہے۔مسلم فقہاء کا اس بات پر اصرار ہے اور خاص طور سے انصاف کے معاملے میں وہ قانون کے مطابق مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یکساں نظر سے دیکھنے کی وکالت کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ انصاف اور احسان و کرم فرمائی تمام رعایا کے لیے یکساں ہونی چاہیے۔حکمراں زمین پر خدائی سایہ ہوتا ہے اور خدائی احسان و کرم مسلم و غیر مسلم سب کے لیے مساوی ہوتا ہے۔

اس لیے ایک حکمراں کو چاہیے کہ وہ کمزور و ناتواں پر اٹھنے والے ظالم کے ہاتھ کو روک دے کیوں کہ قول نبوی ہے کہ ’’انصاف کے لیے مظلوم کی پکار خدا کے یہاں سے واپس نہیں کی جاتی چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔‘‘

16.3.1 عدلیہ اور اس کی تنظیم

مغل عہد حکومت میں عدالتی تنظیم کا ڈھانچہ تقریباً وہی رہا جو اس سے پہلے شمالی ہندوستان میں دہلی سلطنت کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا۔ زیادہ تر ادارے بھی وہی رہے، جن کا قیام عہد سلطنت میں ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر اس عہد کے عدالتی نظام کا اصل مصدر سلطان تھا۔ حکومت کا سربراہ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے وہ عدالتی نظام کا بھی سربراہ اعلیٰ تھا اور کسی بھی طرح کی حکومتی غلطی کی ذمے داری بھی اسی کی تھی۔ مغل دور کے عدالتی نظام کا دوسرا اہم مرکز قاضی تھا۔ اس عہد کے عدالتی نظام میں قاضی کا کردار بہت اہم تھا۔ وہ مقدمات کی سماعت کرتا اور فیصلے سناتا۔ مغل دور حکومت کے عدالتی نظام میں عدلیہ کے عہدے داران اور ذمے داران بھی تقریباً وہی تھے، جو عہد سلطنت میں تھے، لیکن حکمراں، وقت کے حالات اور نوعیت کے اعتبار سے ان میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ خاص طور سے اکبر کے عہد حکومت میں مغل دور کے عدالتی نظام میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ عدالتی نظام میں سب سے بڑی تبدیلی جو اس عہد میں کی گئی وہ یہ تھی کہ عہد سلطنت میں صدر الصدور کے اختیارات بہت تھے۔ قاضیوں کی تقرری اور ان کے لیے مدد معاش کے طور پر اراضی کے عطیات دینا صدر کے ہاتھوں میں تھا، لیکن اکبر نے صدر کے اختیارات کو کم کیا۔ عدلیہ پر سے صدر کا کنٹرول ہٹا کر قاضی القضاۃ کے سپرد کیا گیا اور مدد معاش کی اراضی عطا کرنے میں بھی صدر کو ’دیوان‘ سے مشورے کا پابند بنایا گیا۔

16.3.1.1 بادشاہ: عدالتی تنظیم کا سربراہ اعلیٰ

مغل ہندوستان میں انصاف کی فراہمی کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ تھا۔ گرچہ فقہا کا اس بات پر اختلاف ہے کہ بغیر قاضی کے بادشاہ کو انصاف کے بندوبست کا حق ہے، ساتھ ہی وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ایک بادشاہ ذاتی طور پر انصاف کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک قانون کے مطابق انصاف کے بندوبست اور انتظام و انصرام کی بات ہے تو اس کے لیے قانون اور اس سے متعلق علوم کی جانکاری ضروری ہے۔ اس کے لیے بادشاہ کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ اپنے عہد کے سب سے قابل عالم کا اس عہدے کے لیے تقرر کرے۔ مغل عہد حکومت میں بادشاہ اس عہدے کے لیے ایک ایسے شخص کا تقرر کرتا جس سے وہ بذات خود اچھی طرح واقف ہوتا اور بادشاہ کی نظر میں وہ شخص اس عہدے کے لیے سب سے مناسب امیدوار ہوتا۔ اگر بادشاہ اس شخص سے ذاتی طور پر واقف نہیں ہوتا تو اہل علم کے ایک مخصوص گروہ کے ذریعے اس کی علمی صلاحیتوں کا امتحان لیا جاتا اور اس کے پڑوسی اس کے اخلاق و کردار کی گواہی دیتے۔ جس طرح سے بادشاہ کو قاضی کی تعیناتی کا حق تھا، اسی طرح اسے یہ حق بھی تھا کہ وہ اسے عہدے سے معزول کردے۔

اسی طرح سے بادشاہ فوج کے لیے ایک الگ قاضی کا تقرر کرتا، جسے ’قاضی عساکر‘ کا نام دیا جاتا۔ اسی طرح سے بادشاہ کو یہ حق بھی تھا کہ وہ ایک شہر میں ایک سے زیادہ قاضیوں کا تقرر کرے لیکن ایسے موقعوں پر ان کے کام اور علاقوں کی توضیح و تشریح ضروری تھی۔ بادشاہ سے یہ امید کی جاتی تھی کہ اس کے پاس قانون کی تھوڑی بہت جانکاری ضرور ہونی چاہیے۔ کیوں کہ شخصی بادشاہت ہونے کی وجہ سے اس کا ایک جملہ کسی

ایک شخص یا گروہ کو انصاف دینے کے لیے کافی تھا۔ وہ جان لے بھی سکتا تھا اور زندگی عطا بھی کرسکتا تھا۔ اس کا فیصلہ حکومت کے لیے بہ یک وقت سودمند اور نقصان دہ ہوسکتا تھا۔ اس کے فیصلوں کے تجزیے اور بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسے کسی بھی طرح کے فرامین جاری کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا۔

16.3.1.2 قاضی/ قاضی القضاۃ

مغل عہد حکومت کی عدالتی تنظیم میں انصاف کے بندوبست کا دوسرا اہم مصدر 'قاضی' تھا۔ مغل دور کے عدالتی نظام میں قاضی کا تقرر بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتا۔ وہ عدالت میں مقدمات کی سماعت کرتا اور ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں بھی سنتا تھا۔ مغل عہد حکومت میں قاضی کی تقرری کے لیے درج ذیل شرائط ضروری تھیں۔

1۔ بالغ مرد ہونا: حنفی قانون کے مطابق قاضی کے عہدے پر ایک عورت کا تقرر بھی ہوسکتا تھا لیکن مغل حکمرانوں نے عورت قاضیوں کا دائرہ کار صرف حرم تک محدود کردیا تھا۔

2۔ آزاد ہونا قاضی کے لیے دوسری شرط تھی۔ قاضی کے عہدے پر غلام کا تقرر نہیں ہوسکتا تھا۔

3۔ عاقل اور ذی شعور ہونا، تاکہ بغیر کسی تفریق کے انصاف کرسکے۔

4۔ مسلمان ہونا: قاضی کے عہدے پر غیر مسلم کی تعیناتی نہیں ہوسکتی تھی۔ قاضی کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ایک اچھا مسلم دانشور ہو، شریعت کے مطابق زندگی گزارتا ہو اور اس کے اوپر کسی قسم کا کوئی اتہام نہ ہو۔ قرآن وسنت اور اسلامی قوانین کی اچھی سمجھ بوجھ رکھتا ہو۔

5۔ ایمان دار ہونا: قاضی ہونے کے لیے ضروری تھا کہ عوام الناس اس شخص کی ایمان داری کی گواہی دیں۔ اسی طرح سے ایک قاضی کے لیے اعلیٰ اخلاق و کردار کا حامل ہونا بھی ضروری تھا۔

6۔ اچھی سماعت اور بصارت کا ہونا: کیوں کہ کسی بھی قاضی کا فیصلہ اس وقت تک صحیح نہیں شمار کیا جاسکتا تھا، جب تک یہ طے نہ ہوجائے کہ اس نے معاملے کو پوری طرح سے سمجھ بوجھ کر اور غور وفکر کے بعد فیصلہ سنایا ہے۔

مغل عہد حکومت میں قاضی کے اختیارات اور اس کا دائرۂ عمل بہت وسیع تھا، ساتھ ہی اس کی ذمے داریاں بھی بہت تھیں۔ قاضی کے عدالتی فیصلوں پر عمل آوری ضروری تھی۔ اصولی طور پر قاضی کے عدالتی اختیارات میں مداخلت کا حق بادشاہ کو بھی نہیں تھا۔ اگر قاضی کے ذریعے قانون کے مطابق کسی مقدمے کا فیصلہ سنایا جاچکا ہے اور بادشاہ دوبارہ اس مقدمے کو کھولنے کا حکم جاری کرے تو بادشاہ کا یہ حکم غیر قانونی شمار کیا جاتا۔ اپنی تقرری کے بعد ایک قاضی اپنے امین کے ذریعے تمام سابقہ دستاویزات پر قبضہ پاتا تھا، ساتھ ہی وہ سابق قاضی کے عہد سے متعلق جائیداد، یتیموں، شادی بیاہ اور وراثت کی تمام فائلوں کی دوبارہ دیکھ ریکھ کرسکتا تھا۔ وہ مقدمات کی دوبارہ تحقیق کرسکتا تھا اور قانون کے مطابق فیصلے کا حق رکھتا تھا۔ قاضی اپنی عدالت مسجد میں یا اپنے گھر میں لگا سکتا تھا۔ بے جا تعلقات سے بچنے کے لیے وہ تحفے تحائف نہیں قبول کرتے تھے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ ایک قاضی کے دفتر کے درج ذیل کام شمار کیے جاسکتے ہیں:

(1) مقدمات کی تحقیقات کرنا اور فیصلے سنانا (2) عدالتی فیصلوں کی تنفیذ (3) ان لوگوں کی جائیداد کے لیے نگراں متعین کرنا جو خود اس کی نگرانی نہیں کرسکتے، جیسے کہ نابالغ اور مجنون وغیرہ (4) اوقاف کا انتظام وانصرام اور ان کی نگرانی (5) وصیت ناموں کی تنفیذ (6) مطلقہ کی دوبارہ شادی کے اخراجات کا انتظام (7) مذہبی قوانین کے ذریعہ متعینہ سزاؤں کی تنفیذ (8) گلیوں، سڑکوں اور عمارتوں کی نگرانی کہ کوئی آدمی گلیوں اور سڑکوں پر غیر منظور شدہ عمارتوں کے ذریعہ قبضہ نہ کرے۔ (9) قانون اور عدالتی عہدے داروں کی نگرانی، جن کے عزل ونصب کا اختیار اسے حاصل ہے۔ (10) ان جگہوں پر صدقہ وصول کرنے والوں کی تعیناتی جہاں اس کی ضرورت ہو۔

16.3.1.3 قاضی عسکر

مغل دور حکومت میں فوج کے لیے ایک علیحدہ قاضی متعین کیا جاتا تھا، جسے قاضی عسکری کہا جاتا ۔ وہ فوج کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہتا اور اس کا دائرہ کار بھی متعینہ حدود تک محدود ہوتا۔ اس مقدمے میں جس کا ایک فریق فوج سے متعلق ہوتا اور دوسرا عوام میں سے، ساتھ ہی دوسرا فریق یہ چاہتا کہ اس کا مقدمہ شہری قاضی کی عدالت میں چلے تو ایسے معاملات میں مقدمہ سننے کا خصوصی حق ہونے کے باوجود بھی قاضی عسکر مداخلت نہیں کرتا۔ اسی طرح سے اگر دونوں فریق فوج سے متعلق ہوتے اور وہ قاضی عسکر کے دائرہ کار میں آنے کے باوجود بھی یہ چاہتے کہ ان کا مقدمہ شہر کے قاضی کے ذریعہ فیصل کیا جائے تو وہ ایسا کرسکتے تھے اور شہر کا قاضی ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔

16.3.1.4 مفتی

مغل عہد حکومت کے عدالتی نظام میں مفتی کا عہدہ بھی کافی اہم شمار کیا جاتا تھا۔ مذہبی علوم کے ماہرین خاص طور پر علم فقہ اور مذہبی قانون میں دست رس رکھنے والے اشخاص مفتی شمار کیے جاتے تھے۔ عدالتوں میں جہاں پر قانون مکمل طور پر واضح نہیں ہوتا تھا وہاں پر مذہبی اعتبار سے ایسے مقدمات و معاملات کو فیصل کرنے کے لیے اس طرح کے مذہبی قانون کے ماہرین کی مدد لی جاتی تھی۔ بشیر احمد کے مطابق مغل عدالتوں میں مفتی شاہی سند کے ساتھ تقرر پاتے تھے اور کبھی کبھی پرگنہ کے مفتیوں کو محتسب کے عہدے کا اضافی چارج بھی دیا جاتا تھا۔ وہ ایک شارح قانون کی حیثیت میں عدالتوں سے منسلک ہوتے تھے، انھیں فیصلہ دینے کا اختیار نہیں تھا۔ مفتی کا کام قاضیوں کے سامنے مقدمے سے متعلق مثالوں اور نمونوں کو پیش کرنا تھا اور قاضی کو اس بات کا اختیار تھا کہ وہ فیصلہ سنائے۔ لیکن کسی بھی مسئلے پر قانون اور شریعت کے مطابق دیے گئے مفتی کے مشوروں کو قاضی نظر انداز نہیں کرسکتا تھا اور رایوں کے اختلاف کے نتیجے میں اعلیٰ عدالتوں کی رائے ضروری شمار کی جاتی تھی۔

16.3.1.5 میر عدل

عمومی طور پر یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ عدالتی نظام کا وہ ڈھانچہ جو عہد خلافت میں تیار ہوا تھا، عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دور سلطنت میں رائج کیا گیا اور مغل عہد میں بھی اسی کو برقرار رکھا گیا۔ لیکن اس عدالتی نظام کے مطالعے کے بعد چند قسم کے عہدے جو ہمیں عہد خلافت میں نہیں ملتے، ان میں سے ایک عہدہ میر عدل کا بھی ہے۔ عدالتی نظام میں یہ عہدہ، سب سے پہلے سکندر لودھی کے عہد حکومت میں متعارف ہوا۔ شیر شاہ سوری کے زمانے میں بھی قاضی کے ساتھ ساتھ میر عدل کا عہدہ برقرار رہا۔ ابوالفضل کے مطابق مغل دور حکومت میں دو عہدے دار مقرر کیے جاتے تھے۔ تحقیقات کرنے والے عہدے دار کو قاضی جبکہ نتائج اکٹھا کرنے والے کو میر عدل کہا جاتا تھا۔ ڈاکٹر بینی پرساد کے مطابق مغل

عہد حکومت میں ہر قصبہ یہاں تک کہ چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں بھی قاضی اور میر عدل کی تعیناتی ہوتی تھی اور یہ دونوں مل کر ایک عدالتی بنچ کی تشکیل دیتے تھے اور کبھی کبھی یہ دونوں عہدے ایک ہی شخص کے پاس ہوتے تھے۔ ڈاکٹر بی پی سکسینہ کے بقول شاہ جہاں کے عہد میں قاضی اور میر عدل کے عہدے بالعموم ایک ہی شخص کے پاس ہوتے۔

بشیر احمد کا قول ہے کہ قاضی کی بہ نسبت میر عدل کے پاس عدالتی اختیارات نہیں ہوتے تھے۔ عدالت میں اس کا یہ کام مفتی کے مشابہ تھا۔ عدالت میں مفتی کسی مسئلے پر قانون کے مطابق اپنی رائے دیتا اور میر عدل حقائق پر مبنی دستاویز تیار کرتا اور پھر قاضی کے ذریعہ مقدمے کا فیصلہ سنایا جاتا۔ حقیقت میں میر عدل عدالت کا سب سے اعلیٰ کلرک تھا۔ میر عدل کی یہ پوزیشن اورنگ زیب کے عہد میں بھی برقرار رہی اور اس عہد میں بھی اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ میر عدل کو الگ سے عدالتی اختیارات حاصل تھے۔ اسی طرح سے اس بات کے بھی شواہد موجود ہیں کہ میر عدل کا عہدہ تمام ریاستوں میں نہیں تھا، جس کی واضح مثالیں گجرات اور بنگال کی عدالتیں ہیں۔

16.3.1.6 محتسب

مسلم تاریخ کے انتظامی امور میں محتسب کا عہدہ دور اول یعنی عہد خلافت سے ہی ملتا ہے۔ ابتدائی عہد میں محتسب کی ذمے داری عوام الناس کے اخلاق و کردار کی نگرانی کے ساتھ ساتھ تجارتی بد دیانتی کی روک تھام تھی۔ ساتھ ہی اس طرح کے مجرموں کی شناخت کے ساتھ انھیں سزا دلوانا بھی اس کی ذمے داری تھی۔ محتسب کا عہدہ دھیرے دھیرے مسلم حکومتوں کے نظم و نسق کا ایک اہم جزء بن گیا اور مسلم تاریخ کے ہر دور، حکومت اور علاقے میں یہ عہدہ برقرار رہا۔

محتسب کی ذمے داریوں میں بہت سی باتیں شامل تھیں، جن میں مضر رساں چیزوں پر روک، عوامی راستوں اور سڑکوں پر سے ناجائز قبضوں اور رکاوٹوں کو دور کرنا، دوسروں کی ملکیت والی زمینوں میں میت کو دفنانے سے روکنا، غلاموں اور جانوروں پر ظالمانہ اور غیر فطری سلوک سے ممانعت، مسجدوں میں نماز کی ادائیگی پر ابھارنا، رمضان کے مہینے میں عوامی مقامات پر کھانے پینے سے روکنا، مطلقہ اور بیوہ عورتوں پر عدت کے ایام کی تنفید، غیر شادی شدہ لڑکیوں اور عورتوں کی شادی پر ابھارنا، کسی بھی شخص کو شراب نوشی کی حالت میں پائے جانے پر سزا دینا وغیرہ شمار کی جاسکتی ہیں۔ بازار کے نگران اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے محتسب اپنے نائبین کے ساتھ روزانہ بازار میں گھومتے۔ اشیا اور ان کی قیمتوں کا معائنہ کرتے، وزن کرنے اور ناپنے والے آلات کی جانچ پڑتال کرتے۔ بہر حال، جہاں تک سزا دینے سے متعلق محتسب کے اختیارات کی بات ہے تو وہ محدود تھیں۔ معاملے میں اگر کسی شک کی گنجائش نہیں ہوتی تو محتسب کو سزا دینے کا اختیار تھا اور اگر کسی معاملے میں جانچ پڑتال اور شہادتوں کی ضرورت پڑتی تو اسے عدالت میں قاضی کے پاس منتقل کر دیا جاتا۔

مذکورہ بالا تمام ذمے داریوں کے ساتھ محتسب کا عہدہ مغل عہد حکومت میں بھی موجود تھا۔ محتسب کا یہ عہدہ مغل عہد حکومت میں دارالسلطنت کے ساتھ ساتھ صوبائی مراکز اور ذیلی صوبائی مراکز میں بھی موجود تھا۔ مغل عہد حکومت میں محتسب کو سزا دینے کا اختیار نہیں تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں محتسب کی ذمے داریوں میں ارتداد، مذمت دین، خلاف شرع کام کرنے اور شریعت پر عمل نہ کرنے کے معاملات کی نگرانی اور اس کی اطلاع دینا بھی شامل تھا۔ اس طرح سے اس عہد میں یہ عہدہ بہت اہم ہو گیا تھا۔ عمومی طور پر مغل عہد حکومت میں محتسب کو شرعی قانون کا مستغیث شمار کیا جا سکتا ہے، جو حکومت کی طرف سے استغاثہ دائر کرتا تھا۔

16.3.1.7 وکیل شرعی یا وکیل سرکار

مغل دور حکومت کے عدالتی نظام میں فریقین کی طرف سے قاضی کے سامنے عدالت میں مقدمے کو پیش کرنے اور اس پر مباحثے کے لیے وکیلوں کی موجودگی بھی ملتی ہے۔ بہت سے مؤرخین نے اس عہد میں اس پیشے کی موجودگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بشیر احمد کے مطابق مورلینڈ کا یہ بیان کہ "بلا شبہ مغل عہد حکومت میں مسلم اور ہندو قوانین کے عالم موجود تھے، لیکن عدالتوں میں فریقین کی طرف سے مقدموں کو پیش کرنے کے لیے وکلا نہیں ہوتے تھے۔" سچائی پر مبنی نہیں ہے۔ انھوں نے نہ صرف وکیلوں کی موجودگی کے واضح ثبوت فراہم کیے ہیں بلکہ نوایسے مقدمات کا ذکر بھی کیا ہے جس میں وکیلوں کی طرف سے مباحثے بھی کیے گئے۔

شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں حکومت کی طرف سے مستقل طور پر وکیل متعین کیے جاتے تھے تاکہ وہ حکومت کے خلاف عوام الناس کا دفاع کریں اور غریب مدعین کو بلا معاوضہ قانونی مشورے دیں۔ حکومت کی طرف سے تمام سرکاروں میں مستقل طور پر وکیلوں کا تقرر ہوتا تھا اور وہ 'وکیل سرکار' یا 'وکیل شرعی' کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان وکیلوں کو حکومت کی طرف سے معاوضے کی شکل میں ایک روپیہ روزانہ کے اعتبار سے ادا کیا جاتا، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ وکیل اپنے موکلوں سے کتنی فیس لیتے تھے؟ بہر حال یہ سچائی ہے کہ یہ وکلاء اپنے موکلوں سے کچھ نہ کچھ فیس ضرور لیتے تھے، جس کی شہادت اورنگ زیب کے اس فرمان سے بھی ملتی ہے، جس میں اس نے سرکاری وکیلوں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ مفلسوں اور غریبوں کو بلا معاوضہ مشورے دیا کریں۔ وکیلوں کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ سبھی مقدمات کے لیے عدالت میں اپنا وکالت نامہ داخل کریں اور موکل کو ہمیشہ اس بات کا اختیار تھا کہ وہ مقدمے کے کسی بھی مرحلے میں اپنے وکیل کے وکالت نامے کو کالعدم کر کے اپنا وکیل تبدیل کر سکتا تھا۔ گرچہ وکیل اپنے موکل کی طرف سے اعتراف نامے کی شکل میں مچلکہ داخل کر سکتا تھا، لیکن اس طرح کا اعتراف نامہ قابل قبول نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی اس کے موکل کے لیے یہ لازمی تھا۔

16.3.2 عدلیہ کی قسمیں

مغل عہد حکومت میں عدالتوں کا قیام اور ان کی تنظیم سلطنت کے انتظامی ڈھانچے کے مطابق تھی۔ اس عہد کا انتظامی ڈھانچہ گاؤں، پرگنہ، سرکار، صوبہ اور دارالسلطنت کے خانوں میں منقسم تھا۔ مغل عہد حکومت میں ان تمام سطحوں پر عدالتیں قائم تھیں، جہاں پر عوام الناس کے لیے انصاف کے حصول کا بندوبست تھا۔ مغل دور حکومت کے انتظامی ڈھانچے میں تکنیکی طور پر گاؤں کو سب سے چھوٹی اکائی کا درجہ حاصل تھا۔ گاؤں کی سطح پر حکومت کی طرف سے کسی قسم کا عدالتی بندوبست نہیں تھا، بلکہ گاؤں کی قدیم روایت کو برقرار رکھتے ہوئے پنچایتی نظام کو جاری رکھا گیا تھا۔ دیہی عوام اپنے معمول تنازعات کو انھیں گرام پنچایتوں میں سلجھا لیا کرتے تھے اور انھیں اپنے ان معمولی جھگڑوں اور تنازعات کے لیے عدالتوں کا رخ نہیں کرنا پڑتا تھا۔

16.3.2.1 پرگنہ عدالت

مغل دور حکومت میں ملک کے ہر پرگنہ میں ایک عدالت قائم تھی، جس کا بندوبست اور انتظام و انصرام ایک قاضی کے ذریعے چلایا جاتا اور اسی قاضی کی ذمے داری ہوتی کہ وہ اپنے پرگنہ کے اندر انصاف کا بندوبست کرے۔ اسی طرح سے مغل عدالتی تنظیم میں سب سے نچلی عدالت

پرگنہ کی عدالت تھی۔ پرگنہ قاضی کی تقرری شاہی سند کے ذریعے ہوتی اوراس کی ذمے داری ہوتی کہ اپنے پرگنہ کے اندر آنے والے تمام گاؤں کے لوگوں کو انصاف دلائے۔ مغل عہد کی عدالتی تنظیم میں پرگنہ عدالت کو گرچہ سب سے نچلی عدالت کا مقام حاصل تھا، لیکن ضرورت کے مطابق عہدے داران کی تقرری اور وسائل کی فراہمی اس کے عدالتی وقار کو قائم کرنے کے لیے کافی تھی اور اس نچلی عدالت کے اندر یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنے فیصلوں کا نفاذ کر سکے۔

ان پرگنہ عدالتوں سے قاضی کے علاوہ مفتی، محتسب اور داروغہ عدالت جیسے افسران منسلک ہوتے۔ کچھ پرگنہ عداتوں میں مفتی اور محتسب کے عہدے پر ایک ہی شخص کی تقرری ہوتی، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ مفتی اور محتسب کے دفاتر آپس میں ضم کر دیے گئے ہیں، بلکہ ایک معینہ مدت کے لیے مفتی کو محتسب کا بھی اضافی چارج دے دیا جاتا تھا۔ داروغہ عدالت عموی طور پر ایک چھوٹا منصب دار ہوتا، جس کی تعیناتی احکامات کی تعمیل کرانے اور امن کی بحالی کے لیے کی جاتی۔ خاص طور پر اس کی ذمے داری یہ ہوتی کہ عدالتی کارروائیوں کے دوران امن وسکون بحال رکھے اور کسی طرح کا تنازع نہ پیدا ہونے دے۔

16.3.2.2 ضلعی (سرکاری) عدالتیں

مغل انتظامی امور میں سرکار صوبوں کی ایک ذیلی تقسیم تھی، جس کے اندر متعدد پرگنے شامل ہوتے تھے۔ سرکاری حکومت کا کام نہ صرف پرگنہ کے کاموں کی نگرانی رکھنا تھا بلکہ ان تمام امور اور مسائل کی بھی دیکھ ریکھ تھی جو پرگنہ کے دائرہ کار سے باہر تھے۔ انصاف کے بندوبست کے لیے سرکار کے اندر مختلف قسم کی عدالتیں قائم تھیں۔ دیوانی اور فوج داری عدالتیں قاضی سرکار کے ماتحت تھیں، جہاں پر نہ صرف دیوانی، فوجداری اور شرعی امور سے متعلق مقدمات سنے جاتے تھے بلکہ پرگنہ عدالتوں کی اپیلیں بھی درج کی جاتی تھیں۔ سرکار کا صدر اعلیٰ بھی، جو عام طور پر فوجدار ہوا کرتا تھا، عدالتی کارروائی انجام دینے کے اختیارات رکھتا تھا۔ وہ اپنی عدالت میں شورش و ہنگامہ اور امن وسلامتی سے متعلق مقدمات کی سنوائی کرتا اور فیصلے سناتا۔ سرکار اور مختلف قصبوں میں قانونی خلاف ورزی اور انحراف سے متعلق چھوٹے مقدمات کوتوال کے ذریعے فیصل کیے جاتے، جو چیزیں آج کل میونسپل قوانین کے تحت آتی ہیں۔ سرکار کے عامل کی بھی اپنی عدالت ہوتی تھی، جہاں پر مال گزاری سے متعلق مقدمات فیصل کیے جاتے تھے اور پرگنہ عامل کی عدالتوں کی اپیلیں سنی جاتی تھیں۔ حقیقی معنوں میں سرکار میں واقع ان سبھی عدالتوں میں قاضی کی عدالت سب سے اہم تھی۔ ڈاکٹر پی سرن کے مطابق ''مغل عہد حکومت میں فوج دار کے پاس کسی بھی طرح کا عدالتی اختیار نہیں تھا۔'' ان کا مزید کہنا ہے کہ ''قاضی اور کوتوال مل کر تمام طرح کے عدالتی مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ مجسٹریٹ، پولیس کے افسر اعلیٰ اور میونسپل افسران تمام عہدوں کو کوتوال کی صورت میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔ ایک مجسٹریٹ کی صورت میں وہ فوج داری سے متعلق سرکار کے تمام مقدمات کی سماعت کرتا اور پولیس کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے اس کی عمل داری کو صرف سرکار کی دارالحکومت سے متعلق قصبوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ مقدمات کے بارے میں کوئی واضح تقسیم نہیں تھی کہ کون سے معاملات قاضی کے پاس جائیں گے اور کون سے کوتوال کے پاس؟ لیکن اس عہد کے چند مشہور مقدمات کو دیکھنے سے یہ فرق کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ فوج داری سے متعلق عام معاملات کوتوال کے پاس سنے جاتے تھے اور مذہب سے متعلق فوجداری مقدمات جیسے کہ شادی، طلاق اور وراثت ساتھ ہی تمام طرح کے دیوانی مقدمات قاضی کے یہاں طے پاتے تھے۔''

قاضی سرکار کی عدالت عام طور مراکز میں لگتی تھی۔ قاضی سرکار کی عدالت میں پیشکار، کاتب، امین، ناظر، دفتری محلکہ نویس اور اردلی

وغیرہ پر مشتمل عملہ ہوتا تھا۔ ان کے علاوہ قاضی سرکار کی عدالت سے کچھ افسران بھی منسلک ہوتے تھے، جن کا کام قاضی کو صلاح ومشورے دینا تھا۔ ان میں داروغہ عدالت، میر عدل، مفتی، پنڈت، محتسب بلدیہ اور وکیل شرعی شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قاضی سرکار اپنے دائرہ کار کی جیلوں کا سرکاری معائنہ کنندہ بھی تھا اور اسے اس بات کا اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنے علاقے کی جیلوں کا معائنہ کرکے قیدیوں کے مقدمات کا جائزہ لے اور زیر سماعت قیدیوں کو ضمانت پر رہا کرے۔ قاضی سرکار کی تقرری کے شاہی فرمان کی سند صدر الصدور کے یہاں سے جاری ہوتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ قاضی سرکار صدر الصدور کے شعبے کا ماتحت ہے بلکہ یہ اس وقت کا ایک طریقہ تھا۔ اکبر کے دور حکومت میں عدالتی شعبے کو صدر الصدور کے اختیارات سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس طرح سے اب قاضی سرکار حقیقی طور پر قاضی صوبہ کے ماتحت تھا۔

16.3.2.3 صوبائی عدالتیں

صوبہ مغل دور حکومت میں انتظامی تقسیم کا سب سے بڑا حصہ تھا، جس میں متعدد اضلاع (سرکاریں) شامل ہوتے تھے۔ صوبائی سطح پر ہر صوبے کی ذمے داری صوبے دار (گورنر) کی ہوتی تھی، جو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہ صرف صوبے کا نظم ونسق چلاتا تھا بلکہ اپنے علاقے کی نگرانی و دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ انصاف کے نظم وانصرام کے لیے صوبائی سطح پر ہمیں تین طرح کی قانونی عدالتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (1) ناظم صوبہ کی عدالت (2) قاضی صوبہ کی عدالت (3) دیوان صوبہ کی عدالت

ناظم صوبہ کی عدالت

صوبائی گورنر کی ذمے داریوں میں سے ایک اہم ذمے داری یہ بھی تھی کہ وہ اپنے دائرہ کار یعنی صوبے میں انصاف کے قیام کا مکمل نظم و نسق کرے۔ جہاں تک صوبے میں انصاف کے قیام اور انتظام وانصرام کا تعلق ہے تو عام طور سے زیادہ تر صوبے دار اس میں اپنی عزیمت کا ثبوت دیتے تھے، وہ اپنے سستی و کاہلی کے ذریعے عوام کو ایذا میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ مقدمات کے حل کے لیے وہ قسموں اور گواہیوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ بذات خود سچائی کی تحقیق کرتے تھے اور فریقین سے رحم دلی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ ناظم صوبہ کی عدالت میں نئے مقدمات اور دوسری عدالتوں کی اپیلیں دونوں دائر کی جاسکتی تھیں۔ صوبے میں بادشاہ کا نمائندہ ہونے کی بنا پر وہ اپنے صوبے میں موجود تمام عدالتوں کی اپیلیں سنتا تھا یہاں تک کہ قاضی صوبہ کی عدالت کی اپیل بھی دائر ہوتی تھی۔ نئے مقدمے میں ناظم صوبہ یک رکنی جج کی حیثیت سے فیصلہ سناتا تھا اور اس کے فیصلے کی اپیل مرکزی عدالت میں کی جاسکتی تھی۔ جب وہ کسی دوسرے عدالت کے فیصلے کی اپیل سنتا تھا تو اس وقت عدالت دو رکنی ججوں پر مشتمل ہوتی تھی اور اس عدالت کا دوسرا ممبر قاضی صوبہ ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ زمینی مال گزاری کے مقدمات بھی اس کی عدالت میں دائر ہوسکتے تھے جب کہ عمومی طور پر یہ مقدمہ دیوان صوبہ کی عدالت کا تھا۔ ناظم صوبہ کی عدالت کے دو اہم افسر مفتی اور داروغہ عدالت ہوتے تھے جو مقدمے کو حل کرنے میں اس کا تعاون کرتے تھے۔

قاضی صوبہ کی عدالت

صوبے کی سطح پر عدالتی تنظیم کا شعبہ بنیادی طور پر قاضی صوبہ کے ماتحت تھا۔ گرچہ کچھ مورخین کی رائے ہے کہ قاضی صوبہ کا تقرر قاضی القضاۃ یا شرع جہان کے ذریعے عمل میں آتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاضی صوبہ کی تقرری کا حتمی فیصلہ بذات خود بادشاہ کے ذریعے ہوتا تھا بقیہ

سب صرف سفارشی ادارے کا درجہ رکھتے تھے یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اداروں کی حیثیت بہتر امیدوار کے انتخابات کی تھی نہ کہ انھیں تقرر دینے کی۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں نئے قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدمے بھی درج ہوتے تھے اور صوبوں میں نچلی عدالتوں کے فیصلوں کی اپیلیں سننے کی مرکزی عدالت شمار ہوتی تھی۔ اس کے عدالتی اختیارات صوبائی گورنر کے برابر تھے اور گورنر کی عدالت میں بھی اس کی ایک مستقل سیٹ ہوتی تھی۔ اس کے پاس ضلعی قاضیوں کے فیصلوں کی اپیلیں آتی تھیں اور ان معاملات میں جہاں شاہی یا حکومتی اختیارات پر سوال اٹھتے تھے گورنر بھی قاضی صوبہ سے مشورے لیتا تھا۔ بجا طور پر قاضی صوبہ کی ذمے داری بڑی اہم اور نازک تھی کیوں کہ قانون کی ذرا سی ان دیکھی انصاف کے خاتمے کا نتیجہ ہو سکتی تھی۔ قاضی صوبہ کی عدالت میں اس کے تعاون کے لیے وہ تمام عدالتی عملہ متعین ہوتا تھا جس کا تذکرہ قاضی سرکار کے ماتحت ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی قاضی صوبہ کی عدالت سے مفتی، محتسب، داروغہ عدالت، میر عدل، پنڈت، سوانح نویس اور وقائع نگار جیسے افسران بھی منسلک ہوتے تھے۔

دیوان صوبہ کی عدالت

صوبائی سطح پر واقع دیوان صوبہ کی عدالت کا کام صرف مال گزاری سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کرنا تھا۔ اس عدالت میں عامل کے احکامات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں درج کی جاتی تھیں۔ ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلیں اعلیٰ عدالتوں یعنی مرکزی عدالتوں اور ناظم صوبہ کی عدالت میں داخل کی جا سکتی تھیں۔

16.3.2.4 مرکزی عدالتیں

مغل دور حکومت میں عوام الناس کو انصاف کی فراہمی کے لیے دارالسلطنت میں بھی عدالتیں قائم تھیں، جہاں پر پورے ملک سے لوگ انصاف کے حصول کے لیے درخواستیں دے سکتے تھے۔ مغل عہد حکومت میں مرکزی سطح پر تین طرح کی عدالتوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ (1) شاہی عدالت (2) عدالت عظمیٰ (3) مرکزی مال گزاری عدالت

شاہی عدالت

مرکز میں واقع شاہی عدالت سلطنت کی سب سے بڑی عدالت تھی۔ بادشاہ اپنی عدالت میں دیوانی اور فوجداری دونوں طرح کے مقدمات سنتا تھا اور مملکت میں واقع عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف آخری اپیل بھی سنتا تھا۔ جب وہ عدالتی فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سنوائی کرتا تو وہ عدالت میں موجود ججوں کا صدر اعلیٰ ہوتا اور یہ عدالت بادشاہ کے علاوہ قاضی القضاۃ اور اس کی عدالت کے دوسرے قاضیوں پر مشتمل ہوتی۔ بادشاہ جب اپنی عدالت میں کسی نئے مقدمے کی سماعت کر رہا ہوتا تو اس کی مدد کے لیے اس وقت مفتی یا میر عدل موجود ہوتے۔ اس کے سامنے درخواستیں داروغہ عدالت کے ذریعے پیش کی جاتیں، اگر اسے قانونی طور پر کسی صلاح و مشورے کی ضرورت ہوتی تو وہ اسے اس مقصد کے لیے موجود ایک بنچ کے سپرد کر دیتا۔

مغل دور حکومت میں بادشاہ کی عدالت بہت مشہور تھی۔ عوام الناس اس کی عدالت میں اپنے مقدمات اور فیصلوں کے خلاف اپیلیں لے کر آتے۔ بادشاہ کی عدالت کے ساتھ مفتی، میر عدل، محتسب اور داروغہ عدالت وابستہ ہوتے۔ بادشاہ روزانہ کھلے دربار میں معمولی مقدمات

کی سماعت کیا کرتا تھا اور اہم مقدمات کی سماعت اس کی عدالت میں ہفتے میں ایک دن ہوتی تھی ۔ تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر نے اس کے لیے جمعرات، جہاں گیر نے منگل اور شاہ جہاں نے بدھ کا دن متعین کر رکھا تھا۔

عدالت عظمی

اس عدالت کا صدر اعلیٰ قاضی القضاۃ ہوتا جسے مغل سلطنت کا چیف جسٹس کہا جاسکتا ہے۔ عدالتی تنظیم میں اہمیت کے اعتبار سے اس کا درجہ بادشاہ کے بعد تھا۔ وہ قاضی القضاۃ کی حیثیت سے جانشینی کے وقت حکمران کے حلف کا نظم و انصرام کرتا اور مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام کے ساتھ پڑھنے کا حکم جاری کرتا۔ قاضی القضاۃ کی تقرری بادشاہ کے ذریعے عمل میں آتی۔ اس کی تقرری کے لیے دانشورانہ، علمی اور قانونی صلاحیتوں کے ساتھ اخلاق و کردار پر خصوصی توجہ صرف کی جاتی۔ اس کا تقرر سیدھے طور پر بھی ہوسکتا تھا اور کبھی کبھی صوبائی قاضیوں کو بھی اس عہدے پر ترقی دے دی جاتی تھی۔ قاضی القضاۃ کے پاس دیوانی اور فوج داری سے متعلق جدید مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا، ساتھ ہی وہ نچلی عدالتوں کی اپیلیں بھی سنتا تھا اور صوبائی عدالتوں کے کاموں کی نگرانی بھی کرتا تھا۔ اس کے پاس مستقل طور پر اس کے تعاون کے لیے نائب کی حیثیت ایک یا دو قاضی متعین ہوتے تھے۔

مذکورہ بالا ذمے داریوں کے علاوہ قاضی القضاۃ کی درج ذیل ذمے داریاں تھیں:

1۔ دارالحکومت میں نماز جمعہ اور عیدین کی امامت کرنا۔

2۔ شاہی گھرانوں اور دوسری اہم تعزیتوں میں شرکت کرنا۔

3۔ شاہی گھرانوں کی نکاح خوانی کرنا۔

4۔ احکام شریعت کی تنفیذ کی نگرانی کرنا۔

اسی طرح سے عوام الناس پر نئے محصول کے نفاذ کے وقت قاضی القضاۃ کا مشورہ ضرور لیا جاتا تھا۔ مغل دورِ حکومت میں دارالسلطنت کا علاحدہ قاضی مقرر کیا جاتا تھا، جس کا درجہ قاضی صوبہ کے برابر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی متعینہ مدت کے لیے عہدہ خالی ہونے کی صورت میں قاضی القضاۃ یا دوسرے قاضیوں کی ذمے داری بھی اسی قاضی کے ذریعے ادا کی جاتی تھی۔

مرکزی مال گزاری عدالت

مرکزی مال گزاری عدالت کا صدر دیوان اعلیٰ ہوتا تھا۔ وہ حکومت کی مال گزاری اور تمام طرح کے مالیاتی امور کا نگران اعلیٰ ہوتا۔ وہ مال گزاری سے متعلق جدید معاملات کی سماعت کرتا اور مال گزاری سے متعلق صوبائی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیل بھی سنتا۔ ان تمام کے علاوہ حقیقی طور پر اس کے ذریعے سلطنت کی معاشی پالیسیاں طے کی جاتیں۔ عدالتی چارہ جوئی سے متعلق صوبائی سطح سے اپیلیں اس کے پاس بمشکل ہی آتی تھیں اور شاذ و نادر ہی کوئی درخواست حکمراں کے خلاف دائر کی جاتی تھی۔

16.4 سماجی تنظیم

مغل عہد کے ہندوستانی سماج کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس دور کا سماج مختلف طبقات میں منقسم تھا اور اس سماجی تقسیم کی بنیادیں بھی مختلف تھیں۔ مغل دور کی سماجی تقسیم کی پہلی بنیاد مذہب کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ تاریخی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوتی ہے کہ اس دور میں عوام الناس مذہبی بنیادوں پر ایک دوسرے سے الگ تھے۔ مختلف مذاہب نے ان کے درمیان معاشرتی طبقات کو جنم دیا تھا۔ اس عہد کی سماجی درجہ بندی کی دوسری بنیاد پیشہ کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ سماجی تقسیم کی ایک ایسی بنیاد ہے جس کا وجود انسانی تاریخ کے ہر دور اور علاقے میں رہا ہے۔ مغل دور حکومت میں بھی عوام اپنے پیشے کے لحاظ سے مختلف طبقات میں بٹے ہوئے تھے۔ اسی طرح سے رہائش کے اعتبار سے بھی عوام کی سماجی درجہ بندی کی جاتی ہے اور مغل دور میں بھی ہمیں اس طرح کی درجہ بندی کے ثبوت ملتے ہیں۔ مثلاً عوام کو دیہی اور شہری کے خانوں میں منقسم کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے اگر دیکھا جائے تو معاشرتی تقسیم کی اور بھی بہت سی بنیادیں فراہم ہوسکتی ہیں، جن کا وجود ہمیں انسانی تاریخ کے مختلف ادوار سے فراہم ہوتا ہے۔

16.4.1 دیہی آبادی

مغل دور میں دیہی آبادی عام طور پر کاشت کاروں، دست کاروں اور کام گاروں پر مشتمل ہوتی تھی اور یہی تمام لوگ مل کر ایک گاؤں کی تشکیل کرتے تھے۔ مغل ہندوستان میں بھی ملک کی بڑی آبادی گاؤں میں ہی آباد تھی اور یہ تقریباً کل آبادی کا 85 فیصد حصہ تھی۔ مغل ہندوستان کی دیہی آبادی کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس عہد میں گاؤں کی بہت سی مختلف قسمیں تھیں۔ مثال کے طور پر مارواڑ، راجستھان میں ایسے گاؤں تھے جن کو 'بسی' کہا جاتا تھا، جب کہ دوسرے علاقوں میں اسی قسم کے گاؤں کو 'چھپر بند' کے زمرے میں شامل کیا جاتا تھا۔ یہ ایسے گاؤں تھے، جہاں کاشت کاروں کو سرداروں نے بسایا تھا، اس لیے انھیں وہاں رہ کر کم وبیش اپنے سرداروں کے بندو بست میں ہی گزر بسر کرنی پڑتی تھی۔ لیکن مغل دور میں ایسے گاؤں کی تعداد زیادہ تھی، جن میں عوام آباد تھے، یعنی ان گاؤں کی آبادی ایسے کاشت کاروں پر مشتمل تھی جو خود ہی کسی جگہ پر آباد ہو گئے تھے۔ حقیقت میں دوسری قسم کے گاؤں میں ہی دیہی آبادی کے نیم آزاد سماج کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ایسے گاؤں ہر جگہ دو طرح کے کاشت کاروں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک طرف خود کاشت والے کاشت کار ہوتے تھے، جو ان لوگوں پر مشتمل تھے، جنھوں نے گاؤں کو آباد کیا تھا اور دوسری طرف مختلف جگہوں سے منتقل ہو کر آنے والے کاشت کار تھے، جن کی آراضی کو 'پاہی کاشت' کا نام دیا جاتا تھا۔ ان دوسری قسم کے کاشت کاروں کا گاؤں کے انتظامی امور سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔ سولہویں صدی کے دستاویزات میں دیہاتوں کے رہنے والے ایسے بہت سے لوگوں کا ذکر ملتا ہے جو اپنے آپ کو 'پنچ' یا 'مقدم' کہتے تھے۔ انھیں گاؤں کی غیر مزروعہ زمین کو قیمتاً یا مفت کسی کو بھی دینے کا اختیار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں کے 'مقدموں' یا 'پنچوں' کو جو اپنے آپ کو پورے گاؤں کا نمائندہ سمجھتے تھے، غیر مزروعہ یا افتادہ زمین پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ گاؤں کے دست کاروں، کام گاروں اور دوسرے نچلے کام کرنے والوں کو آراضی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دیے جاتے تھے، جن پر کوئی محصول عائد نہیں ہوتا تھا۔ آراضی کے ان ٹکڑوں کے بدلے میں انھیں پورے گاؤں کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خدمت میں زیادہ توجہ ان ہی لوگوں پر رہتی تھی، جو پنچ کے زمرے میں آتے تھے یا پھر ان لوگوں پر جو بعض روایتی ادائیگیاں کرنے کے اہل تھے۔ دستاویزات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ایک گاؤں کے پنچ عموماً ایک ہی قوم یا ذات سے تعلق رکھتے تھے لیکن کبھی کبھی ان کے درمیان متفرق

فرقوں اور اقوام کے لوگ بھی شامل ہو جاتے تھے۔مثلاً بعض گاؤں میں ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ پنچ کے زمرے میں شامل نظر آتے ہیں۔ایسا شاید اس لیے تھا کہ کاشت کار اکثر مختلف ذاتوں اور برادریوں میں بٹے ہوئے تھے، جن کی سماجی حیثیت مختلف ہوتی تھی۔بعض گاؤں میں تمام کاشت کار ایک ہی ذات سے متعلق ہوتے تھے۔لیکن چند دوسرے گاؤں میں کاشت کاروں کی ایک سے زیادہ ذات برادریوں کے لوگ آباد تھے۔عام طور پر دست کاروں اور گاؤں کی ملازمت کرنے والے زیادہ تر لوگ نہایت سختی کے ساتھ ذاتوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نوآبادیاتی عہد سے پہلے اچھوت برادریاں دیہی کام گاروں کی اکثریت کی نمائندگی کرتی تھیں۔کیرالا میں اس زمرے کے کام گار زرعی غلاموں کی حیثیت میں پائے جاتے تھے۔بہار کے بعض حصوں میں بھی زرعی غلامی پائی جاتی تھی اور اس طرح کی صورت حال آسام کے آہوم رجواڑوں میں بھی تھی۔

انفرادی کاشت اور بازار کے لیے اشیا پیدا کرنے کے رجحان کی وجہ سے دیہی سماج میں معاشی تفریق کا عمل شروع ہو چکا تھا۔گاؤں کی غیر مزروعہ اور افتادہ آراضی پر پنچوں کے کنٹرول اور ان کے ذریعے زرعی ٹیکس جمع کیے جانے کے نتیجے میں معاشی تفریق کا یہ عمل اور تیز ہو گیا۔ بڑے کاشت کار اب وسیع آراضیوں میں اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں کی مدد سے مختلف فصلیں پیدا کرنے لگے تھے۔اس طرح یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دیہی آبادی جمہوریت کا نمونہ ہونے کے بجائے چھوٹے اور عام کسانوں، دست کاروں اور کام گاروں کے مزید استحصال کا ایک ذریعہ ہی تھی۔

16.4.2 شہری آبادی

مغل دور حکومت میں حکمراں طبقے کے پاس بڑے پیمانے پر وسائل موجود تھے۔ان میں سے زیادہ تر وہ شہروں میں اپنے ذاتی عملوں اور ملازمین پر صرف کرتے تھے۔ساتھ ہی وہ دست کاروں کی بنائی ہوئی اشیا بھی خریدتے تھے اور دوسری شہری آسائشیں پیدا کرنے والوں کی سرپرستی بھی کرتے تھے، جس کے نتیجے میں شہری آبادی میں مستقل اضافہ ہو رہا تھا۔مغل دور حکومت میں آگرہ کی آبادی ساڑھے سات لاکھ کے قریب پہنچ گئی تھی اور امکان یہ ہے کہ مغل ہندوستان میں شہری آبادی کل ملکی آبادی کا 15 فیصد کے قریب تھی۔

شہری آبادی میں بڑی تعداد مزدور اور نوکر پیشہ لوگوں کی تھی جو روزانہ یا ماہانہ اجرت پر کام کرتے تھے۔ان کے علاوہ گھروں میں کام کرنے والے غلام تھے، جن میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جو زنان خانہ میں کنیزوں یا داشتاؤں کی حیثیت سے رکھی جاتی تھیں۔عہد سلطنت کی صورت حال کے برخلاف مغل عہد میں غلاموں کی سر عام منڈیوں کا ذکر نہیں ملتا اور نہ ہی غلام مزدوروں سے کام لینے کی صورت نظر آتی ہے۔ برنیر کے مطابق دست کاروں کی حالت خستہ تھی اور ان کی اجرت بھی بہت کم تھی، کیوں کہ امراء ان سے بسا اوقات زبردستی کام لیتے تھے۔لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تصویر بھی کسی حد تک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کا نتیجہ ہو۔مثلاً تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہے کہ احمد آباد میں زربفت بنانے والے کاری گر ایک بڑی تعداد میں دور دراز کے بازاروں کے لیے مال تیار کرتے تھے۔ان کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان پر اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے ممکنہ خریداروں کا کوئی دباؤ نہیں تھا۔

مغل عہد میں شہروں کو تجارتی مراکز بنا کر مختلف علاقوں کے درمیان تجارتی لین دین ہونے لگا تھا اور جن تجارتی ذرائع سے زرعی پیداوار کو شہروں تک لایا جاتا تھا وہ شہری تاجروں کے لیے بھی منافع بخش تھے۔تجارتی سہولیات فراہم ہونے کی وجہ سے شہروں میں مقیم تجارت

پیشہ لوگوں میں خوش حالی پیدا ہو چکی تھی۔ ساتھ ہی مغل سلطنت میں انتظامیہ کی مرکزیت اور اس کے اثر میں تجارت کے فروغ کی وجہ سے پیشہ وروں اور تاجروں پر مشتمل 'متوسط طبقات' سامنے آ چکے تھے۔

مغل سماج کا ایک بڑا حصہ جس میں دیہات اور شہر دونوں جگہوں کے لوگ شامل تھے، سپاہی پیشہ لوگوں پر مشتمل تھا۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں مختلف علاقوں میں زمین داروں کے خدمت گاروں کی تعداد درج کی ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق زمین داروں کے خدمت گاروں میں 3,85,558 سوار اور 42,77,057 پیادے تھے۔ عملاً یہ سب سپاہی تھے اور دیہات سے تعلق رکھتے تھے۔ چند مورخین کے مطابق یہ چالیس لاکھ سے اوپر پیادے یقیناً ہتھیار بند کسان تھے۔ لیکن سوار جو زمین داروں کی نوکری میں تھے یا وہ سوار جن کو مالی عملہ کے لوگ اپنے کاموں کے لیے استعمال کرتے تھے، شاید دیہات کے نسبتاً خوش حال طبقوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ممکن ہے کہ انھیں مقدموں یا چھوٹے زمینداروں میں سے بھرتی کیا جاتا ہو۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ بادشاہ اور منصب دار جن پیادوں کو بندوقچیوں، توپچیوں اور بان پھینکنے والوں کی حیثیت سے نوکر رکھتے تھے، وہ سب کسانوں یا دیہاتی دست کاروں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ایک وقت میں اس قسم کے پیادوں کی کل تعداد چالیس ہزار تھی، جن کو شاہی خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ 1946-47 میں شاہی فوج کے سواروں کی کل تعداد، بشمول ان سواروں کے جو منصب داروں کی نوکری میں تھے، دو لاکھ کے قریب تھی۔ یہ سب مختلف طبقات یا گروہوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ ان میں بہت سے وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے گھڑسوار بھی تھے۔ ان کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جن کا تعلق راج پوت نسلوں سے تھا۔ دیہی علاقوں سے بھرتی کیے گئے سپاہی جب شہروں میں تعینات ہوتے تھے تو کبھی کبھی یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ شہر فوجی چھاؤنی بن گیا ہے۔

16.4.3 قبائل

مغل عہد کی سماجی تنظیم کا ایک اہم جزء وہ قبائل تھے، جو ذات پات کے نظام سے باہر تھے۔ اس عہد میں بعض ایسے بہت سے قدیم گروہ جنگل کے علاقوں میں ملتے تھے، مثلاً وہ 'بن مانس' جو آندھرا میں نندپال اور کرنول کے درمیان موجود ہیں، یہ لوگ کسی قسم کا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے اور اپنی گزر بسر کے لیے شہد اور جنگلی بیجوں کو جمع کرنے کے علاوہ جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ کچھ ایسی ہی حالت موجودہ ناگا قبائل کے آبا و اجداد کی تھی۔ یہ لوگ 'ننگا' کہلاتے تھے، کیوں کہ انھوں نے کسی قسم کی پوشاک پہننی شروع نہیں کی تھی اور ابھی سماجی ترقی کے اس دور سے باہر نہیں آئے تھے، جب انسان کی گزر بسر جنگل سے جمع کی گئی اشیائے خوردنی پر منحصر تھی۔ پھر بھی ناگا گروہ میں اس قدر سماجی تفریق ضرور آ گئی تھی کہ ان میں سے بعض لوگ آسام جا کر عود کی لکڑی کے بدلے نمک اور اناج لے آئے تھے۔ ایسے حالات میں جنگلات کے علاقے شکاریوں اور اشیائے خوردنی جمع کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہو سکتے تھے، جو شاید ایک قبائلی تنظیم کی ابتدا تھی۔ جن علاقوں میں لوگوں کی گزر بسر مویشیوں کی پرورش پر تھی، وہاں سب کا مل کر چراگاہوں کو استعمال کرنا قبائل کی تنظیم کو ایک مخصوص قسم کی اساس مہیا کرتا تھا۔ یہ چراگاہ موسموں کے اعتبار سے تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ ایسی صورت حال میں قبائل کے لوگ اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ تجارت بھی کرتے تھے، جو ان کی زندگی میں خوش حالی کا سبب بنتی تھی۔ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچستان اور سندھ علاقہ کے نہردی قبیلہ کے لوگ، جن کا اصل پیشہ جانوروں کی پرورش تھا، اونٹوں، گھوڑوں، بھیڑوں، کھالوں، قالینوں اور پہاڑی علاقے میں پیدا ہونے والی دوسری اشیاء کی تجارت کرتے تھے۔ وہ ان اشیاء کے بدلے میں میدانی علاقوں سے اناج، مختلف قسم کے ہتھیار اور کپڑے لے جاتے تھے۔ اسی طرح وسطی ہمالیہ میں

جانوروں کو پالنے والے خانہ بدوش قبائل بھی تجارت کرتے تھے۔

افغان قبیلے بھی ابتدا میں جانوروں کی پرورش کرنے والے لوگ تھے۔گرچہ افغان قوم کا نام تاریخ میں بہت پہلے سے جانا جاتا ہے لیکن ان کے کچھ قبیلوں کے نام پہلی بار پندرہویں اور سولہویں صدیوں کی تحریروں میں ملنے شروع ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب افغانوں نے جانوروں کی پرورش کے ساتھ زراعت اور تجارت کے پیشوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔اسی دوران شمال کی طرف ان کے پھیلنے کا عمل بھی شروع ہو چکا تھا، جو لمبے عرصے تک جاری رہا۔افغانوں کی ان روایات سے، جو 'آئین اکبری' اور 'تاریخ خان جہانی' میں درج ہیں، پتہ چلتا ہے کہ ہر قبیلہ مختلف افراد کی اولاد ہونے کا دعوے دار تھا۔یہ قبائل اکثر ان ہی افراد کے نام سے جانے بھی جاتے تھے۔لیکن ان قبائل میں اکثر باہر کے افراد کو اپنے اندر شامل کر لینے کی رسم بھی تھی۔اسی طرح سے مختلف قبائل کے لوگوں کے درمیان آپسی شادی بیاہ کے رشتے بھی عام تھے۔

16.4.4 حکمراں طبقہ/امراء

مغل دور کا ہندوستانی سماج جاگیرداری نظام پر مشتمل تھا اور اس سماجی نظام کا سربراہ اعلیٰ بادشاہ ہوا کرتا تھا۔پورے ملک کا حکمراں ہونے کی وجہ سے ملک کی تمام زمینوں پر اس کے مالکانہ حقوق تصور کیے جاتے تھے۔شاہی خاندان کے لوگ، ان کے رشتے دار، دوست احباب اور بادشاہ کے مقربین حکمراں طبقے میں شمار کیے جاتے تھے اور سماجی اعتبار سے ان کا درجہ سب سے بلند ہوتا تھا۔

مغل عہد حکومت میں امراء بھی حکمراں طبقے میں شمار ہوتے تھے۔ان کا تعلق منصب داری اور جاگیرداری نظام میں سب سے اونچا ہوتا تھا، بادشاہت کے تبع ہوتے اور اعلیٰ طبقے کی حکمرانی میں ان کی بھی شمولیت ہوتی۔مغل سلطنت اور اس عہد کی دوسری ریاستوں میں زرعی ٹیکس سے اصل فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ تھے، جن کو حکمرانوں کے امیروں کا درجہ ملا ہوا تھا۔ان لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو زمینداروں میں سے بھرتی کیے گئے تھے۔مغل حکمراں تمام امراء کو، جن میں چھوٹے بڑے سبھی شامل تھے، اپنا تنخواہ دار نوکر تصور کرتے تھے اور ان کی تنخواہیں منصب کے مطابق مقرر ہوتی تھیں، جن کی ادائیگی کے لیے انھیں ایسے علاقے جاگیروں میں دیے جاتے تھے، جہاں سے ملنے والی زرعی ٹیکس کی آمدنی ان کی تنخواہ کے برابر ہوتی تھی۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا تھا کہ تنخواہ کا ایک حصہ شاہی خزانے سے نقد ادا کر دیا جاتا تھا۔منصب داروں کے درجے اور ان کی تعیناتی کی جگہوں میں تبدیلی کے مطابق جاگیریں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی رہتی تھیں۔عام طور پر کسی کو بھی دو تین برسوں سے زیادہ ایک جاگیر میں رہنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔

مغل دور حکومت میں اعلیٰ منصبوں کے لیے مجوزہ تنخواہیں غیر معمولی حد تک بڑھی ہوئی تھیں۔اس زمرے کے منصب داروں کا تصرف کل مہیا جاگیروں کا بہت بڑے حصے پر تھا۔1595ء میں 500 یا اس سے اوپر کے منصب پر فائز 122 منصب داروں کی جاگیریں کل زرعی ٹیکس آمدنی کے نصف سے بھی زیادہ حصے پر مشتمل تھیں۔اسی سال میں 25 سب سے اونچے منصب دار زرعی ٹیکس آمدنی کی 30 فیصد جاگیروں کے مالک تھے۔1646-47ء میں اسی زمرے کے منصب داروں کے پاس کل آمدنی کا 24 فیصد جاگیر میں تھا۔اسی لحاظ سے بڑے جاگیروں کی سرکاریں بھی بڑی ہوتی تھیں۔ان میں سے اکثر اپنے ماتحتوں کو ضمنی جاگیریں بھی دیتے تھے۔ظاہری طور پر جاگیرداروں کا صرف ایک کام تھا کہ وہ ان ٹیکسوں کو جمع کریں، جو حکومت کی طرف سے واجب قرار دیے گئے تھے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جاگیرداروں کی غیر قانونی لوٹ کھسوٹ پر کوئی کنٹرول نہیں تھا۔سرکاری مآخذ میں جاگیرداروں کے جابرانہ رویوں کی شکایتیں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔گرچہ جاگیروں کو تبدیل کرنے کا

قانون مطلق العنان مرکزیت کو قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا، لیکن کاشت کاروں کی حالت پر اس کا بدترین اثر پڑتا تھا۔ چوں کہ ایک جاگیردار کو اپنی جاگیر کی مستقبل کی خوش حالی کے لیے کوشش کرنے میں کوئی ذاتی فائدہ نظر نہیں آتا تھا بلکہ اس کا ذاتی فائدہ اسی میں تھا کہ جتنی زیادہ آمدنی ممکن ہو سکے وہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، چاہے ایسا طرز عمل اس کی جاگیر کے مستقبل کے لیے کتنا ہی تباہ کن کیوں نہ ہو۔

مغل امراء کی بھرتی بعض خاصے جانے پہچانے گروہوں میں سے ہوتی تھی۔ ان میں سے بہت سے تو وسط ایشیا اور ایران سے آنے والے لوگ تھے۔ ترک وطن کر کے آنے والوں کا یہ سلسلہ مستقل جاری تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایران سے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا جس کے نتیجے میں وسط ایشیائی امراء کی بہ نسبت ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ یہ تارکین وطن عام طور پر اپنے ملکوں میں بھی امراء یا دفتری حکام کی آسامیوں پر کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ امراء کے درجے میں افغان، ہندوستانی مسلمان اور راج پوت بھی تھے، پھر سترہویں صدی میں مراٹھوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ تارک وطن زمرے کے امراء اور ان کی اولاد امراء کی کل جماعت کے تقریباً نصف کے قریب تھے۔ مغل سلطنت میں بڑے امراء کے بیٹے اور دوسرے قریبی رشتے دار عموماً مخصوص عنایتوں کے مستحق قرار پاتے تھے۔ اس رعایت سے انھیں 'خانہ زاد' کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اگر امراء کے طبقے میں شامل مختلف گروہوں کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان میں سے بہت کم لوگوں کا مقامی آبادی کے کسی بھی حصے سے سیدھا تعلق تھا۔ مقامی حالات سے اس طرح کی دوری کی کیفیت کو جاگیروں کے تبادلوں نے اور نمایاں کر دیا۔ امراء عام طور پر اپنے گھربار اور دفاتر شہروں میں بناتے تھے اور دیہاتی علاقوں کے بجائے وہ اپنے شہری محلوں میں ہی قیام کرتے تھے۔

16.4.5 زمین دار

عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں کاشت کاروں اور ان کی مزروعہ زمینوں پر مختلف نوعیت کے موروثی حقوق کے دعوے دار کا ایک بڑا طبقہ موجود تھا۔ مختلف علاقوں میں اس طبقے کے مختلف نام تھے، لیکن مغل انتظامیہ ایسے تمام مقامی طور پر طاقت ور زرعی گروہوں کے لیے زمیندار کا لفظ استعمال کرتی تھی۔ زمین داروں میں ایک طرف نیم خود مختار مقامی حکمراں شامل تھے، وہیں دوسری طرف یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال ہوتا جو عملاً دیہات کے مقدموں سے بہت مختلف نہیں ہوتے تھے۔ ان متفرق حیثیتوں کے موروثی حقوق رکھنے والوں کے درمیان بعض باتیں مشترک تھیں، مثلاً ان سب کو زرعی ٹیکس میں سے بھی ایک ادائیگی کی جاتی تھی جو نقد بھی ہو سکتی تھی اور معافی کی زمین کی صورت میں بھی دی جا سکتی تھی۔ اس طرح یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ صحیح معنوں میں زمین کے مالک نہیں تھے۔ یہ بات یوں بھی صاف ہو جاتی ہے کہ زمین کی پیداوار میں ان کا حصہ 'لگان' کے مطابق نہیں تھا، بلکہ خود انھیں جو کچھ ملتا تھا وہ ایک طرح کا زرعی ٹیکس تھا، جو فاضل پیداوار کے چھوٹے سے حصے کے برابر ہوتا تھا۔ یہ حصہ شمالی ہندوستان میں ایک تہائی یا پانچواں حصہ تھا۔ بعض علاقوں میں یہ لوگ کاشت کاروں کو زمین سے بے دخل کر کے ان کے بجائے نئے کاشت کار آباد کرنے کا حق رکھنے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کسی علاقے میں ایک زمین دار کے حقوق قائم ہونے کی روایت اکثر یہ ہوتی تھی کہ مخصوص برادری یا ذات کے لوگوں نے طاقت کے دم پر وہاں اپنا دبدبہ قائم کر لیا تھا۔ اس طرح کسی علاقے میں زمینداروں کی بالادستی قائم رکھنے کے دو خاص ذرائع تھے۔ اول تو حاوی برادری کے لوگوں میں آپسی تعاون اور بھائی چارہ اور دوم ان میں سے بعض کی ملازمت میں مسلح افراد پر مشتمل جتھوں کا مہیا ہونا۔ لیکن مغل عہد کے آنے تک ہر جگہ زمینداری حقوق والے گروہ میں مختلف برادریوں کی نمائندگی بدلنے لگی تھی۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ان زمیندار برادریوں کی تفصیلی فہرست درج کی ہے جہاں پر علاقہ یا پرگنہ کے زمیندار برادریوں کے نام

درج کیے ہیں۔ سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں میں زمین داریاں ہندوؤں میں سے اونچی ذاتوں کے پاس تھیں، خاص طور پر راج پوت برادریوں کے پاس۔ لیکن بہت سے ایسے مقامات بھی تھے جہاں ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے زمین دار موجود تھے۔ اسی طرح 'آئین اکبری' میں زمین داروں کے زمرے میں مختلف برادریوں کا بھی ذکر آتا ہے۔

16.4.6 عورتیں

مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ مغل دور حکومت میں عورتوں کو سماجی اعتبار سے وہ اختیارات اور مراعات حاصل نہیں تھے جو مردوں کو حاصل تھے۔ اسی طرح سے ان پر سماجی جبر روا رکھا جاتا تھا، لیکن یہ سماجی جبر مختلف طبقات اور گروہوں میں الگ الگ انداز میں بروئے کار آتا تھا اور وقت، حالات و مقام کے ساتھ اس کی نوعیت بھی بدلتی رہتی تھی۔

عام طور پر ہندو معاشرے میں عورتوں کو بہت محدود اختیارات حاصل تھے۔ بچیوں کی پیدائش کو فال بد شمار کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ کبھی کبھی نوزائیدہ بچی کا قتل بھی ہوتا تھا۔ بسا اوقات ان کی شادیاں بچپن میں ہی کر دی جاتی تھیں اور ان کے ساتھ ازدواجی تعلقات بھی سن بلوغ سے پہلے ہی قائم کر لیے جاتے تھے۔ نچلی قوموں میں شادی کے موقع پر لڑکی کے والدین کو کسی نہ کسی انداز میں 'دلہن کی قیمت' کے طور پر کچھ نہ کچھ ادا کیا جاتا تھا۔ اس کے برخلاف اونچی ذاتوں میں دولہا کے والدین کو دلہن کی طرف سے جہیز ملتا تھا۔ کئی کاشت کار اور مویشی پالنے والی ذاتوں، مثلاً جاٹوں، یادوؤں اور دوسری نچلی برادریوں میں بیواؤں کی شادیاں ہوسکتی تھی۔ اکثر ان کے متوفی شوہروں کے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ اور کبھی کبھی غیر مردوں کے ساتھ بھی یہ دوسری شادیاں انجام پاتی تھیں۔ اس طبقے کی عورتوں میں پردے کا کوئی رواج نہ تھا، عورتیں عام طور پر پانی بھرنے، سوت کاتنے اور آٹا پیسنے کا کام کرتی تھیں۔ گرچہ ایسی مثالیں کم ہیں لیکن بعض اوقات عورتیں کاشت کاری میں بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔ مثلاً ہمالیہ کی پہاڑی اقوام میں عورتیں زمین جوتنے کا کام بھی کرتی تھیں۔ چند مخصوص ذاتوں کی عورتیں دودھ، گھی اور دوسری اشیاء کو فروخت کرنے کے لیے پھیری لگانے کا کام بھی کرتی تھیں۔ بنگال کے بارے میں یہاں تک خیال کیا جاتا ہے کہ وہاں کام کا اصل بوجھ عورتوں کے کاندھوں پر رہتا تھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ مغل عہد میں ہندوستان دنیا کے ان چند ملکوں میں تھا جہاں تعمیرات سے تعلق رکھنے والے مشکل کاموں کا بوجھ عورتوں کو اٹھانا پڑتا تھا۔ نچلے طبقات میں عورتوں کے وراثت میں حقوق کو قانونی طور پر تسلیم کیے جانے کے باوجود عام طور پر انھیں نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ بنگال میں کوئی متوفی کاشت کار اگر اپنے پیچھے ایک مرد وارث نہیں چھوڑتا تھا تو اس کی بیوی اور بیٹیوں کو مویشیوں کی طرح بحق سرکار یا بحق جاگیر دار یا اس علاقے کے زمیندار کے ذریعے پکڑ لیا جاتا تھا۔

ہندو معاشرے میں اونچی ذات کی عورتوں کو غالباً آرام کے کسی قدر زیادہ مواقع حاصل تھے، لیکن وہ بھی کئی قسم کی شدید مجبوریوں کا شکار تھیں، ان میں سے ایک مجبوری پردے کی سختی سے پابندی تھی۔ یہ واقعہ کہ اس زمانے کی اُہوم ریاست میں عورتیں، جن میں رانیاں بھی شامل تھیں اپنے چہروں یا سروں کو ڈھکے بغیر لوگوں کے سامنے نہیں آتی تھیں، مغل تحریروں میں ایک انوکھی بات کے طور پر درج کیا گیا ہے۔ اونچی ذاتوں میں بیواؤں کی دوبارہ شادی کی سخت ممانعت تھی، راج پوتوں اور دوسری اقوام میں 'ستی' کی بھیانک رسم پر عمل کیا جاتا تھا۔ مغل حکومت نے 'ستی' کے واقعات کو کم کرنے کے لیے یہ قانون بنایا کہ ہر انفرادی کیس میں یہ یقینی بنانا ضروری ہے کہ بیوہ اپنی مرضی سے 'ستی' ہو رہی ہے۔ گرچہ اس پالیسی کا کچھ اثر ضرور رہا لیکن تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں گیر کے عہد میں ایک ہفتہ کے دوران دو یا تین مرتبہ 'ستی' کے واقعات

رونما ہو جاتے تھے۔ پھر بھی اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اونچی ذات سے تعلق رکھنے والی تمام یا زیادہ تر بیوائیں 'ستی' ہو جانے پر مجبور تھیں۔ ایسے شواہد موجود ہیں کہ بعض بیوائیں نہ صرف منقولہ اثاثوں کی مالک تھیں بلکہ ان کے پاس زمینداری حقوق بھی تھے جو بظاہر وراثت میں ہی مل سکتے تھے۔ کیرالا کی بعض اقوام میں وراثت ماں کی طرف سے چلتی تھی اور اسی قسم کی صورت حال میگھالیہ کے گھارو اور گھاسی قبائل میں بھی پائی جاتی تھی۔

مسلم معاشرے میں قانون کے مطابق ایک مرد کو چار بیویاں اور کئی باندیاں رکھنے کی اجازت تھی، لیکن یاد رہے کہ یہ ایک ایسی رعایت تھی جس کا صرف بہت مال دار اور با اقتدار لوگ ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مردوں کو اس قسم کی رعایت دیے جانے کو بعض اوقات ناپسندیدگی سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا اظہار شادی کے ان شرائط ناموں سے ہوتا ہے جو بعض اوقات فارسی دستاویزات کے مجموعوں میں ملتے ہیں۔ اسی قسم کی ایک دستاویز وہ ہے جو سترہویں صدی کے نصف اول میں سورت میں تیار کی گئی تھی۔ اس قسم کے دستاویزات میں عورتیں اپنے شوہروں سے یہ یقین دہانی حاصل کرتی تھیں کہ وہ دوسری شادی نہیں کریں گے اور نہ ہی کوئی باندی رکھیں گے۔ ان شرائط ناموں کے ذریعے شوہروں کو یہ بھی وعدہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنی بیویوں کو جسمانی وذہنی تکلیف نہیں پہنچائیں گے اور انھیں گزر بسر کے لیے مناسب وسائل بھی فراہم کرتے رہے گے۔ مسلم معاشرے میں سن بلوغ سے پہلے شادی گر چہ غیر قانونی نہیں تھی لیکن مسلمانوں میں اس کا چلن کم تھا۔ اس کے برخلاف بیوہ کی دوبارہ شادی نہ صرف قانونی طور پر جائز تھی بلکہ بسا اوقات ایسی شادیاں ہوتی بھی تھیں۔ اونچے گھرانوں کی مسلم عورتیں مکمل پردے میں رہتی تھیں۔ شادی کے وقت طے شدہ شرائط کے مطابق عورتیں اپنے شوہروں سے مہر کے روپیوں کے لیے دعویٰ کر سکتی تھیں اور انھیں وراثت میں جائیداد بھی مل سکتی تھی۔ یہ قابل ذکر بات ہے کہ اکبر نے قانون میں معدلت کے فقدان پر اپنی ناخوشی کا اظہار کیا تھا اور اورنگ زیب نے مدد معاش کی زمینوں میں وراثت کے اصول وضع کرتے وقت شریعت سے صرف نظر کرتے ہوئے بیواؤں کو اپنے متوفی شوہروں کی پوری مدد معاش کا زندگی بھر کے لیے وارث قرار دیا تھا۔

مغل عہد کے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتیں عام طور پر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ خاص طور پر ہمایوں کی بہن گل بدن بیگم کا معاملہ غیر معمولی تھا، جس کے بارے میں تاریخی شہادتیں ہیں کہ وہ تعلیم یافتہ تھی مگر اس کا شوہر غیر تعلیم یافتہ تھا۔ لیکن اس کے برخلاف متوسط طبقات سے تعلق رکھنے والی مسلم عورتیں بھی زیادہ تر غیر پڑھی لکھی ہوتی تھیں۔ ان تمام تاریخی شہادتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغل دور حکومت میں عورتوں کی سماجی حیثیت اتنی اچھی نہیں تھی اور وہ مختلف قسم کی سماجی برائیوں کا شکار تھیں۔

16.4.7 ذات پات کا نظام

مغل دور کے ہندوستان کے سماجی ڈھانچے کی تشریح وتوضیح بڑی حد تک ذات پات کی روشنی میں کی جا سکتی ہے کیوں کہ 1664ء کے آس پاس جب نینسی نے یہ دکھانا چاہا کہ سماجی اعتبار سے کس زمرے کے کسان مارواڑ کے علاقے میں رہتے ہیں تو اس نے ان کی ذاتوں کے نام لکھ دیے۔ اسی طرح سے جب 1595ء کے آس پاس ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں پرگنہ کے زمینداروں کا ذکر کیا تو اس نے ان کی ذاتوں کے نام لکھ دیے۔ ایک جگہ ایک برہمن فخریہ انداز میں لکھتا ہے کہ وہ برہمن ہے اور جب وہ کسی شخص کی مہربانی یا بھلائی کا ذکر کرتا ہے تو وہ اس کی پوری ذات کی تعریف کرنا ضروری سمجھتا ہے، مثلاً اس کا جملہ ہے: ''کائستھ بہر حال فراخ دل اور وفا شعار ہوتے ہیں۔'' اسی طرح سے اس

دور کی تحریروں میں ہر جگہ مختلف ذات برادریوں کے درمیان شادی بیاہ کے رشتوں پر پابندی اور ان کے اپنے آبائی پیشوں کو ترک نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ مغل دور کا سماج کس طرح سے ذات پات کے نظام میں جکڑا ہوا تھا؟ اس کا اندازہ مہاراشٹر کے اٹھارہویں صدی کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک مورخ کا بیان ہے کہ جب کچھ درزیوں نے رنگ ریزی کا پیشہ اختیار کر لیا تو کچھ عرصے بعد ان کو اپنی ذات سے علیحدہ ذات تسلیم کر لیا گیا اور اس کے بعد ان کے اور پرانے درزی ذات کے بیچ شادی بیاہ کا رشتہ ممنوع قرار دے گیا گیا۔

سماجی ماہرین نے یہ بھی درج کیا ہے کہ کس طرح مختلف ذات برادریاں نئے پیشے اختیار کرنے کے بعد ذات پات کے نظام میں اپنا مقام بدل لیتی ہیں۔ انھوں نے اس عمل کو 'سنسکرٹائزیشن' کا نام دیا ہے یعنی اونچی ذاتوں کی رسوم اور طریقوں کو اختیار کرنا مثلاً نباتات خوری، میت کو جلانے کی رسم، عورتوں کو گھروں کے اندر رکھنے کی رسم اور بیواؤں کی دوسری شادی پر پابندی وغیرہ۔ تاجروں کی مشہور برادری بنیوں کے بارے میں یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں بہت سی ایسی چھوٹی ذاتیں شامل تھیں جو صرف آپس میں ہی شادی بیاہ کے رشتے رکھتی تھیں۔

غلامی کی طرح ذات پات کا نظام بھی ایک ایسا ادارہ تھا جو انسان کو اس کے مقام سے نیچے لے جاتا تھا۔ اس کے ذریعے انسان ایک دوسرے سے دور ہو جاتے تھے۔ یہ دوری نہ صرف اعلیٰ اور ادنیٰ کے درمیان ہوتی تھی بلکہ برابر کی حیثیت کے لوگ بھی مختلف طبقات میں بٹ جاتے تھے۔ نچلے طبقات کے لوگوں کے اوپر سخت قسم کے سماجی ظلم روا رکھے جاتے تھے۔ یہ ظلم خاص طور پر ان ذاتوں کے ساتھ زیادہ ہوتا تھا جن کا شمار 'کام گاروں' یا 'اچھوتوں' میں ہوتا تھا۔ باقی دوسرے نچلے طبقات کو بھی کئی قسم کی پریشانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں، جن میں زبردستی بے گار لینا عام بات تھی۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کی وحدانیت سے سرشار عوامی تحریکوں میں ذات پات کے دو بنیادی تصور 'نجس اور پاک کا فرق' اور 'انسانوں کے درمیان اونچ اور نیچ' کے خلاف احتجاج ملتا ہے۔ کبیر نے لکھا تھا:

پیدائش اور موت دونوں میں نجاست ہے

اے پنڈت مجھے بتاؤ 'پوتر' کون ہے؟

اسی طرح سکھ گرو امر داس نے کہا تھا کہ ''کوئی اپنی ذات پر فخر نہ کرے، یہ دنیا مٹی سے بنی ہے، بس کمہار نے برتن مختلف نمونوں کے بنائے ہیں۔'' گرچہ اس قسم کے اخلاقی احتجاج کا اصل زندگی میں کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، لیکن شاید ایسے ہی افکار سے ناراض ہو کر رام کے پجاری تلسی داس نے 'رام چرتر مانس' میں اس بات کی مذمت کی ہے کہ کل یگ میں شودروں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ان تمام کے باوجود بھی ذات پات کا نظام سماجی تبدیلیوں اور حرکت پذیری کے راستے میں کبھی بھی بہت بڑی رکاوٹ نہیں تھا۔ کیوں کہ تاریخی مآخذ یہ بتاتے ہیں کہ مغل عہد سے پہلے برہمن، کائستھ اور کھتری اپنے اپنے پجاری یا کلرکی پیشوں کی رعایت سے سنسکرت کا علم رکھتے تھے۔ مغلوں کا دور آنے تک ان لوگوں نے فارسی سیکھنا شروع کر دی اور انتظامی امور میں اہمیت حاصل کر کے اس میدان میں اہم کردار ادا کرتے تھے۔

16.5 مذہبی حالت

صدیوں سے ہندوستانی سماج میں مذہبی تکثیریت کی موجودگی معاشرے کی ایک نمایاں خصوصیت شمار کی جاتی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے مغل عہد کو اس کی عمدہ مثال تصور کیا جاتا ہے، جہاں پر مذہبی تکثیریت کے نتیجے میں ہمیں متحدہ تہذیب و ثقافت کا ایک بے مثال ظہور نظر آتا

ہے۔ سولہویں صدی عیسوی میں مغل حکومت کے قیام کے ساتھ ہی ہندوستانی سرزمین پر مختلف مذاہب، ذات پات، رنگ ونسل اور زبانوں کے بولنے والے لوگ ایک قومیت کے رنگ میں دکھائی دیتے ہیں۔ گرچہ اس کی بنیاد ہمیں ہندوستانی تاریخ کے عہد سلطنت میں ہی پڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے مگر جس طرح مغل عہد میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو ایک قومیت کے دھارے میں سمونے کی کوشش نظر آتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مغل دورحکومت میں اس کے مذہبی افق پر ہمیں ہندو، مسلمان، بدھ، جین، سکھ اور عیسائی غرض کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ ملتے ہیں۔ ساتھ ہی اس عہد میں مختلف مذہبی تحریکوں کا ظہور بھی نظر آتا ہے۔ مذکورہ تمام مذاہب کے لوگ اپنے مختلف عقائد ونظریات کے ساتھ مغل دور حکومت میں زندگی بسر کر رہے تھے، ساتھ ہی ایک دوسرے کو متاثر اور ان کے اثرات قبول بھی کر رہے تھے، جس کے نتیجے میں ہمیں گنگا جمنی تہذیب کا ظہور نظر آتا ہے۔

16.5.1 ہندو مذہب

مغل دورحکومت میں عوام الناس کی اکثریت ہندو مذہب کی پیروکار تھی اور اس عہد کی مذہبی صورت حال کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو یہاں پر اسلام اور ہندو مذہب کی ایک دوسرے کے ساتھ موجودگی کو شمار کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مذہب اور اسلام مذہب کی کسی ایک ہی تعریف پر پورے نہیں اترتے۔ مغل عہد حکومت 1653ء میں تحریر کی گئی کتاب 'دبستان مذاہب' کے مصنف کا بیان ہے کہ ''ہندوؤں میں بہت سے مذاہب اور بے شمار اعتقادات اور رسوم ہیں۔'' دوسرے الفاظ میں اس عہد میں ہر اس ہندوستانی کو جو مسلمان نہیں تھا، ہندو کہا جاتا تھا۔ اس وجہ سے ہندو مذہب کو اسی معنی میں اعتقادات کا ایک نظام تصور نہیں کیا جاسکتا، جس معنی میں ہم عام طور پر اسلام یا دوسرے سامی مذاہب کے سلسلے میں سوچ سکتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ مختلف ہندو فرقے ایک دوسرے کے ساتھ تفاعل کے ذریعے سامنے آئے تھے اور یہ تفاعل بڑی حد تک ایک مخصوص علمی زبان یعنی سنسکرت کے ذریعے ہی ممکن ہوسکا تھا۔ اس کے نتیجے میں مختلف ہندو فرقے نہ صرف ایک ہی قسم کی مذہبی اصطلاحات کا استعمال کرتے تھے بلکہ اکثر ان کے دیوتاؤں میں بھی مماثلت تھی۔ 'دبستان مذاہب' کی تصنیف سے تقریباً ساٹھ سال قبل 1595ء میں ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد کے بارے میں ایک تفصیلی اور جامع بیان درج کیا تھا۔

مغل عہد میں لکھی گئی ہندو مذہب کی مذہبی تحریروں میں راسخ العقیدہ ہندو مذہب کے ان تمام بنیادی عناصر پر زور دیا جاتا رہا، جن کا ذکر 'آئین اکبری' اور 'دبستان مذاہب' میں کیا گیا ہے۔ مثلاً نارائن بھٹ کی 1600ء کے آس پاس لکھی گئی کتاب 'مان میودیہ' میں 'می ماسا' کے فلسفے پر بحث ملتی ہے۔ اس فلسفے کے مطابق تناسخ کا عمل خود بخود جاری رہتا ہے۔ یہ ایک طرح سے زندگی کا آزاد عمل ہے، جس میں کسی ایک وقت میں روح کا مقام پچھلے مقاموں میں اس کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ 'دبستان مذاہب' کے مصنف کے مطابق ہندوؤں میں یہ ایک عام اعتقاد تھا کہ دنیا کو بنانے والا ایک خدائے واحد ہے لیکن مخلوق کی زندگیاں ان کے پچھلے اعمال ہی سے متعین ہوتی ہیں۔ گویا اب مذہب کی کنجی وہ اعمال تھے جو اسمرتیوں کے مختلف مدارس نے طے کیے ہیں۔ اس میدان کے روایتی نظریوں پر اسمرتیوں کی تازہ ترین تحریروں میں برابر زور دیا جاتا رہا۔ 1567ء کے قریب بنگال میں نوادیپ کے راگھونندن نے اپنی کتاب 'اسمرتی تتوا' تصنیف کی۔ یہ کتاب رسوم اور وراثت سے متعلق مسائل پر بہت معتبر مانی جاتی ہے۔ 1612ء میں کملا کار بھٹ کے ذریعے لکھی گئی کتاب 'نر نیا سندھو' کو مہاراشٹر میں مذہبی اور قانونی امور سے متعلق معتبر تصور کیا جاتا تھا۔ اس کتاب میں راگھونندن کا ایک استاد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں گیر کے عہد میں مترامشرا نے

ہندو قانون سے متعلق ایک اہم کتاب تصنیف کی۔ ان تحریروں میں پیش کردہ نظریوں سے کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا ہے کہ گزرے زمانے کی اسمرتیوں میں ذات پات کے نظام کے بارے میں جو قواعد وضع کیے گئے تھے، ان سے کسی بھی قسم کا انحراف پیدا ہو رہا تھا۔ عام طور پر ان سب تحریروں میں ان بندشوں کو دہرایا بلکہ بڑھا کر بیان کیا گیا ہے جو پرانی اسمرتیوں میں نچلے طبقات اور عورتوں پر عائد کی گئی تھیں۔ راگھونندن نے یہاں تک کہہ دیا کہ برہمن اکیلی ایسی ذات ہے، جس کو دوبارہ پیدا ہونے والی یعنی اونچی ذات شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق چھتری اور ویش طبقے کے لوگ اس کے زمانے تک شودروں کے درجے پر پہنچ چکے تھے۔

ویدانت کے میدان میں شنکر آچاریہ کی علمی روایت خاصی بااثر تھی۔ اس دور میں ویدانت سے متعلق کئی تحریریں سامنے آئیں۔ 'دبستانِ مذاہب' کے مختلف بیانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سترہویں صدی کے وسط تک شنکر آچاریہ کی وحدانیت کا تصور کئی فرقوں اور مدارس خیال کے نظریوں کو متاثر کر چکا تھا۔ سدانند کی کتاب 'ویدانت سارا' جو 1500ء کے آس پاس لکھی گئی تھی 'سانکھیا' کے اصولوں سے متاثر نظر آتی ہے۔ دوسری طرف 'سانکھیا سارہ' کا مصنف وجنان بھکشو 1650ء کے قریب کی اپنی تحریر میں ویدانت کی سچائی کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی طرح ویدانت اور شیوا کے پیروؤں کے اعتقادات کے درمیان مفاہمت کی کوشش ویلور کے مشہور مصنف آپیا دیکشتا کی ہے۔ کسی قدر بعد کے زمانے میں ایسا ہی رجحان شیوا کے پیرو شیوناز کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ 'دبستان مذاہب' میں وسیع پیانے پر جاری تانترک اعتقادات اور اعمال کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں تانترک ادب کو خاصہ فروغ ملا۔ 1589ء میں بنارس کے مہی دھار نے 'منتر مہوداد ھی' تصنیف کی۔ 1571ء کے بعد بنگال میں پورن آنند نے فلسفہ اور جادوئی رسموں کے بارے میں اپنی کتاب لکھی۔ سترہویں صدی میں نو دیپ کے کرشن آنند آگموا آگیش نے 'تانتر سار' تصنیف کی، جس کا شمار معتبر تحریروں میں ہوتا ہے۔

16.5.1.1 بھگتی سے متاثر فرقے

ہندو مذہب کے اعتبار سے سولہویں اور سترہویں صدی بجا طور پر ویشنو مذہب کی صدیاں قرار دی جائیں گی۔ شمالی ہندوستان میں شری رام کی پرستش سے عبارت اس مذہب کے سب سے بڑے مبلغ تلسی داس تھے، جنھوں نے اپنی کتاب 'رام چرتر مانس' میں رامائن کی کہانی کو بڑے مقبول انداز میں پیش کیا۔ تلسی داس بھگتی کے شوق اور ولولے سے پر اپنی شاعری میں ایک ایسے رام کی تصویر پیش کرتے ہیں کہ جو منصف تھا وہ ایک اوتار کے درجے سے اٹھ کر ذات باری تعالیٰ کے مقام پر پہنچ گیا تھا اور جسے تضا دقدر پر پورا اختیار تھا۔ بنگال کے رہنے والے برہمن پروہت چیتنیہ نے کرشن اور رادھا کی پرستش کی ایسی رسم شروع کی، جس میں ایک بھگت اپنے خداوند کے نام کے تکرار کے ذریعے اپنے آپ کو ایسی ذہنی اور جذباتی حالت میں پہنچا دیتا تھا جہاں وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اس نے بندرابن میں کرشن کی رفیقہ کی جگہ حاصل کر لی ہے اور وہ عشق کے ان تمام مدارج کا تجربہ کرتا ہے جن سے کرشن گزرے تھے۔ ان ذہنی تجربات کے ذریعے ایک بھگت ذات باری تعالیٰ کے ساتھ وصال کی کیفیت کا تجربہ کرتا تھا۔ گرچہ چیتنیہ کے زیادہ تر پیروکار بنگال میں ہی تھے لیکن انھوں نے اپنے خلفاء کو جنھیں گوسوامی کہا جاتا تھا، بندرابن میں متعین کیا تھا۔ ان گوسوامیوں نے اپنی سنسکرت تحریروں کے ذریعے اس مخصوص مذہبی رجحان کو فلسفیانہ اساس دی اور اس کے رسوم طے کیے۔ اپنے پیروکاروں کے لیے چیتنیہ خود بھی کرشن اور رادھا کے اوتار کا درجہ رکھتے تھے۔ گرچہ عام زندگی میں چیتنیہ کے ایک پیرو گھربار کی ذمے داری اٹھانے والا شخص ہوتا تھا جو ذات پات کے نظام کے تمام شرائط کو پورا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس مخصوص مذہبی رجحان میں نچلی ذات کے لوگوں کو پرستش کے

حق سے محروم نہیں رکھا گیا تھا۔اسی رجحان سے نکلنے والے اٹھارہویں صدی کے بجیہ فرقے میں سرتیوں کی تعلیمات کو قطعی طور پر برطرف کر کے کئی قسم کے شاکتک اور تانترک معمولات جاری کیے۔آسام میں ایک دوسرا ویشنو فرقہ شروع ہوا جو چیتنیہ کے فرقے سے ملتا جلتا تھا۔اس کی ابتدا چیتنیہ کے ایک ہم عصر شنکرا دیو نے کی تھی جن کی وفات 1568ء میں ہوئی۔شنکرا دیو نے بتوں کی پرستش سے گریز کرتے ہوئے ایک خداوند مطلق سے رجوع کیا۔ان کا خیال تھا کہ ذات باری تعالیٰ کی ہر عبادت کرشن کی محبت سے سرشار ہوگی۔ولبھ چاریہ (وفات 1531ء) اور ان کے بیٹے وٹھل ناتھ (وفات 1576ء) نے پشٹی مارگ یعنی خدا کے فضل سے عبارت ایک مذہب کی تبلیغ کی۔سورداس اسی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ 1545ء میں انھوں نے 'سورسروالی' نامی کتاب مقامی بولی برج میں تصنیف کی۔اس تحریر میں کرشن اور رادھا کو اس طرح سے پیش کیا گیا ہے کہ دونوں ذات باری تعالیٰ کے مظہر نظر آتے ہیں۔یہ فرقہ گجرات اور راجستھان میں مقبول ہوا۔اس کے تحت ولبھ چاریہ کی اولاد کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی،انھیں اب کرشن کا اوتار سمجھا جانے لگا اور انھیں 'مہاراج' کے لقب سے مخاطب کیا جانے لگا۔ان کے مریدوں میں تاجروں کے امیر طبقے کے لوگ زیادہ تھے۔رادھاولبھی فرقے کی بنیاد ہیتا ہری ونش (وفات 1553ء) نے ڈالی تھی۔یہ فرقہ ذات باری تعالیٰ کی تثنیت میں رادھا کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

مہاراشٹر کے علاقے میں ویشنو تحریک کے وحدانیت کی طرف مائل ہونے کے ساتھ اس میں کئی قدامت پسند عناصر بھی موجود تھے۔ ایکناتھ (وفات 1599ء) نے بھکتی کے ایسے اصول وضع کیے،جن کی رو سے ہر ذات کے مردوں اور عورتوں کو ایک جگہ جمع ہو کر خداوند کی حمد وثنا کرنے اور کیرتن میں شریک ہو کر حال و وجد کا مزہ لینے کی اجازت دی گئی ہے۔وہ جذبہ سے عاری رسوم کے قائل نہیں تھے۔تکارام (وفات 1649ء) جن کا پیشہ کاشت کاری تھا اور شودر ذات سے تعلق رکھتے تھے،ممکن ہے کہ چیتنیہ فرقے سے متاثر رہے ہوں،لیکن اپنی عبادت میں وہ 'ویٹھوبہ' دیوتا سے رجوع کرتے تھے۔تکارام کے خداوند وٹھل اور چیتنیہ کے کرشن کی بہ نسبت وحدانیت پرست کبیر کے رام سے زیادہ مشابہ تھے۔وہ اپنی گیتوں میں یہ کہتے تھے کہ ہر پجاری چاہے اس کا سماجی درجہ کتنا ہی نیچا کیوں نہ ہو،اپنے خداوند تک پہنچ سکتا ہے۔اس سلسلے میں اللہ کا نام استعمال کرنے میں بھی انھیں کوئی مضائقہ نہ تھا۔اس سلسلے میں رام داس (وفات 1681ء) کا رویہ کسی قدر مختلف ہے۔وہ ایک خداوند کی شکل میں رام کی پرستش کے ساتھ 'دھرم' کی بھی تائید کرتے تھے۔'دھرم' سے ان کا مطلب 'مہاراشٹر دھرم' تھا،جس کی رو سے برہمنوں اور دیوی دیوتاؤں کی حرمت برقرار رکھنا ضروری تھا۔انھوں نے مٹھ یعنی سنیاسیوں کے مراکز قائم کیے،جنھیں مراٹھا حکمراں شیواجی (وفات 1680ء) کی سرپرستی حاصل تھی۔

16.5.1.2 کبیر اور تحریک وحدانیت

بنارس کے بنکر کبیر (وفات 1518ء) کی تعلیمات نے ہندوستان کی مذہبی فکر میں زبردست تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ان کی شاعری میں ایک طرف تو ویشنو،ناگ پنتھی اور بعض اوقات تانترک اعتقادات کے پردے میں بے پناہ وحدانیت دیکھنے کو ملتی ہے۔دوسری طرف اس میں اسلامی وحدانیت کے منطق کو پوری طرح قبول کرنے کے ساتھ اسلامی دینیات کو مسترد کیے جانے کا رویہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اس سلسلے میں یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ کبیر نے اپنے خیالات لازمی طور پر ایسی زبان میں پیش کیے ہیں جن کو اسلامی ثقافت کے دائرے سے باہر کے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔کبیر نے اپنے خیالات کو کسی بھی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہو،ان کی بے محابہ فکر کی ندرت نے بلا شبہ اس عہد کے لوگوں کو بہت بڑے

پیا نے پر متاثر کیا تھا۔

کبیر نے ایک ایسی وحدانیت کی تبلیغ کی، جس میں بت پرستی یا کسی بھی قسم کی مذہبی رسوم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ان کے مطابق خدا کی غلامی نہ کہ اس سے عشق نجات کی سچی راہ ہے، گوکہ اس سلسلے میں عشق کا بھی ایک مقام ہے لیکن وہ کسی قدر بعد میں آتا ہے۔یہ بات اس دعوے کو کمزور کرتی ہے کہ کبیر نے اپنے خیالات ویشنو بھکتی اور اسلامی تصوف سے مستعار لیے ہیں۔کبیر کے مطابق ایک انسان کو اس کے خدا پر ایمان اور اپنے اعمال کی بنا پر ہی پرکھا جاسکتا ہے۔کبیر نے پاک اور نجس کے رسمی تصورات، اسمرتی کے قانون اور ذات پات کے نظام کو بڑی قطعیت کے ساتھ برطرف کیا ہے۔سولہویں صدی کے اواخر میں لکھی گئی ایک تحریر میں ان کی تعلیمات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔وہ ذات پات کے بیچ تفریق کو ماننے سے انکار کرتے تھے۔وہ برہمنوں کے سماجی طبقاتی نظام کے بھی منکر تھے۔اسی طرح سے انھوں نے اپنے دوہوں میں مختلف مذاہب کے آپسی جھگڑوں کا ذکر حقارت آمیز انداز میں کیا ہے۔

کبیر کے سامنے عام انسان تھے۔ان کی تمثیلوں اور استعاروں کو ایسے ہی لوگوں کی زندگیوں اور ان کی زحمتوں سے مستعار لیا گیا تھا اور ان کی زبان وہی تھی جو یہ لوگ بولتے تھے۔یہ حقیقت ہے کہ وہ عورتوں کے خلاف بعض ان تعصبات سے متاثر تھے، جو ان کے اپنے سماجی ماحول، خصوصاً غریب مردوں کی دنیا میں پائے جاتے تھے۔اس کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ کبیر نے اپنے بنانے والے کی دنیا میں غریبوں اور دبے کچلے لوگوں کے لیے ایک نئی قسم کی منزلت کا سراغ لگالیا تھا۔اسی لیے ان کے بعد بہت سے ایسے لوگ بھگت اور گرو کی شکل میں سامنے آئے جو ان کی ہی طرح غریب تھے، پر انسانوں کی اس بستی میں خدا کے متلاشی تھے۔سکھوں کے پانچویں گرو ارجن دیو نے 1604ء میں اس ڈرامائی کیفیت کو جس طرح محسوس کیا، اس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔انھوں نے ایک جاٹ کسان دھنّا کے منہ سے اس کیفیت کا اظہار کروایا ہے۔اسی طرح سولہویں صدی کے بھگت روی داس جو جانوروں کی کھالوں کو صاف کرنے کا کام کرتے تھے اور سائیں جو حجام تھے، کبیر کو اپنا پیش رو قرار دیتے تھے۔کبیر کے بارے میں اسی طرح کا خیال دادو دُھنہ کا تھا، جس کے مریدوں کی خاصی تعداد راجستھان میں پائی جاتی تھی۔کچھ عرصے کے بعد تقریباً 1657ء میں ہریانہ میں ست نامی فرقہ نمودار ہوا، جو اپنے آپ کو کبیر کا پیرو قرار دیتے تھے۔اس گروہ میں کسان اور چھوٹے سرمایہ دار تاجر شامل تھے۔ان تمام بھگتوں یا گروؤں کے مرید اپنے گروہوں کو'پنتھ' کا نام دیتے تھے۔وقت گزرنے کے ساتھ جہاں ایک طرف یہ لوگ مذہبی ارکان کی رو میں لکھے گئے اپنے گروؤں کے اشعار اور افکار محفوظ رکھے ہوئے تھے، وہیں دوسری طرف انھوں نے اپنے لیے نئے ارکان وضع کر لیے اور اپنے ابتدائی گروؤں کو اوتار کا درجہ دینے لگے۔اس طرح انھوں نے اپنے وحدانیت پرست فرقوں کو ذات کی شکل دے دی۔یہاں تک کہ کبیر کے لیے جو ایک بنکر کی اولاد تھے، برہمنی ولدیت تلاش کی جانے لگی۔غرض بھگتوں کے اصل پیغام کو اس طرح بدلنے کی کوشش سے یہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں مذہبی ارکان اور ذات پات کے نظام کی جڑیں کتنی مضبوط تھیں۔

16.5.2 جین مذہب

مغل عہد حکومت میں جین مذہب کے خاص اثر کا علاقہ گجرات تھا، پھر بھی اس مذہب کے لوگ دوسری جگہوں پر بھی مل جاتے تھے۔ جین مذہب کی تحریریں گجراتی، سنسکرت، پراکرت، برج، کناڈا اور دوسری زبانوں میں ملتی ہیں۔ان میں سے زیادہ تر کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ یا تو مقدس ہستیوں کے حالات پر مبنی تحریریں ہیں یا پھر ہر کتاب یکساں باتیں دہراتی ہے۔مغل عہد حکومت میں جدلیات کے بارے میں

جینیوں کا تصور سب سے پہلے یشو وجیاجی نے 1670ء میں لکھی اپنی کتاب 'جین ترک بھاشا' میں پیش کیا۔ مغل عہد میں یشو وجیاجی نے کئی اور کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ و جے نگر سلطنت میں جینیوں کے دونوں فرقے شویتامبر اور دیگامبر پھل پھول رہے تھے۔ جین پروہتوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اکبر کے دربار میں ان کے بڑے اثر و رسوخ تھے۔ اس عہد میں جین فرقے کے عام لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں بنیہ اور بوہرہ ذاتوں کے تاجروں تک محدود ہوتے گئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اناج فروخت کرتے تھے اور کچھ نوکری پیشہ بھی تھے۔

16.5.3 سکھ مذہب

سولھویں صدی عیسوی میں سکھ مذہب دنیا کے منظرنامے پر ظاہر ہوا اور اب اس کا شمار دنیا کے چند معروف مذاہب میں ہوتا ہے۔ اس مذہب کی ابتدا گرو نانک کے مریدوں پر مشتمل ایک فرقے کی طرح ہوئی تھی۔ گرو نانک پنجاب کے ایک کھتری تھے۔ اس فرقے کے وجود میں آنے کی تاریخ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس زمانے کے دوسرے وحدانیت پرست عوامی فرقوں کی تھی۔ سکھوں کی مقدس کتاب 'گرو گرنتھ صاحب' میں گرو نانک اور بعد کے دوسرے گروؤں کا کلام شامل ہے، اسے گرو ارجن دیو نے 1604ء میں مرتب کیا تھا۔ اس کتاب میں سکھ گروؤں کے علاوہ مسلمان صوفی شیخ فرید اور نام دیو، کبیر، رام دیو اور بعض دوسرے بھکتوں کے کلام اسی طرح شامل ہیں، جس طرح ان کو دادو پنتھیوں کی کتاب 'پنچ وانی' اور رجب داس کی 'سربنگی' میں جگہ ملی ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ کم سے کم سترہویں صدی کی ابتدا تک گرو نانک کے مریدوں میں یہ خیال پایا جاتا تھا کہ وہ وحدانیت سے عبارت رجحان کا ایک حصہ ہیں۔ گرچہ چند ایسی باتیں ضرور تھیں، جو نہ صرف طرز بیان کی رعایت سے بلکہ بعض اہم مسائل پر بھی اس عمومی رجحان میں شامل عناصر کو ایک دوسرے سے جدا کرتی تھیں۔

گرو نانک کی تعلیمات اور ان کے نظریات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان رکھتے تھے۔ ان کے نظریے کے مطابق خدا اور اس کے ماننے والے کے درمیان ایک بہت ذاتی قسم کا رشتہ ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے رب کی خدمت اور اس سے محبت کے ذریعے اس کے لطف و کرم سے نوازا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ تصور بھی ہے کہ خدا کی کوئی شکل نہیں ہے مگر وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اس کو کسی بھی مادّی صورت میں پیش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسی لیے ان کی تعلیمات بت پرستی اور اس سے متعلق رسوم کی سختی کے ساتھ ممانعت کی گئی ہے۔ نانک نے اخلاقیات پر بھی بہت زور دیا ہے، خاص طور پر دوسرے انسان کے ساتھ مہربانی کے سلوک کو اہمیت دی گئی ہے۔ انھوں نے پیدائشی فضیلت کے غرور، ذات پات کے درمیان اونچ نیچ کے فرق اور اس کے پیچھے کارفرما پاک اور نجس کے تصورات کی سخت مذمت کی ہے۔ ان کی تعلیمات کے مطابق نجات 'نروان' یا 'سچ کھنڈ' میں پہنچ کر ہی ملتی ہے۔ جہاں بالآخر انسان اپنے رب کو پوری طرح محسوس کر پاتا ہے۔

یہ واضح نہیں ہے کہ گرو نانک نے اپنے اس فرقہ یا پنتھ کو کس حد تک ایک تنظیم کی شکل دی تھی اور یہ بھی پوری طرح صاف نہیں ہے کہ ان کے ارشادات یعنی 'جپ جی' میں لفظ 'گرو' کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، اس کا مطلب 'خدا' ہے یا صرف ایک 'مرشد' جو روحانیت یا خدا کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن جلد ہی اس فرقے میں دو طرح کے حالات پیدا ہو گئے۔ اول گروؤں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو نانک کے جانشین کہلائے۔ ان کا مرتبہ بلند ہو کر سچ گرو کے اوتار کے مقام تک پہنچ گیا تھا۔ ہر مرید سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ 'گرو' کی مکمل اطاعت کرے۔ اسی رعایت سے ان کے مرید کو 'سکھ گرو' کہا جاتا تھا۔ نئی حالت کا دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس فرقے کا اثر جاٹ کسانوں میں تیزی سے پھیلا۔ گرچہ سکھ مذہب کے سبھی گرو کھتری ذات سے تعلق رکھتے تھے لیکن سترہویں صدی میں اُن کے 'مسند' یعنی اہم نائب زیادہ تر جاٹ تھے۔ نئے حالات نے

سکھ فرقے کے لیے ایک نئی صورت حال پیدا کردی یعنی ایک ہتھیار بند طاقت ور گروہ کی حیثیت سے ابھرنے کے لیے میدان تیار ہوگیا۔ 1606ء میں گرو ارجن دیو کی شہادت کے بعد مغل حکام کے خلاف جنگ کو زیادہ عرصے تک ٹالا نہیں جاسکتا تھا۔ سکھ گروؤں کی فوجی طاقت آخری گرو، گرو گوبند سنگھ (1708ء-1666ء) کے عہد میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ 1699ء میں انھوں نے اپنے مریدوں کو ایک نئی طرح کی جنگجو تنظیم خالصہ کی شکل دے دی۔ انھوں نے اس کے لیے ان سے ایک طرح کی پتسمہ کی رسم ادا کروائی، چاہے وہ انسانی سماج کے کسی بھی ذات یا طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اب یہ لازمی قرار دیا گیا کہ ہر سکھ اپنے ساتھ ہمیشہ چند چیزیں رکھے گا، جن میں کرپان شامل تھی، جو اس عہد میں ایک سپاہی پیشہ فرد کی پہچان بن گئی تھی۔

16.5.4 اسلام

مغل عہد حکومت میں اسلام ہندوستان کا دوسرا بڑا مذہب تھا۔ اس کے ساتھ حکمرانوں کا مذہب ہونے کی وجہ سے ایک طرح سے اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی اسلام کو مغل حکومت کا سرکاری مذہب نہیں قرار دیا جاسکتا، کیوں اسلام حکمرانوں کا مذہب ضرور تھا لیکن انھوں نے کبھی بھی اسے سرکاری یا حکومتی مذہب کے بطور عوام الناس پر نہیں تھوپا بلکہ انھوں نے مذہبی رواداری کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو یہ حق دیا کہ وہ جس مذہب کی چاہیں پیروی کریں۔ اسی وجہ سے ہمیں مغل عہد کے ہندوستان میں مذہبی تکثیریت کا فروغ بڑے پیانے پر نظر آتا ہے اور مختلف مذاہب کی مذہبی تحریکیں ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

نظریاتی طور پر ہندوستان میں اسلام کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ عربی و فارسی زبانوں کے ذریعے پھیلنے والے اپنے مرکزی میلان سے اتنا زیادہ قریب تھا کہ اس کے لیے 'ہندوستانی اسلام' کی اصطلاح کا استعمال شاید پوری طرح صحیح نہیں ہوگا۔ کیوں کہ یہ اصطلاح اس کی دوسرے اسلامی رجحانات سے دوری کا اشتباہ پیدا کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس میں رسوم اور اعتقادات کی جو تصریحات موجود ہیں وہ بڑی حد تک اس حقیقت کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں کہ عرب ممالک کے مقابلے میں ہندوستان کی ایران اور وسط ایشیا سے زیادہ قربت رہی ہے۔ ساتھ ہی یہاں پر اسلام کے ساتھ ہندو مذہب کی ایک لمبے عرصے تک ہم موجودگی نے ایک دوسرے پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ خاص طور پر اسلام اور ہندو مذہب کے آپسی میل جول میں تصوف نے بڑا اہم کردار انجام دیا۔ تصوف کے جو سلسلے ایران اور وسط ایشیا سے ہندوستان پہنچے تھے، ان کے لیے ہندوستان کی فضا بہت سازگار ثابت ہوئی اور سولھویں صدی کے آنے تک مذہب اسلام کے زیادہ تر راسخ العقیدہ عالموں نے تصوف کو ایک قابل قبول روحانی تربیت کے طور پر قبول کرلیا تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ وہ اسلامی شریعت، قانون اور رسوم کے تقاضوں پر پورا اترے۔ لیکن یہ آسان ذہنی سمجھوتہ اس وقت یکسر ٹوٹ گیا جب تصوف نے اپنے دروازے ابن عربی کے 'ہمہ اوست' سے عبارت خیالات کے لیے کھول دیے۔ ان کے 'وحدت الوجود' کے نظریے نے چودھویں صدی کے اواخر سے ہندوستانی صوفیوں کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا اور سخت مخالفت کے باوجود تواتر سے لوگ اس نظریے کو تسلیم کرتے گئے۔ نتیجتاً ہندوستان میں اسلام کی مختلف ہندو روایتوں کے ساتھ ہم موجودگی نے اس کے اپنے اعتقادات اور نظریات کے بارے میں مختلف قسم کے اندرونی سوالات کھڑے کردیے اور ایسی حالت میں ابن عربی کے نظریات اس ملک میں پائی جانے والی متنوع صورت حال کی ایک قابل قبول توضیح میں مدد کرتے ہیں۔ ابن عربی کے اس نظریے کی رو سے نظر آنے والی متنوع صورت حال محض ایک فریب نظر ہے، ساتھ ہی یہ نظریہ 'انسان کامل' کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس تصور کے ذریعے ابن

عربی کسی مرشد کامل یا شیخ کے مثالی رول کی توضیح کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مرشد اپنی جگہ پر ایک کائنات ہے، جس میں وہ خود اپنے آپ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کشف ہے، جس سے مہدی کا تصور اگر نکلتا نہیں تو کم از کم مضبوط ضرور ہوتا ہے۔ یعنی یہ تصور کہ روز قیامت سے پہلے ایک مصلح کا ظہور ہوگا۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو عام مسلمانوں کے اعتقادات کا حصہ ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں یہ دونوں تصورات یعنی 'انسان کامل' اور 'مہدی' ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جیسے جیسے اسلامی تاریخ کے ہزار سال کا اختتام قریب آیا، ہزار سالہ تحریکوں کے ابھرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہندوستانی تاریخ میں مہدوی تحریک اسی قسم کی دانشورانہ اتھل پتھل کا پیش خیمہ تھی۔ سید محمد جون پوری (1443-1504ء) اپنے وقت کے ایک بڑے عالم تھے، انھوں نے اپنے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا۔ عوام الناس کی ایک بڑی تعداد اس امید میں کہ مہدی کے بتائے ہوئے راستے اور اخلاقی اطوار کو اختیار کر کے نجات حاصل کی جا سکتی ہے، اس فرقے میں شمولیت اختیار کرتی گئی' ان لوگوں نے مختلف جگہوں پر اپنے دائرے قائم کیے۔ علماء برابر ان کی مذمت کرتے رہے لیکن یہ فرقہ موجود رہا۔

سولہویں صدی کی آخری دہائیوں کے دوران مغل حکومت کے صوبہ کابل میں ایک اور فرقہ وجود میں آیا۔ یہ لوگ بھی اسلامی کلنڈر کے ایک ہزار سالہ تحریک کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے۔ بس ان میں فرق صرف اتنا تھا کہ ان کے مرشد بایزید میاں پیر روشن (1525-1585ء) نے مہدی ہونے کے بجائے نبوت کا دعویٰ کیا۔ وہ تصوف کی طرف راغب ہونے کے سبب وحدت الوجودی نظریے کے قائل تھے اور 'سکونت' یعنی وہ حالت جب سالک خدا کی ذات میں ضم ہو جائے، تک پہنچ جانے کو اپنا مقصد سمجھتے تھے۔ بایزید کسی بھی ایسے شخص کو برداشت نہیں کرتے تھے جو ان کے پیغام کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ اس صورت حال نے بالآخر روشنیہ فرقے کو افغانوں کی ایک جنگجو تحریک بنا دیا۔ بایزید روشن نے اپنی کتاب 'خیر البیان' پشتو زبان میں تحریر کی ہے۔ روشنیہ فرقے کے جنگجو رویے کے نتیجے میں ان کو مغلوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑنا پڑی، جس کا اختتام ان کی مکمل شکست کی صورت میں ہوا۔

اکبر کے عہد حکومت (1556-1605ء) میں مذہبی افکار و خیالات کی سطح پر جو زبردست دھماکے ہوئے، ان کی ابتدا کسی حد تک ان فکری محرکات یعنی وحدت الوجود اور مہدویت میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ اکبر کی ابتدائی مذہبی دلچسپی روایتی اسلام کے دائرے میں ہی تھی۔ اس نے مشہور شہر فتح پور سیکری، جہاں سب سے شاندار عمارت جامع مسجد کی ہے 1570 میں شیخ سلیم چشتی کے اعزاز میں تعمیر کروایا تھا۔ 1570ء میں شیخ تاج الدین نے، جو ابن عربی کے خیالات کے حامی تھے، ان کے نظریات کو دربار میں متعارف کرایا۔ شیخ مبارک (وفات 1593ء) جو نہ صرف شہاب الدین مقتول کی اشراقی تعلیمات سے واقفیت رکھتے تھے بلکہ ان کے بارے میں بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ مہدویت سے متاثر تھے، اسی دوران دربار میں ان کا اثر بھی بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ 1582ء میں اکبر نے حکم جاری کیا کہ 'تاریخ الفی' مرتب کی جائے، جو محمد کی رحلت کے بعد گزرے ہزار برسوں کی تاریخی واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ اس حکم کے پس پردہ عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ محمد کی رحلت کے پہلے ہزار سال کے آخر میں کوئی بڑی تبدیلی ہوگی، جس کے لیے کسی مجدد کا ظہور لازمی ہے۔ کوشش یہی تھی کہ اکبر کو ایک مصلح کے طور پر پیش کیا جائے اور دوسری طرف اس کو ابن عربی کی روایت کے 'انسان کامل' کے پیکر میں بھی دیکھنا تھا۔ 'انسان کامل' کے تصور کو استعمال کرنے کی ایک ابتدائی کوشش وہ تھی جو 1579ء کے محضر میں ملتی ہے۔ یہ ایک بیان تھا، جس پر درباری علماء کے دستخط تھے۔ اس میں یہ اعلان کیا

گیا تھا کہ بحیثیت ایک منصف سلطان کے اکبر کو مسلم قانون کی تعبیر و توجیہ کرنے کا حق ہے اور تمام مسلمانوں کے لیے اس تعبیر و توجیہ کو تسلیم کرنا لازمی ہوگا۔

لیکن وحدت الوجود کے بڑھتے ہوئے اثرات کے نتیجے میں جلد ہی معاملات اس صورت حال سے بہت آگے نکل گئے، جس میں محضر کے ذریعے شہنشاہ کو بعض محدود قسم کے اختیارات دیے گئے تھے۔ اکبر کی موجودگی میں اب سنی علماء کے نمائندوں کے درمیان مباحث شروع ہوئے۔ یہ مباحث فتح پور سیکری میں واقع ایک مخصوص عمارت 'عبادت خانہ' میں پیش آتے تھے۔ پھر ان مباحث میں مختلف فرقوں کے مسلم علماء یعنی شیعہ، سنی اور صوفی کے علاوہ معقولات کے عالم بھی شریک ہونے لگے۔ اس کے کچھ عرصے بعد برہمن عالم، ہندو سنیاسی، جینی، پارسی اور عیسائی بھی شریک ہونے لگے۔ عیسائی اکبر کے دربار میں پہلی بار 1580ء میں پہنچے۔ ان مباحث کے نتیجے میں اکبر کے مذہبی نظریات تبدیل ہونے شروع ہوئے اور اسے اس بات کا یقین ہو چلا کہ اسلام کی کوئی ایک تعبیر ایسی نہیں جو پوری طرح یا قریب قریب صحیح ہو۔ اسے اس بات کا بھی یقین ہو گیا کہ کوئی ایک مذہب اکیلا سچا مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے خیال میں سبھی مذاہب حق کے ایک مرکز سے کسی نہ کسی حد تک روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ اللہ کی طرف سے ایک مخصوص با اختیار انسان کی حیثیت میں اس کی ذمے داری ہے کہ مختلف مذاہب اور گروہوں کے درمیان بے مقصد تنازعوں کو ختم کرنے کے لیے ان کے درمیان 'صلح کل' قائم کرے۔ اپنے مریدین و متبعین کے لیے اکبر نے یہ تجویز کیا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ اور پیر و مرشد کی مکمل اطاعت کریں۔ ان کے لیے جو ضابطۂ اطوار تیار کیا گیا تھا، اس کو جہاں گیر نے مختصراً ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''مریدین و متبعین پر واجب ہے کہ وہ کسی دوسرے مذہب کے لوگوں سے عداوت میں اپنے اوقات ضائع نہ کریں۔ تمام مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں انھیں 'صلح کل' کی راہ پر گام زن رہنا چاہیے۔ انھیں اپنے ہاتھ سے کسی جانور کو مارنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ انھیں میدان جنگ اور شکار کے علاوہ کسی اور جگہ ہتھیاروں سے لیس ہو کر نہیں جانا چاہیے۔ سورج اور چاند کی عزت کرنی چاہیے، کیوں کہ یہ دونوں اپنے مقدور کے مطابق خدائی روشنی پھیلاتے ہیں۔ خدا کو ہر حال میں خالق حقیقی اور علت دائم تسلیم کرنا چاہیے اور ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اکیلے ہو یا دوسروں کے ساتھ، اس کا دھیان ایک لمحے کے لیے بھی خدا سے ہٹنے نہ پائے۔''

اکبر نے تمام مذاہب کے ساتھ یکساں سلوک کیے جانے کی پالیسی اختیار کی تھی، جو ان کو محض انگیز کر لینے کے رویے سے بہت مختلف چیز تھی۔ یہ پالیسی ان نئے خیالات سے مطابقت رکھتی تھی جو اکبر نے 1580ء کی دہائی میں اختیار کیے تھے۔ اس پالیسی کے مطابق مذہبی خیالات کے اظہار کی مکمل آزادی، تبدیلی مذہب اور مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت دی گئی تھی۔ اکبر کے خیالات میں یہ تبدیلی اس صورت حال سے بھی متعین ہوئی کہ سیاسی لحاظ سے مذہبی رواداری کا رویہ بہت کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایسی پالیسی اس زمانے سے بہت پہلے ہی اختیار کر چکا تھا، جب اپنی زندگی کے آخری پچیس برسوں میں اس نے ایک نیا ترقی یافتہ فلسفہ زندگی اختیار کیا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے اعلان کیا کہ بادشاہیت فرِ ایزدی یعنی وہ روشنی ہے جو ذات باری تعالیٰ کا حصہ ہے اور حکمراں خدا کی طرح تمام انسانیت کا پرورش کرنے والا ہے۔ اس لیے حکمراں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے جن میں مذہبی اختلافات کی بنا پر آپسی نفرت کی دھول نہ اڑے۔ اس بیان کے بارے میں یہ بات قابل غور ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کسی فلسفیانہ یا مذہبی روایت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس کے تانے بانے حکمراں کی مطلق العنانی سے عبارت اختیارات اور رعایا کو مطمئن رکھنے کی اس کی ذمے داریوں سے ملتے ہیں۔

مغل دربار میں صلحِ کل او روحدت الوجود جیسے تصورات کی اشاعت کے اہم نتائج برآمد ہوئے اور سب سے اہم نتیجہ یہ نکلا کہ یکا یک ملک بھر میں دینیات اور اخلاقیات کے نہایت نازک پہلوؤں کو لے کر مسلمہ اور مروّجہ اعتقادات پر تنقید کی جانے لگی۔اس بحث نے اسلامی حلقوں میں شیعیت کے رجحان کے لیے ایک جگہ پیدا کردی۔گرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس سے پہلے بھی شیعہ اور سنّی فرقوں کے درمیان معاندانہ بحث جاری تھی۔لیکن اس صورت حال کے نتیجے میں جہاں ایک طرف راسخ العقیدہ مذہبی نقطۂ نظر کو شدت اور اصرار کے ساتھ بیان کیا گیا، وہیں دوسری طرف اس رجحان نے سائنسی اور معقولیت میں عام دلچسپی کو نئے سرے سے بڑھاوا دیا۔بالآخر مسلمانوں میں ایک نہایت اہم تحریک یہ پیدا ہوئی کہ ہندو مذہبی تحریروں اور ان کے یہاں پائی جانے والی وحدانیت کا مطالعہ یہ سمجھنے کے لیے کیا جائے کہ ہندوؤں میں 'حق' کا کیا تصور ہے؟ اکبر نے کئی سنسکرت تحریروں کے ترجمے کروائے، جن میں 'اتھر وید، مہابھارت، رامائن' اور 'یوگ وشسٹھ' جیسی تحریریں شامل تھیں۔ 'آئین اکبری' میں ابوالفضل نے فلسفہ کے مختلف ہندو مدارس فکر، ان کی دینیات، اعتقادات اور قوانین وغیرہ کا بھی نہایت درست اور اچھے انداز میں تذکرہ کیا ہے، جو قدیم تحریروں کے جدید مطالعے پر مبنی تھا۔اس کے مطابق قدیم تحریریں کا ترجمہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آئی تھیں۔لیکن ان تحریروں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوا کہ اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ابوالفضل کے بقول: ''گرچہ بعض مطالب اور دلائل میں اختلاف کی گنجائش ہے لیکن یہ ظاہر ہوگیا کہ ہندو بھی خدا کی عبادت اور وحدت میں یقین رکھتے ہیں۔''

مغل عہد میں مسلمانوں کی طرف سے ہندو مذہب کو سمجھنے کی کوششوں کا نقطۂ عروج داراشکوہ (1615-1659ء) کی دانشورانہ کارگزاریوں میں ملتا ہے۔داراشکوہ نے اپنی دانشورانہ روش کی ابتدا مسلم تصوف کے مطالعے سے کی، جس کے دوران وہ میاں میر (وفات 1636ء) اور ملا شاہ بدخشی (وفات 1661ء) کے ذریعہ قادریہ سلسلے سے متعلق ہوگیا تھا۔اس کی ابتدائی تحریریں مسلم صوفیوں کے حالات سے تعلق رکھتی تھیں۔لیکن وحدانیت کے تصور اور صوفیوں کے اطوار میں اس کی دلچسپی نے بالآخر اس کو 55-1654ء میں 'مجمع البحرین' تصنیف کرنے پر آمادہ کیا۔اس تحریر میں داراشکوہ نے ہندو روحانیت پر مرکوز بیانات میں استعمال ہونے والے اہم الفاظ اور تصورات کی توضیح کی ہے۔اس توضیح میں داراشکوہ کا موقف بلکہ اصرار ہے کہ تلاش حق میں سرگرداں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے علاوہ ہر چیز یکساں ہے۔1657ء میں اس نے اپنشدوں کا ترجمہ 'سرالاسرار' کے عنوان سے کیا۔اس کتاب میں سنسکرت کی بعض وقیع تحریروں کا نہایت صحیح ترجمہ ملتا ہے۔فلسفیانہ نقطۂ نظر سے تحریر کی گئی یہ اس کی سب سے اہم کوشش تھی۔56-1655ء میں داراشکوہ کی ایما پر حبیب اللہ نے 'یوگ وشِشٹھ' کا ایک نیا ترجمہ کیا۔

مغل دورِ حکومت کی علمی فضا کی نمائندگی اس عہد میں مذہب کے موضوع پر تحریر ہونے والی کتاب 'دبستان' کرتی ہے۔اس کتاب کو 1653ء میں ایک ایسے مصنف نے تالیف کیا جسے اپنا نام اور مذہب ظاہر کرنے میں تامل تھا، لیکن اس نے اپنی اس تحریر میں کئی ایسی باتیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پارسی مذہب سے تعلق رکھتا تھا اور اس کا تخلص 'موبد' تھا۔اس کا ارادہ تھا کہ تمام مذاہب کا سچائی پر مبنی اور ہر قسم کے تعصب سے مبرا حال تحریر کرے۔اس نے اپنی کتاب میں پارسی، ہندو، بدھ، یہودی، عیسائی اور اسلام جیسے مذاہب کے احوال کے ساتھ ان میں سے ہر مذہبی روایت کے اندر موجود مختلف فرقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اس موضوع پر زیادہ تر مواد مصنف نے خود یکجا کیا تھا۔اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس نے ہر مذہب اور فرقہ کی نمائندہ تحریروں کے مطالعے کے علاوہ ان مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے گفتگو کے ذریعے

بھی اطلاعات جمع کی تھیں ۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسے کئی زبانوں پر خاصا عبور حاصل تھا۔گرچہ 'دبستان' کا مصنف پارسی مذہب کا فرد تھا لیکن جس زبان میں اس نے اپنی کتاب تصنیف کی اس کے پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان تھے ۔ اس کتاب کے بے شمار مخطوطوں کی موجودگی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ فارسی پڑھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول تھی، جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی ۔

اکبر کے عہد حکومت میں مذہب اور مباحث کی جو آزادی فراہم کی گئی تھی اس کے نتیجے میں شیعیت کو ایک گمراہ کن فرقے کے بجائے ہندوستان میں اسلام کی ایک مختلف شکل کے طور پر پہچانا جانے لگا۔قاضی نوراللہ شستری (1549-1610ء) پہلے اثناعشری عالم ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں اپنی اہم تصنیفات چھوڑی ہیں ۔انھوں نے تقیہ کے رویے کو برطرف کرتے ہوئے کھل کر شیعی اعتقادات کے دفاع اور فروغ میں سنی نکتہ چینی کا جواب دیا۔ان کے لیے ایسا کرنا اس لیے ممکن ہوسکا کہ اکبر نے مذہبی آزادی کا ماحول پیدا کر دیا تھا ۔جہاں گیر کے حکم سے جسمانی ایذا پہنچائے جانے کے نتیجے میں 1610ء میں ان کا انتقال ہوگیا ۔اس بنا پر انھیں شیعہ فرقے کے شہیدوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ایران سے نقل مکانی کر کے آنے والے بہت سے افراد، جو زیادہ تر شیعہ تھے، مغل سلطنت میں اونچے عہدوں پر فائز ہوئے اور شیعہ مذہبی رسوم کھل کر ادا کی جاتی تھیں ۔سترہویں صدی عیسوی میں حیدرآباد دکن اور اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ اور فیض آباد شیعہ علوم وفنون کے اہم مرکز بن گئے تھے ۔

اکبر کے دور حکومت میں مذہبی اور فکری آزادی کے جو رجحانات اور میلانات ابھر کر سامنے آئے ان کے خلاف سنی مسلمانوں کے تقلیدی گروہ نے مختلف زاویوں سے اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ یہ ردعمل کتنے شدید اور متفرق تھے، اس کا اندازہ شیخ احمد سرہندی (1564-1624ء) کے افکار و خیالات سے لگایا جا سکتا ہے ۔ان کی سب سے پہلی دستیاب تحریر 'رسالہ رد روافض' میں شیعہ اعتقادات کی تردید کی کوشش ہے ۔شریعت سے متعلق ان کے متشددانہ انداز فکر کا اظہار اکبر کی روادارانہ سیاسی حکمت عملی کے ردعمل میں ہندوؤں اور ہندو اعتقادات کی سخت تنقید کی صورت میں ظاہر ہوا۔اکبر کے انتقال کے بعد لکھے گئے اپنے خطوط میں انھوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔لیکن اسی دوران 1600ء میں وہ نقش بندی صوفی باقی باللہ (وفات 1603ء) کے مرید بن گئے ۔اس کے بعد انھیں ابن عربی کے وحدت الوجود اور انسان کامل کے تصورات سے ماخوذ نظریات میں دلچسپی پیدا ہوگئی ۔لیکن ان نظریات کو انھوں نے محض فروعی طور پر تسلیم کیا۔ان کا دعویٰ تھا کہ سالک کو اس نظریے کے ماوراء جا کر ہجر کی تکلیف کا تجربہ کرنا چاہیے ۔ان کے لیے وحدت الوجود کا مطلب تھا 'وحدت الشہود'۔کیوں کہ بالآخر ان کی نظر میں ذات باری تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ان کے مطابق شریعت کی سختی کے ساتھ پابندی ایک صوفی کے لیے اتنی ہی لازمی ہے جتنی کسی دوسرے شخص کے لیے اور اس کے ساتھ وہ ہر قسم کی بدعتوں اور خرافات کی مذمت کرتے تھے ۔اورنگ زیب نے عام طور پر روایتی اسلام کے شرعی احکام کو زیادہ اہمیت دی ۔اس بات کی سب سے عمدہ مثال اسلامی شریعت اور قانون کے موضوع پر اس کے ذریعے تیار کروائی گئی کتاب 'فتاویٰ عالم گیری' ہے ۔اس کتاب کو شیخ نظام نے عالموں کی ایک پوری جماعت کی مدد سے عربی زبان میں اس طرح تیار کیا تھا کہ وہ مختلف مسائل پر فقہاء کی آرا کا ایک مثالی مجموعہ بن جائے ۔اس کتاب میں مسائل کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے ۔

16.5.5 عیسائیت

ہندوستان میں مغل دور حکومت میں پائے جانے والے مذاہب میں ایک اہم نام عیسائیت کا بھی ہے ۔یورپی نشاۃ ثانیہ کے بعد اور خاص طور پر نوآبادیاتی عہد کی ابتدا میں دنیا میں عیسائیت کا عروج بڑے پیمانے پر شروع ہوا، لیکن ان تمام سے پیش تر کیرالا کے ساحل پر ایک لمبے

عرصہ سے عیسائی اور یہودی مذہب کے لوگ رہتے چلے آرہے تھے اور بحر احمر سے ہونے والی تجارت کے ذریعے ان لوگوں کا عیسائیت اور یہودی مذہب کی مشرقی شاخوں سے تعلق قائم رہا۔ پرتگالی تاجروں کے ساتھ ہندوستان میں کیتھولک عیسائیت کا بھی ظہور رہا۔ فرانسس زیویر (1506-1552ء) پہلا عظیم کیتھولک مبلغ تھا جو ہندوستان آیا۔ اٹلی کے رہنے والے ایک دوسرے عیسائی مشنری رابرٹ ڈی نوبلی (1577-1656ء) نے عیسائیت کو ہندوستانی طرز میں پیش کرنے کی غرض سے اونچی ذاتوں اور دلتوں کے لیے الگ الگ کلیسے قائم کیے۔ عیسائیت سے متعلق تحریروں کو ہندوستانی زبانوں میں شائع کرنے کے لیے عیسائی مشنریوں نے چھاپہ خانے کا استعمال کیا۔ 1557ء میں گوا کو آرچ ڈیوسیز (Archdiocese) یعنی ایک آرچ بشپ کے رہنے کے مقام کا درجہ مل گیا۔ پرتگال کے زوال کا اثر ہندوستان کے کیتھولک کلیسا کی کارکردگی پر بھی پڑا۔ سیرین عیسائیوں کے کئی گروہوں نے جو پرتگالیوں کے زیر اثر پاپائے روم کو اپنا سربراہ تسلیم کر چکے تھے 1653ء میں دوبارہ اینٹوک (Antioch) سے اپنا تعلق قائم کرلیا۔ 1759ء میں پرتگال نے بھی عیسائی سلسلے کو غیر قانونی قرار دے دیا، لیکن ایک لمبے عرصے تک کیتھولک عیسائی فرقہ ہی نصرانی عقائد کا واحد ایسا گروہ تھا، جس سے ہندوستان کے لوگ واقف تھے۔ 'دبستان مذاہب' کے نصرانی عقائد کے باب میں کیتھولک تعلیمات کا بہت ہی صحیح اور تفصیلی بیان ملتا ہے لیکن اس بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف پروٹسٹنٹ اصلاحی تحریک سے قطعی ناواقف تھا۔

مارٹن لوتھر کی تعلیمات کو پھیلانے والے پہلے مشنری ڈنمارک کے تاجروں کے ساتھ 1706ء میں تامل ناڈو کے ٹرانکوبر نامی مقام پر پہنچے۔ ان مشنریوں میں ایک زی گینبا لگ (Ziegenbalg) تھا، جس نے 1714ء میں چاروں آسمانی کتابوں کا تامل زبان میں ترجمہ کیا۔ ابتدائی ادوار میں ہندوستان میں فروغ پانے والے ہندو اور مسلم دونوں قسم کے مذہبی افکار پر عیسائیت کا بہت کم اثر پڑا۔ انیسویں صدی کے اوائل سے عیسائیت کے اثرات کسی قدر اہمیت اختیار کر چکے تھے۔

16.6 خلاصہ

اس اکائی کے خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغل دور حکومت میں حکمرانوں نے اپنی عوام کو انصاف کی فراہمی کے لیے بڑے پیمانے پر کوششیں کیں۔ اس کے لیے انھوں نے مغل انتظامی ڈھانچے کی بنیادی اکائی یعنی گاؤں کی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک مختلف قسم کی عدالتوں کا سلسلہ قائم کیا تا کہ عوام الناس کو انصاف کے حصول میں کسی بھی قسم کی پریشانی اور ایذا نہ پہنچے۔ ان عدالتوں کو فعال بنانے کے لیے انھوں نے ان میں مختلف قسم کے افسروں، عہدیداروں اور کارکنان کا تقرر کیا۔ تا کہ عوام کو اپنے معاملات کا فوری حل مل سکے۔ مغل دور کی سماجی حالت کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی تاریخ کے پچھلے ادوار کی طرح اس دور میں بھی معاشرہ مختلف طبقات میں منقسم رہا۔ گرچہ مغلوں نے سماج کے طبقاتی نظام کے ان بندھنوں کو توڑنے کی کوشش کی لیکن انھیں اپنے اس مقصد میں کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی اور لوگ اونچی نیچی ذاتوں میں ہی منقسم رہے۔ حرفے اور پیشے کی بنیاد پر ہی لوگوں کی پہچان ہوتی رہی۔ مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت بہت حد تک قابل رشک شمار کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں اس عہد کی سب سے اہم بات مذہبی تکثیریت ہے۔ مغلوں نے عوام الناس کو یہ اختیار دیا کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کے اعتبار سے جس مذہب کو چاہیں مانیں، جس کی چاہیں عبادت کریں۔ اس عہد میں مذہبی افکار و نظریات کو بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ نئی تحریکیں وجود میں آئیں اور انھوں نے لوگوں کو مذہب کے معاملات میں کھل کر غور و فکر کا موقع فراہم کیا۔

16.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1۔ مغل عہد حکومت کے عدالتی نظام کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

2۔ صوبائی سطح پر مغل عہد حکومت میں کس کس طرح کی عدالتیں قائم تھیں؟ بیان کیجیے۔

3۔ مغل دور کی سماجی حالت پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4۔ مغل سماج میں حکمراں طبقے کو ملنے والی مراعات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ مغل عہد حکومت کی مذہبی حالت کا تجزیہ کیجیے۔

6۔ مغل عہد میں مذہب اسلام کی کیا حالت تھی؟ بیان کیجیے۔

16.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی، ابن حسن، اردو ترجمہ: عبدالغنی نیازی مجلس ترقی ادب، لاہور

2۔ آئین اکبری، ابوالفضل، اردو ترجمہ: مولوی محمد فدا علی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

3۔ عہد وسطی کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ، عرفان حبیب، اردو ترجمہ: اقتدار عالم خاں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی

4۔ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، بی این پانڈے، اردو ترجمہ: تقی رحیم، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1998

5۔ مغل ہندوستان کا طریق زراعت، عرفان حبیب، اردو ترجمہ: جمال محمد صدیقی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی

6۔ مغل دربار، ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور

7۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

8۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

اکائی 17 : علمی خدمات،فنون لطیفہ اور فن تعمیر

اکائی کے اجزاء

17.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مغل عہد کی ثقافتی زندگی سے روشناس کرانا ہے تاکہ انھیں اس بات کا علم ہو سکے کہ مغل دور میں نظام تعلیم کیسا تھا اور اس عہد میں کس طرح کے علمی، ادبی وسائنسی کارنامے انجام دیے گئے؟ مغل دور کی اہم علمی شخصیات سے طلبہ کو متعارف کرانا بھی اس اکائی کا

ایک اہم مقصد ہے۔ ساتھ ہی اس اکائی کا مقصد طلبہ کو فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کے ان نمونوں سے بھی متعارف کرانا ہے، جن کا اظہار مغل دور میں ہوا تا کہ طلبہ مغل دور کی اس ثقافتی ترقی سے بخوبی واقف ہوسکیں جو مغل سلطنت کا ایک شان دار باب رہی ہیں اور جو آج بھی اپنے زائرین اور دیکھنے والوں کو حیرت زدہ کردیتی ہیں۔

17.2 تمہید

مغل سلطنت جو 1526ء میں اپنے قیام کے بعد تقریباً تین سو سال سے کچھ زیادہ عرصے تک قائم رہی، اس نے ہندوستان کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں غیر معمولی اضافے کیے۔ مغل حکمرانوں نے نہ صرف پورے ملک میں علم و تعلیم کی فضا ہموار کی بلکہ خود بھی اس کے سرپرستوں میں شامل رہے۔ علم و ادب، سائنس و حکمت اور فنونِ لطیفہ و فنِ تعمیر سے مغل حکمرانوں کی خصوصی دلچسپی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پورے ملک میں اس کا چلن عام ہوگیا۔ امراء سے لے کر عوام الناس تک سبھی نے اس کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا اور چند ہی برسوں میں پورے ملک میں نہ صرف تعلیم و تعلم، علم و دانش اور سائنس و حکمت کا چلن عام ہوگیا بلکہ ملک کے کونے کونے میں فنِ لطیف اور فنِ عمارت سازی کے نمونوں کی شکل میں تہذیبی و ثقافتی ترقی کی پوری فضا ہموار ہوگئی۔ مغل دور کی تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ علم و سائنس اور فنونِ لطیفہ و فنِ تعمیر کے میدان میں جتنے اہم کارنامے اس دور میں انجام دیے گئے، شاید اس سے پہلے کی ہندوستانی تاریخ میں اتنے اہم کارنامے انجام نہیں دیے گئے تھے۔ اس وجہ سے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تاریخ میں مغل عہد اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

17.3 مغل عہد میں تعلیمی ترقی

مغل حکمراں تعلیم کے بڑے سرپرست تھے اور انھوں نے اپنی حکومت میں اس کے فروغ کے لیے خصوصی توجہ دی۔ مغل سلطنت کا بانی ظہیر الدین محمد بابر خود اپنے عہد کا ایک عظیم دانشور تھا۔ وہ نہ صرف عربی، فارسی اور ترکی زبان کا ایک بڑا عالم تھا بلکہ ایک باریک بیں نقاد بھی تھا۔ بابر نے ملک کے عوام کی ہمہ جہت ترقی اور ان کی بھلائی کے لیے جو نظام رائج کیا تھا وہ اس کے جانشینوں کے ادوار میں بھی جاری رہا۔ بابر کے وزیر سید معتبر علی کی کتاب 'تواریخ' سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے محکمۂ تعمیرات عامہ کو اس کے دیگر فرائض کے ساتھ ساتھ یہ کام بھی سپرد کیا گیا تھا کہ وہ مدارس اور دارالعلوم تعمیر کرے۔ یہ محکمہ بعد کے مغل حکمرانوں کے ادوار میں بھی باقی رہا۔ اس حقیقت سے کہ تعلیمی عمارتوں کی تعمیر کا کام مملکت کے ایک محکمے کے فرائض میں شامل کیا گیا تھا، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت تعلیمی امور پر توجہ دیتی تھی۔ بابر کے بیٹے اور جانشین نصیر الدین محمد ہمایوں کو بھی علم اور کتابوں کے مطالعے کا بڑا شوق تھا، علم فلکیات اور جغرافیہ میں اس کی خصوصی دلچسپی تھی۔ ہمایوں نے دہلی میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا اور دہلی کے پرانے قلعے میں شیر شاہ سوری کے ذریعے تعمیر کردہ عمارت شیر منڈل کو، جو عیش و نشاط کے لیے استعمال ہوتی تھی، ایک کتب خانے میں تبدیل کردیا۔ اسی کے ساتھ مختلف تاریخی حوالوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں کا مشہور مقبرہ بھی کسی زمانے میں درس گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

جلال الدین محمد اکبر کا عہد اپنی ہمہ جہت ترقیات کے لیے مشہور ہے، اس دور میں تعلیم اور اس کے فروغ کے لیے نئے زاویے اختیار کیے گئے۔ اکبر نے اعلیٰ تعلیم کے بہت سے ادارے آگرہ اور فتح پور سیکری میں قائم کیے۔ اسی بنیاد پر ابوالفضل کا یہ بیان ہے کہ "تمام مہذب قومیں

اپنے نوجوانوں کی تعلیم کے لیے مدارس قائم کرتی ہیں، لیکن خصوصی طور پر ہندوستان اپنی درس گاہوں کے لیے مشہور ہے۔ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک پہاڑی پر ایک تعلیمی ادارہ تعمیر کرایا۔ ایسا شان دار تعلیمی ادارہ شاید ہی کسی سیاح نے کسی دوسرے مقام پر دیکھا ہو۔ لالہ سیل چند کا بیان شاید اسی مدرسے کے بارے میں ہو جب وہ یہ لکھتے ہیں کہ ''اکبر نے اجمیر سے واپسی پر فتح پور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور بہت سی عمارتیں وہاں تعمیر کیں، جن میں مدرسہ اور خانقاہ وغیرہ شامل ہیں۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس اہم تعلیمی ادارے کے علاوہ اس شہر میں اور بھی کئی مدرسے تھے، جن کو اکبر کی ایما پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اسی طرح آگرہ میں بھی کئی مدرسے تھے۔ لالہ سیل چند نے لکھا ہے کہ ایک بہت بڑا مدرسہ اس کے عہد تک آگرہ میں موجود تھا۔ دہلی میں واقع اکبر کے عہد کا ایک مدرسہ ادہم خاں کی ماں اور اکبر کی دایہ ماہم انگا نے 969ھ/ 1561ء میں تعمیر کرایا تھا۔ ماہم انگا کے اس مدرسے کے علاوہ ایک اور مدرسہ جسے خواجہ معین نامی ایک شخص نے تعمیر کرایا تھا، دہلی کے اہم مدارس میں شمار ہوتا تھا۔

نورالدین جہاں گیر بھی ترکی اور فارسی زبان کا ایک اہم عالم تھا، اس نے اپنی آپ بیتی 'تزک جہاں گیری' کے نام سے ترتیب دی تھی۔ مورخین کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حکمراں بننے کے بعد اس نے بہت سے قدیم مدارس کی مرمت کرائی اور بہت سے دوسرے مدرسے تعمیر کرائے۔ اپنی حکومت کے آخری ادوار میں اس نے ایک قانون پاس کیا کہ جب کوئی دولت مند شخص یا کوئی مسافر انتقال کر جائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی جائیداد حکومت کے ذریعے ضبط کر لی جائے گی اور اسے مدرسوں و خانقاہوں وغیرہ کی تعمیر اور مرمت پر خرچ کیا جائے گا۔ شہاب الدین شاہ جہاں بھی ترکی ادب کے مطالعے کا بڑا شوقین تھا، اس کا معمول تھا کہ رات میں سونے سے پہلے کتابوں کا مطالعہ ضرور کرتا تھا۔ شاہ جہاں نے 'دارالبقا' نامی ایک ادارے کی مرمت کرائی اور دہلی میں ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی۔ شاہ جہاں کے بیٹے دارا شکوہ نے ہر طرح کی تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کی۔ محی الدین اورنگ زیب نے بھی مسلمانوں کی تعلیم کے فروغ کی کوشش کی، اس نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ 1678ء میں اورنگ زیب نے گجرات کے قدیم مدارس کی مرمت کے لیے ایک رقم منظور کی۔ اسی طرح 1697ء میں احمد آباد میں اکرام الدین خاں نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک دارالعلوم تعمیر کرایا اور اورنگ زیب سے اس کے لیے مالی امداد مانگی۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے دو گاؤں موضع سعدرہ، پرگنہ سنولی میں اور موضع سیہا، پرگنہ کڑی میں جاگیر کے طور پر عطا کیے۔ اورنگ زیب کے عہد میں سیال کوٹ مسلمانوں کے علم و فضل کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکومت کا زوال شروع ہو گیا اور بہادر شاہ اول کے تخت نشین ہونے کے بعد سے رفاہی کاموں کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے باوجود بھی بہادر شاہ اول کے عہد میں دہلی میں دو مدرسوں کے قیام کا تذکرہ ملتا ہے۔ پہلا مدرسہ غازی الدین خاں نے قائم کیا جو دکن میں نظام خاندان کے بانی آصف جاہ کے والد تھے۔ انھوں نے دہلی کے اجمیری دروازہ کے قریب دارالعلوم تعمیر کرایا تھا۔ دوسرا مدرسہ خان فیروز جنگ نے تعمیر کرایا تھا۔ بہادر شاہ اول کے عہد میں قنوج میں بھی ایک مدرسہ قائم تھا، جو مدرسہ 'فخر المرابیخ' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ 1722ء میں محمد شاہ کے عہد حکومت میں نواب شرف الدولہ نے دہلی میں ایک مدرسے اور ایک مسجد کی تعمیر کرائی۔ اسی طرح بعد کے ادوار یعنی عہد زوال میں بھی مغل حکمرانوں نے تعلیم کے فروغ کے لیے اپنی سلطنت کے مختلف علاقوں میں مدرسے قائم کیے، جو تعلیم سے ان کی دلچسپی کا پتہ دیتے ہیں۔

17.3.1 نظامِ تعلیم

مغل حکومت کے تعلیمی نظام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کے یہاں تعلیم کے دو مراحل تھے، ایک ابتدائی تعلیم اور

دوسری اعلیٰ تعلیم ۔مغل عہد میں تعلیم کے یہ دونوں مراحل حکومت سے آزاد تھے ۔کیوں کہ مغل حکومت میں سرکاری سطح پر کوئی تعلیم کا شعبہ نہ تھا، جو عوام الناس میں باقاعدہ طور پر تعلیم کے فروغ کی کوشش کرتا اور حکومتی آمدنی کا ایک حصہ اس پر خرچ کرتا ۔اسی وجہ سے بہت سے مؤرخین اس کے لیے مغل حکومت پر تنقید بھی کرتے ہیں، خاص طور پر مغربی مؤرخین کہ مغل حکومت نے اپنی عوام کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے سرکاری سطح پر عملی کوشش نہیں کی ۔

یہ حقیقت ہے کہ مغل عہد میں تعلیمی ترقی انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھی ۔یہ انفرادی کوششیں مغل معاشرے کے ہر سطح پر نظر آتی ہیں، چاہے وہ حکمراں ہوں یا امراء، جاگیردار اور زمیندار ہوں یا عوام الناس ۔لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کا خود انتظام کرتے ۔وقت، حالات اور علاقے کے اعتبار سے تعلیم گاہوں میں بچوں کے داخلے کی عمر میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔لیکن ان تمام کے باوجود بھی مغل عہد کی تعلیمی ترقی تشفی بخش شمار کی جاتی ہے ۔مغل عہد کے ابتدائی دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے اپنے علیحدہ تعلیمی ادارے قائم تھے ۔ہندو والدین عام طور پر اپنے بچوں کو پانچ سال کی عمر میں اسکول بھیجتے، جب کہ مسلمان اپنے بچوں کو چار سال، چار مہینے اور چار دن کی عمر میں مدرسے بھیجتے ۔شاہ جہاں نامہ میں اسے رسم مکتب کہا گیا ہے ۔ایل ایف اسمتھ نے 1801ء میں ملک کے شمال مغربی صوبے میں مسلمانوں کے درمیان اس رسم کے ادا کیے جانے کے طریقوں کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا تھا ۔اپنے ایک خط میں وہ اس کی تفصیلات اس طرح تحریر کرتا ہے "جب بچے کی عمر چار سال، چار ماہ اور چار یوم کی ہو جاتی ہے تو اس کے لیے ایک چاندی کی تختی تیار کی جاتی ہے ۔ اس پر سورہ اقرا لکھ دی جاتی ہے اور بچے کے سامنے اسے اس طرح پڑھا جاتا ہے کہ وہ بھی ساتھ ساتھ اسے دہراتا جائے ۔اس وقت ایک استاد اس کے لیے مقرر کر دیا جاتا ہے ۔" مغل عہد میں مسلم معاشرے کے ہر طبقے میں یہ رسم رائج تھی، حکمراں، امراء اور عوام سبھی اس رسم پر کاربند تھے ۔اسی طرح سے ہندو اور مسلم دونوں قوموں کا نصاب تعلیم بھی مختلف تھا اور دونوں کے تعلیمی اداروں میں تعلیم بھی الگ الگ زبانوں میں دی جاتی تھی ۔

اکبر کے عہد حکومت میں مدارس اور جامعات میں تعلیم و تدریس کے نظام کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے ۔اس عہد میں تعلیم کے میدان میں نئی اصلاحات جاری کی گئیں جو حکمراں کی بے تعصبی اور فراخ دلی کا نتیجہ تھیں ۔مسلم تاریخ اور خاص طور سے ہندوستانی تاریخ میں غالباً اکبر پہلا بادشاہ تھا، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم کی یکساں طور پر ترقی چاہتا تھا اور اسی دور میں پہلی مرتبہ یہ بھی نظر آتا ہے کہ ہندو اور مسلمان ساتھ ساتھ مدارس اور جامعات میں تعلیم پا رہے تھے ۔ابوالفضل نے آئین اکبری میں درج ذیل مضامین کی فہرست دی ہے:

علم الاخلاق، علم ہندسہ، حساب، زراعت، مساحت، فلکیات، جغرافیہ، اقتصادیات، علم رمل، امور خانہ داری، نظم و نسق، طب، منطق، فلسفہ، ریاضی، علم طبیعیات، علم الٰہیات، دینیات اور تاریخ کے علاوہ ہندوستانی علوم مثلاً ویاکرن، نیائے، ویدانت اور پتن جلی یعنی قواعد، منطق، وید اور یوگ ۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق اکبر چاہتا تھا کہ طلبہ مدرسوں میں ان مضامین کو پڑھیں ۔اکبر نے جو کچھ تجویز کیا تھا اس کو عملی جامہ پہنانا ایک مشکل کام تھا، لیکن ابوالفضل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ان مضامین کے پڑھائے جانے سے مدرسوں میں نئی جان آ گئی تھی ۔اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ یہ تمام مضامین ان مدرسوں میں حقیقی طور پر پڑھائے جاتے تھے، کیوں کہ زیادہ تر مدرسوں کا نصاب ہمیشہ کی طرح مسلم دینیات اور اس سے متعلق لاتعداد تحریروں پر ہی منحصر رہا ۔اعلیٰ تعلیم زیادہ تر مدرسوں کے باہر اساتذہ، اپنی ذاتی حیثیت میں ہی دیا کرتے تھے ۔ جب کوئی طالب علم کسی مخصوص تحریر، مضمون یا علمی میدان میں عبور حاصل کر لیتا تو اس کو استاد کی طرف سے ایک سند مل جاتی تھی ۔

17.3.2 غیر مسلموں کا تعلیمی نظام

مغل عہد حکومت میں ہندو ابتدائی تعلیمی ادارے مندروں سے منسلک ہوتے تھے۔ان ابتدائی تعلیمی اداروں کا نظم ونسق عوامی تعاون یا اوقاف سے چلایا جاتا تھا اور طلبہ سے کسی قسم کی کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ان ابتدائی تعلیمی اداروں میں والدین اپنے بچوں کا داخلہ عام طور پر پانچ سال کی عمر میں کرا دیا کرتے تھے۔ان اسکولوں میں مطبوعہ کتابیں نہیں ہوتی تھیں، بچے لکڑی کی تختیوں پر یا اپنی انگلیوں کی مدد سے زمین پر حروف کی مشق کرتے۔کلاس عام طور پر درختوں کے سائے میں لگائے جاتے۔مکمل طور پر حروف تہجی کی مشق کے بعد طلبہ کو مذہبی تحریریں پڑھنے کے لیے دی جاتیں اور برنیر کے مطابق عام طور پر انھیں 'پُران' کی عبارتیں پڑھنے کے لیے دی جاتیں۔

مغل ہندوستان میں ہندو اعلیٰ تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں، ان میں سے زیادہ تر تعلیمی ادارے مذہبی زیارت گاہوں کے قریب واقع تھے۔بنارس ہندو علوم کا سب سے اہم مرکز تھا، خاص طور پر 'جیوتش وِدّیا' کا، لیکن جیسا کہ برنیر نے لکھا ہے اس زمانے کے ہندوستان میں ایسے ادارے موجود نہیں تھے جنھیں مغرب کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کا مقابل قرار دیا جا سکے۔وہاں پر قدیم طرز تعلیم کی طرح اس عہد میں بھی پورے شہر میں اساتذہ کے اپنے گھروں میں تعلیم گاہیں قائم تھیں، جہاں پر طلبا اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے پہنچتے تھے۔بنارس کے بعد ہندو علوم اور تعلیم کا دوسرا اہم مرکز مغربی بنگال کا ایک ضلع نادیہ (Nadia) تھا۔

سولھویں صدی عیسوی میں واسدیو سروبھاؤما نے وہاں پر نیائے کا ایک اسکول قائم کیا تھا جو بعد کے عہد میں متھلا یونیورسٹی کی ہم سری کرنے لگا تھا۔اسی طرح مغل عہد میں متھلا یونیورسٹی بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز رہی۔بہار کا ترہٹ (Tirhut) ڈویژن بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھا، جس میں مظفر پور، مغربی چمپارن، مشرقی چمپارن، ویشالی، سیتامڑھی اور سیوہر کے ضلعے شامل تھے۔

متھرا بھی اس عہد میں ہندو تعلیم کا ایک اہم اور مشہور مرکز تھا، جسے ہندو فلسفے کی تعلیم کے لیے شہرت حاصل تھی اور وہاں پر لگ بھگ دس ہزار سے زائد طلبہ زیر تعلیم تھے۔مہاراشٹر کے تین علاقے پیٹھن (Paithan)، کرہڈ (Karhad) اور تھاٹے (Thatte) بھی ہندو اعلیٰ تعلیم کے اہم مراکز تھے، ہیملٹن کے مطابق وہاں پر تقریباً چار سو تعلیمی ادارے موجود تھے۔ان تعلیمی اداروں میں ہندو دینیات، فلسفہ اور سیاسیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ملتان کا تعلیمی مرکز فلکیات، نجوم، ریاضی اور طب میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے لیے مشہور تھا اور اسی طرح سرہند میں بھی طب کا ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔مغل ہندوستان میں موجود ہندو اعلیٰ تعلیمی اداروں کا نصاب زبان وقواعد، شاعری، منطق، فلسفہ، تاریخ، فلکیات، نجوم، طب بشمول جانوروں کا علاج، ریاضی، طبیعیات اور کیمیا پر مشتمل تھا۔

17.3.3 مسلمانوں کا تعلیمی نظام

مغل ہندوستان کے تعلیمی نظام میں مسلمان اپنے بچوں کو مسجدوں میں یا اس کے پاس واقع مکتب میں بھیجتے۔اطالوی سیاح Delia Valle کے مطابق اس طرح کے اسکول ہر قصبے اور گاؤں میں موجود تھے۔ان ابتدائی اسکولوں کا بنیادی نصاب ابتدائی فارسی اور قرآن پر مشتمل ہوتا تھا۔جن میں شیخ سعدی کی گلستاں، بوستاں اور فردوسی کی نظمیں شامل ہوتی تھیں۔بچوں کو پہلے فارسی کی ابجد سکھائی جاتی تھی، ساتھ ہی تلفظ کی صحت پر زور دیا جاتا تھا اور راو قاف واعراب سکھائے جاتے تھے۔جب بچہ یہ چیزیں سیکھ لیتا تھا تو اسے دو حرفوں کا ملانا سکھایا جاتا تھا۔کچھ دنوں

کے بعد انھیں نثر یا نظم کے مختصر جملے پڑھائے جاتے تھے، جن میں مذہبی یا اخلاقی پند و نصائح ہوتے تھے اور سیکھی ہوئی ترکیبوں کا استعمال ہوتا تھا، وہ انھیں خود پڑھنے کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی استاد بھی ان کی مدد کرتا۔ اس کے بعد استاد چند روز تک نئے فقرے یا مصرعے سکھاتا تھا اور نہایت تھوڑے وقت میں بچے روانی کے ساتھ پڑھنے لگتے تھے۔ استاد چھوٹے بچوں کے لیے چار مشقیں روزانہ مقرر کرتا تھا یعنی ابجد دہرانا، حروف جوڑنا، ایک نیا مصرع یا شعر یاد کرنا اور آموختہ دہرانا۔

اعلیٰ تعلیمی اداروں کو مدرسے کا نام دیا جاتا، جو ملک کے تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود تھے۔ ان میں دہلی اور آگرہ تعلیم کے سب سے اہم مراکز تھے، جہاں پر شریعہ کالج کے ساتھ ساتھ لاتعداد مدرسے موجود تھے۔ دہلی کے مدرسوں میں ہمایوں کا بنوایا ہوا مدرسہ، ماہم انگا کا مدرسہ، جسے 'خیر المنازل' کے نام سے جانا جاتا تھا اور شاہ جہاں کا بنوایا ہوا مدرسہ 'دار البقا' کافی اہم تھے۔ خیر المنازل ایک اقامتی اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا۔ مغل عہد میں اعلیٰ تعلیم کے میدان میں جون پور اپنی ایک شناخت رکھتا تھا، جسے 'شیراز ہند' کے نام سے تاریخ میں جانا جاتا ہے۔ یہاں پر ملک کے دور دراز علاقوں سے طلبہ حصول تعلیم کے لیے آتے تھے۔ مغل عہد میں گجرات بھی اپنے اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے مشہور تھا، وہاں کا 'فیض صفا' نامی مدرسہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کافی مشہور تھا۔ احمد آباد میں بھی کافی اہم مدرسے تھے، جن میں شیعہ مکتب فکر کا ایک مدرسہ، جسے اب 'بارہ اماموں کا کوٹلہ' کہا جاتا ہے، کافی مشہور تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت میں لاہور نے ایک اہم اعلیٰ تعلیمی مرکز کے طور پر لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ اسی طرح سے کشمیر بھی اپنی فطری خوب صورتی اور آب و ہوا کی وجہ سے دانشوروں کے لیے کافی اہمیت رکھتا تھا۔ مغل عہد میں مسلم اعلیٰ تعلیمی اداروں کے مرکز کے طور پر گوالیار، سیال کوٹ، انبالہ اور تھانیسر بھی اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔

مغل عہد کے تعلیمی نظام میں اگلی کلاس میں طلبہ کی ترقی کے لیے باقاعدہ طور پر کوئی امتحان نہیں لیا جاتا تھا بلکہ استاد اس بات کا فیصلہ کرتا تھا کہ بچہ اگلی کلاس میں پہنچنے کے لائق ہے یا نہیں۔ تعلیمی ادارے بچوں کو کسی طرح کی کوئی سند نہیں دیتے تھے بلکہ کسی اہم تعلیمی ادارے یا اپنے فن میں کسی معروف و مشہور علمی شخصیت سے تعلیم یافتہ ہونا کافی سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح سے وثوق کے ساتھ یہ بات بھی نہیں کہی جا سکتی کہ تمام تعلیمی اداروں میں تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ایک متعینہ مدت طے تھی۔ مغل عہد کے تعلیمی نظام کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے کے لیے دس سے سولہ سال تک کے حصول تعلیم کو کافی سمجھا جاتا تھا، جو کہ ہمارے موجودہ یونیورسٹی تعلیمی نظام کے ڈگری کورس کے مساوی ہوتا تھا۔ وہ طلبہ جو تدریس کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے تھے یا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا چاہتے، انھیں اس فن کے ماہرین کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ یہ طلبہ ملک اور بیرون ملک واقع اپنے فن کے اہم تعلیمی مراکز سے بھی استفادہ کرتے، جسے ان کے نصاب کا ایک اہم حصہ شمار کیا جاتا۔

17.3.4 کتب خانے

ملک اور قوم کی تعلیمی ترقی کے لیے کتابوں اور کتب خانوں کا کردار ہمیشہ سے ہی بہت اہم شمار کیا جاتا رہا ہے۔ ساتھ ہی کسی بھی قوم کے علمی اور تعلیمی معیار کا اندازہ وہاں پر واقع مدارس اور کتب خانوں کی موجودگی سے لگایا جا سکتا ہے۔ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مغل دور کی علمی و تعلیمی ترقی میں کتب خانوں کا بہت اہم رول ہے۔ کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کے قیام میں مغل معاشرے کے سبھی طبقات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ چاہے حکمراں طبقہ ہو یا عوام الناس سبھی کے یہاں کتابوں سے دلچسپی نظر آتی ہے۔ خاص طور پر عہد عروج کے تقریباً سبھی مغل حکمراں کتاب دوست دکھائی دیتے ہیں۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی بابر اپنی دانشورانہ اور علمی صلاحیتوں

کے لیے کافی شہرت رکھتا ہے۔ ہمایوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کتابوں کا دل دادہ تھا فوجی مہموں کے دوران بھی وہ ایک منتخب کتب خانہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ کاؤنٹ مایر کے بیان کے مطابق شیر شاہ سوری سے شکست کے بعد جب وہ ایک جائے پناہ کی تلاش میں راہ فرار اختیار کیے ہوئے تھا، اس وقت بھی اس نے اپنے کتب خانے کے مہتمم اور اپنی چند محبوب کتابوں کو اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ جس وقت وہ کھمبات کے مقام پر خیمہ زن تھا، اس وقت بھی اس کے پاس بہت سی کتابیں تھیں، جن میں 'تاریخ تیموری' کا ایک نادر نسخہ بھی تھا۔ ہمایوں کی طبیعت کے ادبی رجحان اور کتابوں سے اس کی دلچسپی کا پتہ اس واقعے سے بھی چلتا ہے کہ اس نے پرانے قلعے میں شیر شاہ کے ذریعے تعمیر کی گئی عمارت شیر منڈل کو دہلی کے تخت پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد کتب خانے میں تبدیل کر دیا، جو اس سے پہلے عیش ونشاط کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اسی عمارت کے زینے سے گر کر ہمایوں کا انتقال بھی ہوا تھا۔

اکبر کو بھی اہل علم اور کتابوں سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے دربار میں وہ علماء سے مختلف موضوعات پر بے تکلف گفتگو کرتا۔ اس نے اپنی پوری زندگی کے دوران مطالعہ جاری رکھا۔ روزانہ ایک شخص اسے کتابیں پڑھ کر سناتا تھا۔ ابوالفضل کا بیان ہے کہ مشکل سے کوئی علمی، ادبی یا تاریخی کتاب باقی رہی ہوگی جسے بادشاہ کو نہ سنایا گیا ہو۔ حکمرانوں کی اس علم اور کتاب دوستی کی وجہ سے مغل عہد میں کتابوں کی ذخیرہ اندوزی اور کتب خانوں کا قیام بڑے پیمانے پر عمل میں آیا۔ مغل دور کا سب سے اہم کتب خانہ شاہی کتب خانہ تھا، جس میں حکمرانوں کی جمع کی گئی کتابیں موجود تھیں۔ اس شاہی کتب خانے کی بنیاد بابر کے عہد میں پڑی اور ہمایوں نے اس کتب خانے کو مزید وسعت دی۔ اکبر کے عہد میں بہت سے دوسرے کتب خانوں کو بھی اس شاہی کتب خانے میں ضم کر دیا گیا۔ مثلاً گجرات کی فتح کے بعد اعتماد خاں گجراتی کا کتب خانہ، جس میں بہت سی اہم اور عمدہ کتابیں تھیں، شاہی کتب خانے میں شامل کر دیا گیا۔ اسی طرح سے جب فیضی کا انتقال ہوا تو اس کا ذاتی کتب خانہ حکومت کے قبضے میں آیا۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق اس میں 4600 کتابیں تھیں۔ ان کتابوں میں سے بہت سی خود مصنّفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں۔ کتابوں کے اس ذخیرے میں مختلف موضوعات پر مبنی کتابیں تھیں، جن میں ادب، لسانیات، طب، فلکیات، نجوم، علم ہندسہ، تفسیر، احادیث، دینیات، فقہ، تصوف اور موسیقی بھی شامل تھیں۔ اس کتب خانے میں کتابوں کو موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اکبر کے جانشینوں نے اس کتب خانے کو سنوارنے کا کام کیا اور مزید کتابوں کا اضافہ کیا۔

مغل عہد میں اس شاہی کتب خانے کے علاوہ شہزادوں، شہزادیوں اور امراء کے اپنے ذاتی کتب خانے بھی تھے۔ مغل شہزادیوں میں سلمٰی سلطانہ اور زیب النساء کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا۔ فیضی کے کتب خانے میں 4600 کتابیں تھیں جسے اس کی وفات کے بعد شاہی کتب خانے میں ضم کر دیا گیا۔ عبدالرحیم خان خاناں کا ذاتی کتب خانہ بھی مغل عہد کے اہم کتب خانوں میں شمار کیا جاتا ہے، جس میں کتابوں اور نوادرات کی دیکھ بھال کے لیے 95 ملازم رکھے گئے تھے۔ مہاراجہ جے سنگھ کا بھی اپنا ایک اہم کتب خانہ تھا، جس کی زیادہ تر کتابیں فلکیات اور نجوم سے متعلق تھیں۔ برنیر نے بنارس یونیورسٹی کے ایک ہال کو کتابوں سے بھرا ہوا دیکھا تھا، جس میں مذہب، فلسفہ، طب اور تاریخ کی کتابیں تھیں۔ مغل دور میں طلبہ کے استعمال کے لیے تمام مدارس کے پاس بھی کتب خانہ ہوتا تھا، جس میں طلبہ کے ضرورت کی تمام کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ مدارس سے متعلق کتب خانوں میں سب سے اہم کتب خانہ مدرسہ فیض صفا کا شمار کیا جاتا ہے، جو اپنی اہمیت وافادیت کے لیے کافی مشہور تھا۔

17.3.5 عورتوں کی تعلیم

عورتوں کی تعلیمی صورت حال تقریباً تاریخ کے تمام ادوار میں یکساں رہی ہے۔ہندوستانی تاریخ کے مغل دور میں بھی عورتوں کی تعلیم کے کچھ بندوبست ضرور کیے گئے تھے، لیکن اگر تنقیدی طور پر مغل تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغل عہد میں زیادہ تر خواتین ابتدائی تعلیم سے آگے نہیں بڑھ پاتی تھیں۔حکمراں اور امراء خاندان کی خواتین کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بارے میں تاریخ سے ضرور کچھ شواہد ملتے ہیں۔خاص طور سے مغل شہزادیوں کے بارے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انھیں عام تعلیم دی گئی تھی۔

بابر کی بیٹی گلبدن بیگم نے 'ہمایوں نامہ' تحریر کیا، جس سے 'اکبرنامہ' کی تکمیل میں مدد ملی۔گرچہ تاریخی شواہد سے کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی، جس سے یہ پتہ چلے کہ اس نے کس طرح کی تعلیم حاصل کی تھی تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عالم خاتون تھی۔تاریخی حوالوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے کتب خانے کے لیے کتابیں جمع کیا کرتی تھی۔سلمیٰ سلطانہ جو ہمایوں کی بہن گل رخ کی بیٹی تھی، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی۔اس نے کئی فارسی نظمیں اور غزلیں 'مخفی' تخلص کے ساتھ لکھی تھیں۔اکبر کی دودھ پلانے والی دایہ ماہم انگا اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ خاتون تھی، اس نے دہلی میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اکبر کے زمانے میں شاہی خاندان کی خواتین کو باقاعدہ تعلیم وتربیت دی جاتی تھی۔فتح پور سیکری میں اکبر نے محل کے کچھ کمرے ان کی تعلیم کے لیے 'درس گاہ خواتین' کے نام سے علیحدہ کر رکھے تھے۔ نورجہاں جو جہاں گیر کی مشہور بیگم ہے، فارسی اور عربی علم وادب میں بڑی دست گاہ رکھتی تھی اور اپنے شوہر کی زندگی میں وہ مملکت کا نظم ونسق بھی چلاتی تھی۔جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتنی ذہین، قابل اور تعلیم یافتہ تھی کہ مملکت کے تمام محکموں کے معاملات کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتی تھی۔ شاہ جہاں کی عزیز بیوی ممتاز محل فارسی زبان میں بہت کامل تھی اور اس زبان میں شعر کہہ سکتی تھی۔شاہ جہاں کی سب سے بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم بھی تعلیم یافتہ تھی اور اس زمانے کے علماء کو انعامات اور وظائف دے کر ان کی ہمت افزائی کیا کرتی تھی۔ستی النساء جو اس عہد کی ایک فاضل خاتون تھی، جہاں آرا بیگم کی استانی تھی۔وہ قرآن کی قاری کے ساتھ ساتھ فارسی میں اچھی مہارت رکھتی تھی۔وہ ممتاز محل کی سکریٹری کے فرائض بھی انجام دیتی تھی۔زیب النساء بیگم جو اورنگ زیب کی لڑکیوں میں سب سے بڑی تھی، نہایت تعلیم یافتہ شہزادی تھی۔وہ علم القرآن میں کامل مہارت رکھتی تھی، فارسی اور عربی خوب جانتی تھی اور فن خطاطی میں بہت اچھی مہارت رکھتی تھی، اس کے یہاں بہت سے علماء، شعراء اور انشاء پرداز ملازم تھے اور اس کے نام سے بے شمار تالیفات وتصنیفات منسوب کی گئی تھیں۔

اوپر بیان کردہ مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مغل عہد میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلے میں غفلت نہیں برتی گئی تھی۔کیوں کہ بعض اوقات انھوں نے ایسی علمی ترقی اور مہارت کا ثبوت دیا جو واقعی قابل داد ہے۔مذکورہ بالا شواہد سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مغل دور کی خواتین تعلیم سے قطعی عاری نہیں ہوسکتیں، جیسا کہ ان کے متعلق عام طور پر فرض کرلیا جاتا ہے۔

17.4 علمی وسائنسی اور تکنیکی ترقی

مغل سلاطین، امراء اور صوبے دار سبھی علم وادب کے بڑے سرپرست تھے اور علم وادب وتعلیم کی سرپرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغل عہد میں بڑے بڑے صاحب کمال عالم اور ادیب پیدا ہونے لگے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس دور میں جس کثرت سے اہل علم پیدا ہوئے، اس کی مثال

ہندوستانی تاریخ میں نہیں ملتی۔اس دور کے علماء میں سب سے اہم شخصیت شیخ احمد سرہندی (1624ء-1564ء) کی ہے۔ان کی پیدائش 1564ء میں سرہند میں ہوئی۔مغل دور میں سرہند ایک اہم شہر تھا۔شیخ احمد کی ابتدائی تعلیم سرہند میں ہوئی،اس کے بعد انھوں نے سیال کوٹ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی،جو اس وقت علم وحکمت کا ایک اہم مرکز تھا۔تکمیل تعلیم کے بعد انھوں نے اصلاح معاشرہ کا بیڑہ اٹھایا اور مسلم معاشرے میں پھیلے بدعات وخرافات کو دور کرنے کی کوشش کی۔شیخ احمد سرہندی کی سب سے پہلی دستیاب تحریر 'رسالہ ردّ روافض' میں شیعہ اعتقاد کی تردید کی کوشش ہے۔شریعت کے سلسلے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کی وجہ سے ان کا ٹکراؤ حکومت وقت سے بھی ہوا،جس کا اظہار اکبر کے انتقال کے بعد ان کے ذریعے لکھے گئے خطوط سے ہوتا ہے۔1600ء میں وہ نقش بندی صوفی خواجہ باقی باللہ کے مرید بن گئے۔ان کے مطابق ایک صوفی کے لیے بھی شریعت کی اسی طرح سے سختی کے ساتھ پابندی ضروری ہے جتنی کسی دوسرے شخص کے لیے۔اس کے ساتھ ہی وہ شریعت میں ہر قسم کی بدعات وخرافات کی مذمت کرتے تھے۔انھوں نے ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کا مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں وحدت الشہود کا نظریہ پیش کیا۔شیخ احمد سرہندی کے ذریعہ صوفیانہ احیاپسندی کے ساتھ ساتھ اسلام کا ایک ایسا تقلیدی نقطۂ نظر بھی سامنے آیا،جس میں امام غزالی سے منسوب شریعت اور طریقت کو یکجا کرنے کی کوشش کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔شیخ احمد سرہندی کو ان کے انھیں اصلاحی کارناموں کی وجہ سے مجدد الف ثانی کا خطاب دیا جاتا ہے۔ان کا انتقال 1624ء کو سرہند میں ہوا۔

مغل دور کی علمی شخصیت میں دوسرا اہم نام شیخ عبدالحق محدث دہلوی (1642ء-1551ء) کا ہے۔وہ مسلم قانون اور شریعت کے موضوع پر بے شمار تحریروں کے مصنف اور حدیث کے مستند عالم تسلیم کیے جاتے تھے۔انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں تقریباً ایک سو سے زیادہ کتابیں اور رسائل تحریر کیے ہیں۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ برصغیر میں علم حدیث کو رواج دینا ہے۔انھوں نے علم حدیث کے موضوع پر بہت سی کتابیں تحریر کیں اور حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ کی شرح لکھی۔ان کی تحریر کردہ 'مدارج النبوۃ' سیرت کے موضوع پر ایک اہم کتاب شمار کی جاتی ہے۔اسی طرح سے ان کی ایک دوسری کتاب 'اخبار الاخیار' ہے،جس میں مسلم ہندوستان کے اولیا اور بزرگوں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ملا عبدالحکیم سیال کوٹی (970ھ-1067ھ/ 1561ء-1656ء) بھی مغل عہد کے اہم علما میں شمار کیے جاتے ہیں۔وہ سیال کوٹ اور آگرے کے مدرسوں میں طلبا کو تعلیم دیتے تھے۔انھوں نے تفسیر،فقہ اور علم کلام کی بہت سی کتابوں پر حاشیے لکھے ہیں۔تفسیر بیضاوی پر ان کے ذریعے لکھا گیا حاشیہ سب سے اچھا اور مقبول مانا جاتا ہے۔صدیوں تک ان کی کتابیں ہندوستان،مصر اور ترکی کی درس گاہوں کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔قاضی محبّ اللہ بہاری (وفات 1119ھ/ 1707ء) اورنگ آباد کے عہد میں لکھنؤ کے قاضی تھے۔اصول فقہ اور منطق کے اہم عالموں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔اصول فقہ کے موضوع پر ان کی کتاب 'مسلم الثبوت' اور منطق میں 'مسلم العلوم' کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔ مغل سلطنت کے علماء و مصلحین میں سب سے اہم نام شاہ ولی اللہ (1114ھ-1176ھ/ 1703ء-1763ء) کا ہے۔ان کا تعلق مغل سلطنت کے عہد زوال سے ہے۔اسی وجہ سے انھوں نے اپنی تصنیف وتالیف میں اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور ان کے اندر کی اخلاقی خرابیاں دور ہوں۔انھوں نے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لیے بادشاہوں اور امراء سے خط وکتابت بھی کی۔دہلی پر احمد شاہ ابدالی کا حملہ انھیں کے ایک خط کی تحریک پر ہوا تھا،جس میں پانی پت کی جنگ میں اس نے مراٹھوں کو شکست دی تھی۔شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاح کے کام بھی بڑے پیمانے پر کیے۔مسلمانوں میں معاشرتی اثرات کے پیش نظر بیوہ عورتوں کی شادی کو معیوب سمجھا جانے لگا تھا،انھوں نے اس رسم کی کھل کر مخالفت کی۔اسی طرح سے انھوں نے نکاح میں بڑے بڑے مہر باندھنے اور خوشی وغم کے موقعے پر لوگوں کو فضول خرچی سے

روکا۔ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کوختم کرنے کی کوشش کی اوراس بات پر زور دیا کہ اختلاف کی صورت میں انتہاپسندی کے بجائے اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے۔شاہ ولی اللہ کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔قرآن مجید کے فارسی ترجمے کے علاوہ وہ تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ اور تصوف پر مختلف کتابوں کے مصنف ہیں۔اپنی ان تصانیف کی وجہ سے وہ امام غزالی، امام ابن حزم اور امام ابن تیمیہ کی طرح تاریخ اسلام کے بڑے علماء اور مصنّفین میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی سب سے مشہور کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' ہے۔شاہ ولی اللہ کی طرح ان کی اولاد میں بھی بڑے بڑے عالم اور مصلح پیدا ہوئے، جنھوں نے ہندوستانی عوام کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

شاہ ولی اللہ کے بڑے بیٹے شاہ عبدالعزیز (1159ھ-1239ھ/ 1746ء-1823ء) عربی اور فارسی کے بڑے انشا پرداز اور عالم تھے۔ہندوستان میں تقریباً ساٹھ سال تک وہ دینی علوم اور احادیث کی تعلیم دیتے رہے۔شاہ ولی اللہ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدین (1163ھ-1233ھ/ 1750ء-1818ء) نے پہلی مرتبہ اردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ خدا کے کلام کو سمجھ سکیں۔شاہ ولی اللہ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادر (1167ھ-1230ھ/ 1754ء-1815ء) کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کی اردو تفسیر ہے۔یہ تفسیر 'موضح القرآن' کے نام سے مشہور ہے۔یہ تفسیر اتنی مقبول ہوئی کہ آج تک بہت سے قرآن مجید کے حاشیوں پر اس کو شائع کیا جاتا ہے۔شاہ ولی اللہ کی اولاد میں شاہ اسمٰعیل شہید (1193ھ-1246ھ/ 1779ء-1831ء) کا مقام بھی بہت بلند ہے۔وہ شاہ ولی اللہ کے چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی کی اولاد تھے۔شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کی اصلاح اور قرآن وحدیث کی تعلیم عام کرنے کا جو کام شروع کیا تھا، اس کو سب سے زیادہ ترقی شاہ اسمٰعیل نے دی۔اسی وجہ سے وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالموں میں شمار ہوتے ہیں۔ان کی کتابوں میں اردو میں لکھی گئی 'تقویۃ الایمان' سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔اس مختصری کتاب میں انھوں نے مسلمانوں کی زندگی میں پائی جانے والی بدعتوں اور خرافات کی نشان دہی کی ہے۔اس کتاب نے برصغیر کے مسلمانوں کے عقیدے اور عمل کی اصلاح میں وہی کام کیا جو عرب میں محمد بن عبدالوہاب کی کتاب 'کتاب التوحید' اور نائیجیریا و مغربی افریقہ میں عثمان دان فودیو کی 'احیاء السنۃ' نے کیا۔ان کی دوسری کتابوں میں فارسی میں لکھی گئی 'منصب امامت' اور 'عبقات' بہت اہم ہیں۔شاہ اسمٰعیل نے اپنے ایک ساتھی مولانا عبدالحئی کے ساتھ مل کر سید احمد شہید کے اقوال و ارشادات بھی فارسی زبان میں 'صراط مستقیم' کے نام سے مرتب کیے۔اس کتاب میں ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کر کے ان کو دور کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔مغل سلطنت کے دور زوال کی آخری بڑی علمی اور عملی شخصیت سید احمد شہید (1201ھ-1246ھ/ 1786ء-1831ء) کی ہے۔یہ شاہ عبدالعزیز کے شاگرد تھے۔ سید احمد شہید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے زوال کی ایک بڑی وجہ ان کا اسلامی تعلیمات خصوصاً جہاد کی طرف سے غافل ہونا ہے، جس کی وجہ سے ان کے اندر مختلف طرح کی اخلاقی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔انھوں نے مسلم معاشرے کی اصلاح کی کوشش کی اور اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے تحریک جہاد کی بنیا ڈالی، جسے تاریخ میں 'تحریک شہیدین' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

دینی علوم کے بعد مغل دور میں سب سے اہم کتابیں تاریخ کے موضوع پر لکھی گئیں۔دینی علوم پر لکھی جانے والی کتابیں عام طور پر عربی زبان میں تھیں، لیکن تاریخ کے موضوع پر کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئیں۔مغل دور کے تاریخ نگاروں میں ابوالفضل (1551ء-1602ء) کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔ابوالفضل اکبر کا وزیر تھا، اس نے 'اکبرنامہ' اور 'آئین اکبری' کے نام سے اس دور کی دو تاریخ کی کتابیں تحریر کی

ہیں۔ان کتابوں میں مغلوں کے انتظام حکومت اور صوبوں کے تذکرے کے ساتھ ہندوستانی ثقافت اور علوم وفنون کا بیان ملتا ہے۔سترہویں صدی عیسوی میں 'اکبرنامہ' کے طرز پر اور بھی کئی دوسری کتابیں تیار کی گئیں، جن میں قابل ذکر عبدالحمید لاہوری اور محمد وارث کی لکھی ہوئی سرکاری تاریخیں ہیں جنھیں 'بادشاہ نامہ' کے عنوان سے یاد رکھا گیا ہے۔اسی طرح اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی دس برسوں کے دوران لکھی گئی محمد کاظم کی 'عالم گیرنامہ' ہے۔سترہویں صدی میں لکھی گئی ان کتابوں میں تفصیلات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، جغرافیائی حالات اور واقعات کے تسلسل کو نہایت صحت کے ساتھ درج کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں، لیکن پھر بھی وہ بنیادی طور پر کسی سرکاری گزٹ سے زیادہ مشابہ ہیں۔ان کا 'اکبرنامہ' سے کوئی مقابلہ نہیں ہے، گرچہ 'اکبرنامہ' میں بھی اکبر کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کرنے کی کوشش ملتی ہے لیکن زیادہ اہم وہ فلسفیانہ اور نظریاتی بیان ہے جو اس کتاب میں جاری وساری ملتا ہے۔جہاں تک 'آئین اکبری' کا تعلق ہے، اس قسم کی دوسری کتاب کبھی نہیں لکھی جاسکی۔ابوالفضل کے بعد کسی نے بھی سائنس، اعداد وشمار، جغرافیہ اور ثقافت میں اس طرح کی دلچسپی نہیں دکھائی۔

تاریخ نویسی کے میدان میں بابر کی 'تزک' کے ساتھ ایک نئی صنف وجود میں آگئی۔یہ کتاب ابتداً چغتائی ترکی میں تالیف کی گئی تھی، لیکن عبدالرحیم خان خاناں کے فارسی میں لفظی ترجمہ کے بعد اس کا شمار فارسی تحریروں میں ہونے لگا۔جہاں گیر کی 'تزک' بھی 'بابرنامہ' کی طرح نہایت سادہ طرز میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں بابر کی سی صاف گوئی کے ساتھ فنون اور فطرت میں بھی دلچسپی دکھائی دیتی ہے، لیکن اس میں ڈرامائی عنصر مفقود ہے، جو بابر کی جاں بازی سے عبارت واقعات کے بیان کی وجہ سے اس کی 'تزک' میں پیدا ہوگیا ہے۔مختلف علاقوں کی تفصیلی تاریخیں تاریخی ادب میں ایک نیا اضافہ ہیں، جو اس زمانے میں لکھی جانا شروع ہوئیں۔ان میں میر معصوم کی لکھی ہوئی 'سندھ کی تاریخ' اور علی محمد خان کی 'تاریخ گجرات' کافی اہم ہیں۔اسی عہد میں ہندوستان میں مجموعی تاریخوں کے لکھنے کا چلن بھی شروع ہوا اور نظام الدین احمد کی 'طبقات اکبری' اس قسم کی کتابوں کے لیے رہنما ثابت ہوئی۔محمد قاسم فرشتہ کی 'گلشن ابرار' کو نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کیے گئے ماخذ کی مدد سے تیار کیا گیا۔تاریخی ادب میں اس کتاب کو بڑی شہرت ملی۔عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' کو بھی اسی زمرے میں شامل کیا جائے گا۔بدایونی کی یہ کتاب اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔زبان کی سلاست، دلچسپ انداز بیان، ناقدانہ نقطۂ نظر اور معلومات کی کثرت کے لحاظ سے ضیاءالدین برنی کی 'تاریخ فیروزشاہی' کے علاوہ عہد وسطیٰ کی کوئی تاریخ کی کتاب اس کے مقابلے میں پیش نہیں کی جاسکتی۔یہ کتاب اکبر کی پالیسیوں کی تیز طرار تنقید کے لیے بھی مشہور ہے۔اس دور کی علمی وادبی تاریخ کے لیے یہ ایک بہترین ماخذ ہے۔کتاب کے تین حصے ہیں، پہلے حصے میں محمود غزنوی سے اکبر کے عہد تک کا تذکرہ ہے، دوسرے حصے میں اکبر کے عہد کی تفصیلی تاریخ بیان کی گئی ہے اور تیسرے حصے میں اس عہد کے امراء، علماء ادیبوں اور شاعروں کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔دورِ زوال کے ممتاز مورخوں میں محمد ہاشم خوافی خاں (1733ء-1664ء) کا نام کافی اہم ہے۔انھوں نے 'منتخب اللباب' کے نام سے ہندوستان میں مغلوں کی ایک مفصل اور مستند تاریخ لکھی ہے، جس میں بابر سے محمد شاہ کے عہد تک کی تاریخ درج ہے۔یہ کتاب مغلوں کے دورِ زوال کی تاریخ کا بہترین ماخذ ہے اور مسلم ہندوستان میں لکھی جانے والی چند اچھی تاریخی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔مغل عہد کی تاریخ نگاری میں تذکرہ نگاری کی صنف بھی موجود ہے اور اس قسم کا سب سے اہم تذکرہ شاہنواز خاں کی تصنیف 'مآثرالامراء' ہے۔اس کتاب میں مغل امراء کی سوانح درج کی گئی ہے۔اس کتاب کی ابتداء 1742ء میں ہوئی اور مصنف کے انتقال کے کافی عرصے بعد یعنی 1780ء میں اختتام کو پہنچی۔اس کتاب کے آخری حصے کو پورا کرنے میں آزاد بلگرامی اور عبدالحئی نے ہاتھ بٹایا۔

اس دور کی ایک اہم تصنیف 'دبستان مذاہب' ہے جس کے مصنف کا نام وثوق کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اس کتاب کو علم تقابل ادیان کی ایک بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف مذاہب کی تعلیمات، عقائد اور رسوم ورواج کو خاصی غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ہندو مذہب اس کے مختلف فرقوں اور سکھوں کے عقائد سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسلم فرقوں اور دین الہٰی کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ مغل دور میں جغرافیہ کے میدان میں اس طرح سے دلچسپی نہیں لی گئی اور نہ ہی بڑے پیانے پر کارنامے انجام دیے گئے، جس طرح دینی اور تاریخی کتب کی تصنیف میں دلچسپی لی گئی۔ لیکن پھر بھی مختلف کتابوں میں ملک کے مختلف حصوں کے جغرافیائی حالات کا تذکرہ ضرور ملتا ہے۔ خاص طور پر تاریخی کتابوں میں جغرافیہ پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ جغرافیہ میں ابوالفضل کی گہری دلچسپی کا اندازہ مغل سلطنت کے صوبوں کی ان تفصیلات سے لگایا جاسکتا ہے جو 'آئین اکبری' میں درج ہیں۔ اسی طرح 'تزک بابری' میں بھی مختلف علاقوں کے جغرافیائی حالات کا تذکرہ ملتا ہے۔

سولھویں صدی کے آنے تک عربی ترجموں کے ذریعے یونانی تحریروں کی شناسائی کا دائرہ خاصہ محدود ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود ابوالفضل کا دعویٰ ہے کہ وہ قدیم تحریروں سے واقفیت رکھتا تھا۔ ٹامس رو نے 1616ء میں یہ تسلیم کیا تھا کہ مغل دربار کے مسلمان عالم فلسفہ اور ریاضی میں درک رکھتے ہیں۔ ان میں مشہور منجم ہیں اور ارسطو، اقلیدس، ابن سینا اور دوسرے مشہور مصنفوں کے بارے میں گفتگو کر سکتے ہیں، اسی وجہ سے اس دور میں سائنسی طرز فکر کو بڑھاوا ملا تھا۔ مغل دور کے فلسفیوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کا نام کافی اہم ہے۔ وہ قرآنی علوم کے عالم کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ایک فاضل فلسفی بھی تھے، ہندوستان میں ملا صدرا کو متعارف کرانے کا سہرا بھی انھیں کے سر جاتا ہے، انھیں 'فاضل سیالکوٹی' اور 'فاضل لاہوری' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

مغل دور کے فلسفیوں میں ملا محمود جونپوری (1062ھ-993ھ/ 1652ء-1585ء) کا نام بھی کافی اہم ہے۔ انھیں طبعی فلسفے کے ساتھ ساتھ علم فلکیات میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ طبعی فلسفے اور منطق پر ان کی بہت سی کتابیں شمار کی جاتی ہیں، جن میں سب سے مشہور کتاب 'شمس بازغہ' ہے۔ اپنی اس کتاب میں انھوں نے کائنات کی تخلیق کے بارے میں ایرانی فلسفی میر داماد کے 'حدوث دہری' کے نظریے کی تردید کی ہے۔ اپنی کتاب میں وہ فلکیات سے متعلق بطلیموسی نظریے پر بھی شکوک ظاہر کرتے ہیں۔ چاند پر نظر آنے والے دھبے کے بارے میں مختلف افکار و خیالات کا جائزہ لے کر ان کی تردید کی ہے اور پھر اپنا نظریہ پیش کیا ہے کہ چاند کے بہت سے چھوٹے چھوٹے مقامات ایسے ہیں، جہاں سورج کی روشنی نہیں پڑتی، اس لیے وہ دھبے کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں لکھی گئی یہ کتاب اپنی سلاست کی وجہ سے فلسفہ کی شاہ کار کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ شیخ محب اللہ الہ آبادی (1648ء-1587ء) کا نام بھی مغل دور کے علماء، صوفیاء اور فلسفیوں میں کافی اہم شمار کیا جاتا ہے۔ وہ شیخ فریدالدین گنج شکر کے خلیفہ اور مغل عہد کے مشہور صوفی عالم ہیں، ان کی زیادہ تر تحریریں متصوفانہ فلسفے سے متعلق ہیں۔ شیخ محب اللہ نے ابن عربی کے نظریات بالخصوص نظریے وحدت الوجود کی اس شدت سے حمایت کی کہ انھیں مسلم ہندوستان کا ابن عربی کہا جانے لگا۔ ان کا ماننا ہے کہ ابن عربی کی تحریروں کی ادبی اور مابعد الطبیعیاتی تشریح نہیں کی جاسکتی۔ اپنے انھیں متصوفانہ افکار و نظریات کی وجہ سے وہ بہت سے علماء خاص طور پر ملا محمود جونپوری اور ان کے متبعین کی تنقید کا شکار بھی ہوئے۔ شیخ محب اللہ کی موجود تحریروں میں: شرح فصوص الحکم، عبادۃ الخواص، ہفت احکام، غایۃ الغایات، تسویۃ، مفتاح العاشقین، ترجمۃ الکتاب اور 'انفاس الخواص' کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔ میر محمد زاہد الہروی (وفات

1101ھ/ 1689ء) مغل عہد میں فلسفہ، منطق اور علم کلام کے اہم عالموں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ اورنگ زیب کے عہد میں محتسب کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے علم کلام میں شریف جرجانی کی مشہور کتاب 'شرح مواقف' اور منطق کی دوسری کتابوں پر جو حاشیے لکھے ہیں وہ ان کتابوں پر سب سے اچھے حاشیے تصور کیے جاتے ہیں۔

مغل دور میں علوم ریاضی اور فلکیات پر خصوصی توجہ دی گئی۔ 1587 میں بھاسکر آچاریہ کی مشہور کتاب 'لیلاوتی' کا اکبر کے درباری شاعر ابوالفیض فیضی نے فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ ایک ایرانی تارک وطن فتح اللہ شیرازی (وفات 1588ء) کی مغل دربار میں بڑی پذیرائی ہوئی، کیوں کہ وہ ریاضی اور فلکیات میں دست رس رکھتا تھا۔ حکیم فتح اللہ نے حکومت کے حکم پر ایک صحیح نظام تقویم یا الٰہی کلنڈر تیار کیا، جسے 1584ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے سرکاری کلنڈر قرار دیا گیا۔ فتح اللہ نے کئی تکنیکی آلات بھی ایجاد کیے تھے، جن میں سے بعض کو ابوالفضل نے اکبر کی طرف منسوب کیا ہے۔ 35-1634ء میں شاہ جہاں کی زیر سرپرستی عطاء اللہ رشدی نے الجبرا پر بھاسکر آچاریہ کی کتاب 'بیج گنت' کا ترجمہ کیا۔ ایک دوسرا قابل ذکر کام صادق اصفہانی کا اٹلس تھا، جو اس نے 1647ء میں جون پور میں تیار کیا تھا۔ اس اٹلس میں کل 33 نقشے ہیں، جو مشرقی نصف الارض پر مشتمل ہیں، ان نقشوں کو بطلیموسی اصولوں کے مطابق بنایا گیا ہے۔

مغل دربار سے متعلق ایک اہم امیر اور آمیر کے راجہ سوائی جے سنگھ (وفات 1743ء) کی فلکیات کے میدان میں کارگزاریاں ہندوستانی سائنس کے ایک روشن پہلو کی نشان دہی کرتی ہیں۔ انھوں نے جے پور، دہلی، اجین، متھرا اور بنارس میں رصدگاہیں تعمیر کیں، جن میں اینٹ اور چونے کی مدد سے بڑے بڑے آلات تعمیر کیے گئے تھے۔ ان آلات کی تعمیر میں جے سنگھ کے سامنے پندرہویں صدی عیسوی میں سمرقند میں تیموری حکمراں الغ بیگ کے ذریعے بنوائے ہوئے آلات کی مثال تھی۔ اینٹ اور گارے کے ان آلات کی تعمیر کے پیچھے جواز یہ تھا کہ لکڑی اور لوہے کے بنے ہوئے چھوٹے آلات مثلاً اصطرلاب میں غلطی کا امکان زیادہ رہ جاتا ہے۔ جے سنگھ کو فلکیات سے متعلق یورپی مشاہدات کی صحت کے بارے میں علم ہوا تو اس نے ڈی لاہیر (de La Hire) کے مشاہدات کا ریکارڈ حاصل کرلیا اور اس کی مدد سے انھوں نے انعطاف (Refraction) کا جدول تیار کرلیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ان کی تحقیق کے نتائج ڈی لاہیر کے ریکارڈ سے زیادہ درست ہیں۔ جے سنگھ کے ماہرین فلکیات نے ایک یورپی دوربین کی مدد سے زہرا کا اس حالت میں مشاہدہ کیا جب وہ چاند کی روشن سمت میں ہوتا ہے۔ ان مشاہدات کے نتائج ان کی اہم کتاب 'زیج محمد شاہی' میں بیان کیے گئے ہیں۔ عام طور پر جے سنگھ نے مسلم فلکیات سے ہی استفادہ کیا تھا، لیکن ان کے کاموں کے ذریعے مسلم فلکیات کی اطلاعات سنسکرت زبان میں بھی منتقل ہوئیں۔ اس بات کا اندازہ ان سنسکرت ناموں سے لگایا جاسکتا ہے، جو انھوں نے اپنی رصدگاہوں کے آلات کو دیے تھے۔

مغل دور میں طبی سہولیات بھی بڑی منظم تھیں اور بڑے پیمانے پر ان کو رواج دینے کی کوشش بھی کی گئی۔ دارالسلطنت اور ملک کے تمام بڑے شہروں میں باتنخواہ ملازمین کے ساتھ مستقل شفاخانے قائم تھے۔ تاریخی حوالوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ بابر کو طب کے فن میں دلچسپی تھی اور اس کے دربار میں طبیبوں کی ایک بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ بابر کے امراء میں میر خلیفہ نامی ایک امیر اپنے عہد کا ایک اہم دانشور اور ماہر طبیب تھا۔ اسی طرح امیر ابوالبقا بھی بابر کا طبیب تھا۔ بابر اور ہمایوں کے عہد کے اہم اطباء میں یوسف بن محمد بن یوسف کا نام کافی اہم ہے، جسے طب کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل تھی۔ اسے طب یونانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی طریقہ علاج میں بھی کمال حاصل تھا۔ طب سے متعلق

اس کی کتابوں میں 'جامع الفوائد، فوائد الاخیار'، 'طب یوسفی' اور 'علاج الامراض' کافی اہم ہیں۔ان کتابوں کے علاوہ اس نے اپنی شاعری کے نمونوں میں بھی حفظان صحت سے متعلق باتیں کیں ہیں، جن میں 'قصیدۃ فی حفظ الصحہ' اور 'ریاض الادویۃ' کو اہم شمار کیا جاتا ہے۔ہمایوں کے عہد میں طب سے متعلق کوئی قابل ذکر کام انجام نہیں دیا گیا۔اس کی سب سے اہم وجہ اس عہد کی سیاسی افراتفری کو شمار کیا جا سکتا ہے لیکن ہمایوں کے دور حکومت کے آخری سالوں میں بہت سے اطباء نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور انھوں نے بعد کے ادوار میں ہندوستان کی طبی تاریخ میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔اکبر کا عہد مغل تاریخ میں طبی ترقیات کے اعتبار سے سنہرا دور شمار کیا جا سکتا ہے۔ابوالفضل نے مسلم اور غیر مسلم طبیبوں کی فہرست دی ہے جنھیں سرکاری خزانے سے تنخواہ دی جاتی تھی اور ان میں سے کچھ کو منصب بھی عطا کیا گیا تھا۔اکبر کے عہد میں سرکاری شفاخانوں کے علاوہ طبیبوں کے اپنے ذاتی مطب بھی ہوا کرتے تھے، جو بنا کسی بھید بھاؤ کے ہمیشہ عوام الناس کی خدمت کے لیے کھلے رہتے تھے۔پروفیسر شری رام شرما کا بیان ہے کہ اس عہد میں کوی چندرا، ودیا راجہ، ٹوڈرمل اور نیل کنٹھ نے طب کے موضوع پر اپنی تحریریں مرتب کیں۔بلاشبہ اس عہد کے اطباء میں حکیم علی حسین گیلانی کا نام سب سے نمایاں ہے۔انھوں نے طب کے موضوع پر ابن سینا کی مشہور کتاب 'القانون' کی شرح لکھی جو 'قانون' کی سب سے اچھی شرح شمار کی جاتی ہے۔ساتھ ہی انھوں نے اپنے طبی تجربات کو ایک کتاب کی شکل میں مدون کیا جو 'مجربات علی گیلانی' کے نام سے مشہور ہے۔اس عہد کے اطباء میں حکیم مسیح الدین ابوالفتح گیلانی (وفات 997ھ/ 1589ء) کا نام بھی کافی اہم ہے۔وہ اکبر کے دربار میں اہم منصب پر فائز تھے۔انھوں نے 'فتاحی' کے نام سے طب کے موضوع پر ایک کتاب لکھی، ساتھ ہی 'قیاسیۃ' کے نام سے 'اخلاق ناصری' کی شرح لکھی۔ان کے دو بھائی حکیم نجیب الدین ہمایوں اور حکیم نورالدین قراری بھی اس عہد کے اطباء میں شمار ہوتے ہیں۔دور اکبری کے طبیبوں میں مظفر بن محمد الحسینی الشفائی، جن کا اصل نام حکیم شرف الدین حسن تھا، کا نام بھی کافی اہم ہے۔وہ ایرانی صفوی حکمراں شاہ عباس صفوی کے عہد کے مشہور دوا ساز شمار کیے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنی دوسری تحریروں کے علاوہ 1556ء میں 'طب شفائی' کے نام سے علم الادویہ کی ایک کتاب بھی ترتیب دی تھی، اس کتاب میں ادویہ کو ابجد کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا تھا۔ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ انھوں نے اصفہان کب چھوڑا اور ہندوستان کب آئے؟ ساتھ ہی اس کے پیچھے وجوہات کیا تھیں؟ لیکن اکبر کے درباری طبیبوں کی فہرست میں ابوالفضل نے ان کا نام شامل کیا ہے۔

حکمراں بننے کے بعد جہاں گیر نے جو فرامین جاری کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ ''ہر بڑے شہر میں شفاخانے قائم کیے جائیں، بیماروں کے علاج کے لیے ان میں طبیبوں کی تعیناتی کی جائے اور تمام اخراجات سرکاری خزانے سے ادا کیے جائیں۔'' اسی طرح اس نے اپنی تزک میں، جو اس نے تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد یعنی 27-1605ء کے درمیان لکھی تھی، نباتات، جانوروں اور طب سے متعلق بہت سے مشاہدات درج کیے ہیں، جن کی بنا پر اسے نیچر اور طب کے ایک واقف کار کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔اس عہد کے اطباء میں حکیم روح اللہ کافی نمایاں شمار کیے جاتے ہیں، جن کا تذکرہ جہاں گیر نے اپنی تزک میں بھی کیا ہے۔عہد جہاں گیر میں طبی تصنیفات مدون کرنے میں مہابت خاں کے بیٹے حکیم امان اللہ نے کافی اہم کردار ادا کیا، انھوں نے 'گنج باد آورد' کے نام سے مفرد اور مرکب ادویہ پر ایک مبسوط تحریر ترتیب دی۔یہ کتاب ادویہ سازی کا انسائیکلوپیڈیا شمار کی جاتی ہے، جس میں مفرد ادویہ کے ساتھ ساتھ مرکب ادویہ سازی کے طریقے اور مشہور و معروف اطباء کے تجربات و مشاہدات بھی درج کیے گئے ہیں۔اس کے علاوہ ان کی دوسری تحریروں میں 'ام العلاج' اور 'دستور الہند' ہیں۔آخر الذکر کتاب 'مدن نبد نامی' ایک سنسکرت تحریر کا فارسی ترجمہ ہے۔

عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے اپنے پیش روؤں کی طرح شاہ جہاں بھی کوشاں رہا۔ اس کے عہد میں ملک کے طول و عرض میں شفا خانے قائم کیے گئے۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف کے مطابق دہلی کی جامع مسجد کے پاس عوام الناس کو طبی سہولیات فراہم کرنے کے لیے ایک بڑا شفا خانہ قائم کیا گیا اور اس میں ملک کے باصلاحیت اور مشہور طبیبوں کی تعیناتی کی گئی۔ ہندوستان میں مغل دربار نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایران سے آنے والے دانشوروں، سائنس دانوں اور طبیبوں کو پناہ دی۔ ان میں سے ایک اہم نام حکیم عین الملک شیرازی کا ہے جو دارا شکوہ کے ذاتی طبیب تھے۔ وہ ایک مشہور ماہر امراض چشم تھے اور ساتھ ہی جراحی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ ان کی ایک اہم تصنیف 'الفاظ الادویۃ' ہے، جو انھوں نے 29-1628ء میں شاہ جہاں کے لیے لکھی تھی۔ ان کی سب سے اہم تصنیف 'طب دارا شکوہی' ہے۔ مورخین کے بیان کے مطابق اس کتاب میں جراحی کا بمشکل ہی تذکرہ کیا گیا ہے، یہاں تک کہ موتیابند کا علاج بھی دواؤں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ آتشک کے مرض کے لیے ایک باب مخصوص کیا گیا ہے اور اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر مرض کے پیدا ہونے کی وجوہات اور ظاہر ہونے کی علامات کے تذکرے کے بعد مصنف نے اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات بیان کیے ہیں اور پھر اس کا علاج بتایا ہے۔ 'بادشاہ نامہ' کے مصنف کے مطابق اس عہد کے دوسرے اہم طبیب حکیم میر محمد ہاشم تھے، جنھیں شاہ جہاں نے احمد آباد کے شفا خانے کا منتظم اور نگران اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ اورنگ زیب نے انھیں اپنے عہد میں تین ہزاری منصب سے نوازا اور 'مسیح الزماں خان بہادر' کا خطاب عطا کیا۔ اس عہد کے اطباء میں حکیم محمد داؤد تقرب خاں کا نام بھی اہم ہے۔ ایک مرتبہ بادشاہ کو خود پیشاب رکنے کا مرض لاحق ہوا اور علاج کے ساتھ ساتھ مرض میں قبض کا بھی اضافہ ہو گیا۔ بہت سے طبیبوں نے علاج کیا مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، جب حکیم تقرب خاں نے علاج شروع کیا تو انھوں نے نسخے میں 'شیر خشت' کا اضافہ کیا۔ بادشاہ کو اس سے بڑا افاقہ ہوا اور مرض جاتا رہا۔ شاہ جہاں کا عہد اس لحاظ سے بھی قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں ستی النساء خانم نامی ایک ممتاز خاتون طبیبہ تھی۔ وہ شاہی محل کی عورتوں کا علاج کیا کرتی تھی اور ساتھ ہی ایک مثالی نرس بھی تھی۔

اورنگ زیب کے عہد میں بھی دارالسلطنت اور دور دراز کے شہروں میں مریضوں کے علاج کے لیے شفا خانے قائم کیے گئے۔ ملک کے مال دار اور صاحب حیثیت لوگوں نے بھی اپنے ذاتی خرچ پر شفا خانے قائم کیے۔ مثال کے طور پر نواب خیر اندیش خاں نے اٹاوہ میں ایک اچھا شفا خانہ قائم کیا، جو خود بھی ایک تجربہ کار طبیب اور صاحب طرز مصنف تھے۔ انھوں نے 'خیر التجارب' کے نام سے طب کی ایک کتاب بھی تحریر کی۔ اس شفا خانے میں یونانی اور ہندوستانی دونوں طرح کے طریقۂ علاج اپنائے گئے تھے۔ اس شفا خانے کے اطباء میں عبدالرزاق نیشاپوری، عبدالماجد اصفہانی، مرزا محمد علی بخاری، محمد عادل، محمد اعظم، کنول نین، سکھانند اور نین سکھ کا نام شمار کیا جاتا ہے۔ اورنگ زیب کے دور کے اطباء میں محمد اکبر ارزانی کا نام بھی اہم ہے۔ وہ فارسی زبان میں بہت سی طبی کتابوں کے مصنف شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی طبی تحریروں میں 'طب اکبر، میزانِ طب، طب نبوی، مفرح القلوب، قرابادین قادری، مجربات اکبری، حدود الامراض' اور 'طب ہندی' اہم ہیں۔ اسی عہد میں حکیم محمد رضا شیرازی نے 'تحفۃ الاطباء' اور 'ریاض عالم گیری' نام سے دو کتابیں تحریر کیں۔ اس عہد کے اطباء میں محمد مہدی کا نام بھی اہم ہے، جنھوں نے شہزادے محمد اعظم کا علاج کیا اور 'حکیم الملک' کے خطاب سے نوازے گئے۔ اورنگ زیب کا عہد مغل تاریخ میں طبی ترقیات کے اعتبار سے بہت اہم دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد میں نہ صرف اہم کتابیں تصنیف کی گئیں بلکہ دوسری زبانوں سے اہم طبی کتابوں کے فارسی میں ترجمے بھی کیے گئے۔

محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی میں ایک بڑا شفا خانہ واقع تھا، جس کے مہتمم اعلیٰ حکیم قوام الدین تھے، اس شفا خانے کا سالانہ خرچ تین لاکھ روپیہ تھا۔ مرزا محمد ہاشم خان علوی اس عہد کے اہم اطباء میں شمار ہوتے تھے، جنھیں محمد شاہ کے ذریعے 'معتمد الملک' کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ حکیم ہاشم خاں نے بہت سی طبی تحریریں چھوڑیں، جن میں 'کتاب البنت، جامع الجوامع، خلاصۃ التجارب، مطب علوی خان، تحفۂ محمد شاہی، احوال عضو النفس' اور 'خلاصۂ قوانین علاج' اہم ہیں۔ ان تحریروں میں 'جامع الجوامع' سب سے اہم ہے، جو طب کے تمام شعبوں پر محیط ہے۔ اس کتاب کو وہ اپنی زندگی میں مکمل نہیں کر سکے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے خاندان کے ایک دوسرے شخص محمد حسین خاں نے اس کی تکمیل کی۔ احمد شاہ کے دور حکومت میں حکیم اسکندر نے 'قرابا دین حکیم اسکندر' کے نام سے ان شاہی اور لاطینی طبی اصطلاحات کا ایک فرہنگ تیار کیا جو عہد وسطیٰ سے ان کے عہد تک مغرب میں استعمال ہوتے تھے۔ حکیم محمد شریف خان کا نام شاہ عالم دوم کے دور کے اہم اطباء میں شمار کیا جاتا ہے۔ بادشاہ نے انھیں اپنا درباری طبیب متعین کیا تھا اور انھیں 'اشرف الحکماء' کے خطاب سے نوازا تھا۔ انھوں نے طب کے موضوع پر 'علاج الامراض، تالیف شریفی، علاج نافعہ، حاشیۂ نفیسی، تحفۂ عالم شاہی اور شرح حمیات قانون' نامی کتابیں تحریر کیں۔ اودھ کے حکیم شفائی خان ارشد بھی اس عہد کے نامور اطباء میں شمار ہوتے ہیں، جو حکیم شریف خاں کے ہم عصر تھے۔ انھوں نے 'شفاء الجمیل' نامی ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔ ہندوستانی طبی تحقیق میں ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کے ذریعے تیار کی گئی ایک دوا ہے جو خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا کے نام سے مشہور ہے، ان کے ذریعے تیار کیا گیا یہ 'خمیرۂ دل' کے امراض میں بڑا مفید ہے۔

مغل دور حکومت میں جس طرح علمی و تعلیمی اور سائنسی ترقی پر زور دیا گیا اسی طرح سے تکنیکی و میکانکی ترقی اور آلات و مشینوں کے اختراع پر خصوصی توجہ صرف کی گئی۔ سولھویں صدی عیسوی کے ابتدائی عہد میں بابر نے پانی نکالنے کے ایک طریقے کا ذکر کیا، جس میں کیل دار پہیوں پر مشتمل گراری کام کرتی تھی۔ ہندوستان میں اسے 'پرشین وہیل' کہا گیا اور تکنیکی تاریخ کے ماہر اسے 'ساقیہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ مغل عہد کے کئی مصوروں نے ساقیہ کی تصویر بنائی ہے۔ اس مشین کی ایجاد کا سہرا درباری مورخ نے اکبر کے سر باندھا ہے لیکن ان میں سے بعض یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مشین فتح اللہ شیرازی کی اختراع تھی۔ اکبر کے عہد کی ایجادات میں وہ مشین بھی شامل ہے، جس کی مدد سے توپوں کی نالیوں کو اندر سے ہموار کیا جاتا تھا، اس کے علاوہ ایک ہوائی چکی بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ اسی طرح پانی نکالنے کا وہ پیچیدہ نظام بھی ہے جو فتح پور میں لگایا گیا تھا۔ اس میں کئی گراری دار پہیوں کی مدد سے پانی اوپر پہنچایا جاتا تھا۔ اکبر کے نام پہ بھی منسوب کیا گیا ہے کہ اس نے شورے کی مدد سے پانی کو ٹھنڈا کرنے کی ترکیب ایجاد کی، جو اس کے بعد ہندوستان میں بہت عام ہوگئی۔ اکبر کے اسلحہ خانہ میں ایک بندوق بنائی گئی جو ابوالفضل کے مطابق خود بادشاہ کی کارآگہی کا ثبوت تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ حکیم فتح اللہ شیرازی نے ایک ایسی بندوق بنائی جو یکے بعد دیگرے بارہ گولیاں چلا سکتی تھی۔ وہ مغل دور کے بہت اہم ماہر طبیعیات شمار کیے جاتے ہیں۔ مغل دور میں کئی اہم تکنیکی آلات اور ترکیبیں پہلی بار رائج ہوئیں، جن کے بارے میں کسی نے ایجاد کی دعوے داری نہیں کی ہے۔ ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً یہ ان گمنام دست کاروں کی دین ہیں جنھوں نے انھیں یہاں متعارف کرایا۔ استاد کبیر حسین اکبر کے عہد کے مشہور بندوق ساز تھے۔ اکبر کے عہد میں طرح طرح کی بندوقیں اور توپیں بنائی گئیں اور فن اسلحہ سازی کو بڑے پیمانے پر ترقی دی گئی۔

میکانکی آلات میں سب سے اہم ایک مخصوص قسم کا پیچ (Screw) تھا جو الٹے سے سیدھے کی طرف گھمایا جاتا تھا۔ اس کو بنانے کے

لیے کھانچے کاٹنے کے بجائے ایک کیل پر دھات کا بنا ہوا تار لپیٹ دیا جاتا تھا۔ ایسے پیچ کا ذکر پہلی بار 1666ء میں ملتا ہے۔ اس پیچ کی مدد سے دو ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ لکڑی کے دو بیلنوں پر مشتمل کولہو میں وہی اصول کارفرما تھا جس کی جھلک پیچ میں ملتی ہے، جو اسی زمانے میں استعمال ہونا شروع ہوا تھا۔ اس آلے میں استعمال ہونے والے بیلنوں پر پیچ کے جیسے کھانچے بنے ہوئے تھے جو آپس میں پیوست ہو کر بیلنوں کو مخالف سمتوں میں گھماتے تھے۔ تقریباً اسی زمانے میں ایک اور اوزار کا ذکر ملتا ہے جو ہاتھ سے ڈور کھینچ کر چلنے والا برما تھا، جو ہیروں کو تراشنے کے کام آتا تھا۔ اس نئے برمے نے قدیم زمانے کے کمان سے چلنے والے برمے کی جگہ لے لی تھی۔

تعمیرات کے میدان میں بھی جدید تکنیکی طریقے اختیار کیے گئے۔ خاص طور پر دوہرا پیاز نما گنبد بنانے کی صلاحیت پیدا ہونا محراب کے اصول کو تعمیرات میں استعمال کرنے کی صلاحیت میں ایک قابل ذکر پیش رفت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ تکنیک تاج محل کے مشہور گنبد میں اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔ یقینی طور پر یہ نئی کاری گری وسط ایشیا سے ہندوستان آئی تھی، لیکن یہاں آنے کے بعد اس میں کسی قدر بہتری بھی ہوئی۔ اس قسم کی مہارت پانی کو دور تک لے جانے کی غرض سے بنائی گئی اونچی نالیوں کی تعمیر میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے نمونے شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی مشہور مغربی جمنا نہر کے بعض حصوں میں ملتے ہیں۔ جہاز سازی میں عام خیال کے برخلاف ناریل کے ریشوں سے جوڑ پر کرنے کے بجائے اکبر کے آخری زمانے سے خاصے بڑے پیمانے پر لوہے کا استعمال شروع ہو گیا تھا اور سترہویں صدی عیسوی کی ابتدا سے جہازوں کے بنیادی ڈھانچے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ کپڑے کی بنائی کے کام میں پھولوں سے سجی ہوئی بنائی لوم کے اندر موجود کشیدہ کاری کے فریم کی مدد سے پیدا کی جانے لگی، یعنی اب اس کے لیے تیلیاں ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

17.5 زبان و ادب

مغل دور میں علوم و حکمت کے دوسرے شعبوں کی طرح زبان و ادب کو بھی بڑے پیمانے پر فروغ حاصل ہوا۔ اس کی بنیادی وجہ عام طور پر یہ شمار کی جاسکتی ہے کہ تقریباً سبھی مغل حکمراں تعلیم یافتہ تھے، انھوں نے علوم و فنون اور زبان و ادب کے فروغ میں نہ صرف خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ علماء و فضلاء اور دانشوروں و ادیبوں کی سرپرستی بھی کی۔ فارسی زبان نہ صرف مغل سلطنت اور دکنی ریاستوں میں اونچی سطح کے دفاتر کی زبان تھی بلکہ اس کا دائرہ پھیل کر راج پوت ریاستوں کے درباروں تک پہنچ گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کے طرز بیان اور لغت نے دفاتر میں استعمال ہونے والی زبان کو گہرے طور پر متاثر کیا، اس صورت حال کا اندازہ سترہویں صدی عیسوی کے راجستھانی اور مراٹھی دستاویزوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ فارسی نے کئی ہندوستانی زبانوں کی ادبی روایتوں کو بھی متاثر کیا اور اس کے نتیجے میں ہی ایک نئی زبان یعنی اردو وجود میں آئی، لیکن اس کے باوجود بھی فارسی ہندوستان کے کسی بھی حصے میں عام بول چال کی زبان نہیں بن سکی۔ مغل دور میں فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر انجام دیا گیا۔ فارسی لغت نویسی کے میدان میں مغل دور کی عمدہ مثالیں جمال الدین حسین انجوئی کی 'فرہنگ جہاں گیری' اور عبدالرحمان تھتوی کی 'فرہنگ رشیدی' ہیں۔ بالآخر یہ سلسلہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ٹیک چند بہار کی 'بہار عجم' کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس لغت کا شمار بلاشبہ فارسی زبان کی سب سے زیادہ جامع لغات میں کیا جانا چاہیے۔ بہار نے اپنی اس تالیف میں ہر لفظ کے ضمن میں ماضی کے شعراء اور ادیبوں کی نگارشات کے حوالے تاریخی تسلسل میں دیے ہیں اور اسی طرح الفاظ کے استعمال میں آنے والی تبدیلیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ سراج الدین آرزو اس دور میں زبان و قواعد اور صرف و مستعملات کے بہت بڑے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'چراغِ ہدایت' میں یہ نظریہ پیش کیا کہ

ہندی اور فارسی میں بعض بنیادی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ان کا یہ نظریہ ولیم جونس (William Jounes) کی انڈو یورپی زبانوں کی بابت انکشافات سے تقریباً پچاس برس قبل منظر عام پر آچکا تھا۔اسی طرح میرزا جان نے اپنی کتاب 'تحفۃ الہند' میں نہ صرف ہندوستان کے ادبی اسالیب اور موسیقی وغیرہ کا جائزہ لیا بلکہ اس کے تتمہ میں برج بھاشا کی مصطلحات کی ایک طویل فہرست بھی دی۔

مغل عہد کے نثر نگاروں میں ابوالفضل (1602-1551ء) کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہے۔وہ عمدہ اور شاہانہ انداز کی نہایت آراستہ و پیراستہ نثر لکھتا تھا، جس میں اس کی دور رس خیال آرائی، تازگی کی کمی پیدا نہیں ہونے دیتی تھی۔اسی لیے عرصہ تک ابوالفضل کو ہر اس شخص کے لیے ایک مثال تصور کیا جاتا رہا، جسے عمدہ نثر نگاری کا شوق ہو۔فارسی ادب میں ابوالفضل کی خاص اہمیت اس کی نگارشات میں پیش کردہ خیالات کی بنا پر ہے۔اس سلسلے میں خاص طور پر قابل توجہ اکبر کے عہد کی تاریخ 'اکبرنامہ' ہے، جو اس نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ تیار کی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی دوسری تالیف 'آئین اکبری' ہے، جس میں مغلوں کے انتظام حکومت، سلطنت کے صوبوں کے ساتھ ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور علوم و فنون کا ذکر ملتا ہے۔'اکبرنامہ' کے طرز کی کتابیں سترہویں صدی عیسوی میں بھی لکھی گئیں، جن میں قابل ذکر عبدالحمید لاہوری اور محمد وارث کی لکھی ہوئی سرکاری تاریخیں ہیں، جن کو 'بادشاہ نامہ' کے عنوان سے یاد رکھا گیا۔اسی طرح اورنگ زیب کے عہد میں لکھی گئی محمد کاظم کی 'عالم گیرنامہ' ہے۔لیکن ادبی و فنی سطح پر ان سبھی کتابوں کا 'اکبرنامہ' اور 'آئین اکبری' سے کوئی مقابلہ نہیں ہے۔مغل دور میں تاریخ نویسی کے شعبے میں بھی ادبی و فنی اعتبار سے تصنیف و تالیف کے بڑے کارنامے انجام دیے گئے، جن کا تذکرہ تاریخ نویسی کے فن میں کیا جا چکا ہے۔مغل دور میں تصنیف شدہ فارسی ادب کا زیادہ تر حصہ مذہبی تحریروں پر مشتمل تھا، جن میں مسلم دینیات اور تصوف کے علاوہ دبستان مذاہب کافی اہم ہیں، جن کا ذکر تفصیل کے ساتھ پیچھے کیا جا چکا ہے۔فارسی ادب میں قابل قدر اضافہ سنسکرت تحریروں کے ترجموں کے ذریعے ہوا۔ان میں سب سے اہم 'مہابھارت' کا ترجمہ جو اکبر کے عہد میں ہوا اور داراشکوہ کے ذریعے کیا گیا 'اپنشدوں' کا ترجمہ جو 'سیرالاولیا' اور 'سرا کبر' کے نام سے مشہور ہوا، شمار کی جاتی ہیں۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں فارسی شاعری کے سب سے عمدہ نمونے مغل حکومت کے تحت ہندوستان نے پیش کیے۔مغل عہد کے فارسی شعرا میں ایرانی نژاد شاعر جمال الدین عرفی (وفات 1590ء) اپنی پر اثر شاعری کے لیے مشہور تھا۔اسے ملک کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے باہر بھی خاصی شہرت ملی۔عرفی کے اشعار اور خاص طور پر اس کی تصنیف کی گئی مثنوی کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔اس عہد کے فارسی شعراء میں جدت اور زور بیان کے لحاظ سے اکبر کا ملک الشعراء ابوالفیض فیضی (1004-954ھ/ 1595-1547ء) سب سے آگے ہے۔وہ اپنی مشکل پسندی اور مزین و آراستہ پیرائے بیان کے لیے پسند کیا جاتا تھا۔لیکن آج کے نقاد اس کی مثنوی 'نل دمن' کو فارسی شاعری کا شاہ کار مانتے ہیں، جس میں ہندوستانی کہانی کو پیش کیا گیا۔ان کا ماننا ہے کہ امیر خسرو کے بعد فارسی ادب میں اس پائے کی مثنوی نہیں تحریر کی گئی۔عبدالقادر بیدل (وفات 1133ھ/ 1720ء) جدت او ندرت افکار کے لحاظ سے اس دور کا اہم شاعر شمار کیا جاتا ہے۔وہ سبک ہندی کے ماہر تسلیم کیے جاتے ہیں۔اس لحاظ سے ان کی شاعری میں ہندوستانی طرز کا غیر واضح انداز بیان ملتا ہے، جس کی خوبیوں اور خامیوں کے بارے میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ان کی شاعری پر تصوف کی چھاپ غالب ہے، وسط ایشیا میں ان کو خاصی مقبولیت ملی اور انھیں دوسرا رومی سمجھا جاتا ہے۔ان کے علاوہ اس دور کے دوسرے ممتاز شعرا میں صائب، غنی کشمیری، نظیری، ظہوری، طالب آملی، ابوطالب کلیم اور صوفی سرمد کو شامل کیا

جا سکتا ہے۔

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ شمالی ہندوستان میں مسلم حکمرانی کی وجہ سے سنسکرت ادب جنوب میں چلا گیا تھا، مگر اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ مغل سلطنت میں سنسکرت ادب برابر پھلتا پھولتا رہا۔ اس زمانے کی زیادہ تر سنسکرت تحریریں مذہبی امور، فلسفہ اور قانون سے متعلق تھیں۔ اس کے ساتھ ہی زبان و ادب پر بھی مختلف کتابیں تحریر کی گئیں۔ ناگوجی بھٹ (وفات 1700ء) اپنی لاتعداد تصنیفات کے لیے جانے جاتے ہیں، انھوں نے پتانجلی کی 'مہا بھاشیہ' جیسی مشہور اور قدیم سنسکرت گرامر پر شرح لکھی۔ شاہ جہاں کے درباری شاعر جگن ناتھ پنڈت نے نقد شعر کے موضوع پر 'رس گنگا دھارا' نامی ایک ضخیم کتاب تصنیف کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'بھامنی ولاس' جیسی مشہور کتاب تصنیف کی، جو ایک ہی وقت میں عشقیہ نظم، مرثیہ اور حکیمانہ مقولوں کا مجموعہ قرار دی گئی ہے۔ کہانیاں، افسانے اور روایات سنسکرت میں برابر قلم بند ہوتے رہے۔ بلال سین نے سولھویں صدی میں راجہ بھوج کے دربار کے بارے میں پرلطف روایتیں اپنی کتاب 'بھوج پربندھ' میں یکجا کی تھیں۔ سترہویں صدی میں نرائن نے مقفیٰ نثر میں اگنی دیوتا کی بیوی سواہا اور چندرما کے عشق کا ذکر کیا ہے۔ کام سوتر کے انداز میں عشق کے فن کا بیان کلیان مل کی 'اننگ رنگ' میں ملتا ہے، جو سولھویں صدی کی تصنیف ہے۔

سنسکرت ادب کی ایک دوسری صنف جس کو پڑھنے والے اور پروان چڑھانے والے برابر ملتے رہے، تاریخ کے متعلق 'کاویہ' یعنی شعری بیان ہے۔ کلہن کی لکھی ہوئی کشمیر کی عظیم تاریخ کے بیان میں شعری اوزان کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اسی طرز تحریر کو جاری رکھنے کی کوشش اکبر کے عہد میں پراجایا بھٹ اور شوکا نے 'راجاوالی پٹاکا' کے عنوان سے کی تھی۔ مغل دربار میں موجود مدح خواں اور اسی قسم کے وہ لوگ بھی جو راج پوت اور مراٹھا درباروں میں موجود تھے، اس مرصع لیکن اکھڑی ہوئی سی بیانیہ روایت کی پیروی کرتے ہوئے اسی طرح کی مصنوعی زبان استعمال کرتے رہے۔ اس دور میں سنسکرت کا دوسری کلاسیکی زبانوں سے لین دین کا تعلق بھی رہا۔ اکبر کے دور میں کرشن داس نے 'پارسی پرکاش' نامی تصنیف تیار کی، جو فارسی اور سنسکرت زبان کی ایسی پہلی لغت ہے جس کا ذکر ملتا ہے۔

سنسکرت زبان کے سائنسی ادب میں قابل قدر اضافہ ان تحریروں کے ذریعے بھی ہوا، جن میں یونانی اور عربی علوم کو پیش کیا گیا تھا۔ یہ علوم یہاں تک فارسی زبان کے توسط سے پہنچے تھے۔ ان میں سب سے اہم اکبر کے دربار کے منجم نیل کنٹھ کی کتاب 'تاجیک نیل کنٹھی' تھی۔ 1643ء میں ویدانگا رایا نے اپنی کتاب 'پارسی پرکاش' تصنیف کی، جو علم فلکیات سے تعلق رکھنے والے الفاظ کی فارسی سنسکرت فرہنگ ہے۔ اٹھارہویں صدی میں سمراٹ جگن ناتھ نے بطلیموس کی کتاب 'المجسطی' اور اقلیدس کی 'ہندسہ' سے متعلق تحریر کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ ان تحریروں کے عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے متنوں کا بھی ترجمہ کیا گیا۔

مغل دور حکومت میں ہندوستان کی بہت سی بولیوں میں ادبی استعداد پیدا ہوئی۔ ان میں سے خاص طور پر دو بولیوں 'اودھی' اور 'برج' نے واضح طور پر ادبی سرمایوں کو جنم دیا۔ اودھی زبان میں عوامی انداز کی شاعری وجود میں آئی، جس کی عمدہ مثال کبیر کے وہ دوہے قرار دیے جا سکتے ہیں، جن میں ویدانت کے جذبے سے لبریز پیغام ملتا ہے۔ پھر اسی زبان میں ملک محمد جائسی نے 'پدماوت' لکھی۔ اکبر کے عہد میں تلسی داس نے اودھی زبان میں ہی 'رام چرتر مانس' تحریر کی، جو رامائن کا ایسا ادبی چربہ ہے، جس نے اپنے بھکتی سے بھرے بیانیہ کی بنا پر بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ مغربی ہندوستان میں جہاں 'برج' بولی جاتی ہے، ہمیں ایک طرف کرشن بھکتی میں ڈوبے ہوئے سورداس کے نغمے ملتے ہیں، وہیں دوسری

طرف عبدالرحیم خان خاناں کی اعلیٰ معیار کی حامل ادبی نظمیں بھی ہیں۔ اسی زمرے میں بہاری لال کی 'ست سائی' کو بھی شامل کیا جائے گا۔ برج کے ایک شاعر بنارسی داس نے نظم میں اپنی نہایت دلچسپ سوانح بیان کی جو 'اردھ کتھا نک' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی دور میں جدید ہندی نے اپنی مخصوص ادبی نثر کو کھڑی بولی کی غیر ادبی روزمرہ استعمال ہونے والی زبان کے ذریعے ترقی دی۔ اس کام میں دو اشخاص جنھوں نے اہم کردار ادا کیا، سداسکھ لال اور انشاء اللہ خاں انشاء تھے۔ انشاء اردو کے مشہور شاعر اور ہندوستانی بولیوں کے عالم تھے۔ انھوں نے ہندی نثر میں غیر مذہبی موضوعات پر نہایت مؤثر مضامین لکھے ہیں۔

مغل دربار اور فوج میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد یکجا ہوگئی تھی جو مختلف زبانیں اور بولیاں بولتے تھے۔ ان بولیوں اور زبانوں کے ایک دوسرے سے ملنے جلنے کے نتیجے میں ایک مخلوط زبان وجود میں آئی جو فوجی چھاونیوں اور دربار میں بھی استعمال ہوتی تھی اور اس مخلوط زبان نے 'اردو' کی شکل اس وقت اختیار کرلی جب اس میں ایسے ادب کا فروغ ہوا، جس کی زیادہ تر اصناف فارسی سے مستعار لی گئی تھیں۔ ایسی کوشش پہلی بار اس علاقے میں نہیں ہوئی جہاں 'ہندی' سے ملتی جلتی زبانیں بولی جاتی تھیں، بلکہ اس عمل کا آغاز دکن کی سلطنتوں خصوصاً گولکنڈہ اور بیجاپور میں سولھویں اور سترہویں صدی کے دوران ہوا۔ اس دکنی اسلوب کے ایک مانے جانے نمائندے محمد قلی قطب شاہ (وفات 1612ء) تھے۔ اردو کو پروان چڑھانے میں ایک دوسری چیز جس نے مدد کی وہ بازار میں ہونے والی گفتگو کے دوران فارسی اور 'ہندی' الفاظ کا استعمال تھا۔ دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں جس 'ہندی' کے الفاظ استعمال میں آتے تھے، وہ کھڑی بولی تھی۔ ایسی بازاری زبان میں لکھی گئی طنزیہ لیکن عامیانہ نثر اور نظم دونوں کی عمدہ مثالیں جعفر زٹلی (وفات 1713ء) کی نگارشات میں ملتی ہیں۔ مختلف النوع اسالیب اور محاوروں سے عبارت یہ بولی اس وقت ایک معیاری اردو زبان بننے کی طرف مائل ہوگئی، جب گجراتی نژاد شاعر ولی دکنی اپنی غزلوں کے مجموعے کے ساتھ 1723ء میں دہلی پہنچے۔ اگلے سو برسوں میں اردو زبان خوب پھلی پھولی۔ اس زمانے میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے، جن میں سراج الدین خاں آرزو، حاتم، مرزا مظہر جان جاناں، محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر تقی میر، ذوق، مومن نظیر اکبرآبادی اور غالب کا نام شمار کیا جا سکتا ہے۔

ان شعراء نے جہاں ایک طرف فارسی ادب کے تمام تر تصورات اور اسالیب کو اپنایا وہیں اس میں جاری وساری تشکیک کی روایت کو بھی قبول کیا۔ انھوں نے اردو زبان کو نئے طرز فکر اور محاوروں سے روشناس کرایا۔

مغل دور میں ہندوستان کی مختلف علاقائی بولیوں کو پھلنے پھولنے اور ادبی زبانوں کے طور پر فروغ پانے کا موقع ملا۔ ان علاقائی زبانوں میں پشتو، کشمیری، پنجابی، سندھی، بنگالی، آسامی، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، کناڈا، تامل اور ملیالم سبھی زبانیں شامل ہیں۔ ان علاقائی زبانوں کے فروغ نے کئی قسم کے نظریات کو فروغ دیا۔ ان میں سے ایک یہ کہ اس زمانے میں 'قومیتیں' وجود میں آئیں۔ ساتھ ہی ان علاقائی ادب کی نوعیتوں کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان علاقائی زبانوں میں جو ادب سامنے آیا اس کا زیادہ تر حصہ مذہب اور دینیات سے متعلق تھا۔

17.6 فنون لطیفہ

فنون لطیفہ یا فن تعمیر کے وہ نمونے جو قوموں اور تہذیبوں کی تمدنی تاریخ کے ارتقائی مراحل میں رونما ہوتے ہیں، وہ اپنے قوم و ملک کی

تہذیبی وتمدنی تاریخ کا آئینہ دار ہوتے ہیں، جن سے اس قوم کے سیاسی عروج، معاشرتی ارتقا، تہذیبی وتمدنی ترقی اور معاشی خوش حالی کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی تاریخ میں مغل دورِ حکومت کا اگر اس اعتبار سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے اس ملک اور عالمی فنون لطیفہ کے میدان میں بہت سی اہم یادگاریں چھوڑی ہیں، جو نہ صرف ان کی تمدنی ترقی کا آئینہ دار ہیں بلکہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی فروغ کا ثبوت بھی ہیں۔

17.6.1 فنِ مصوری

مصوری فنون لطیفہ کا ایک ایسا شعبہ ہے جس میں ہندوستان کی مغل حکومت نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ مینا طوری مصوری (Miniature Painting) جو پوری طرح کاغذ پر بنائی جاتی ہے، اسے مغل بادشاہوں نے بڑے پیانے پر ترقی دی۔ شروع میں یہ فن ایرانی مصوری کا ایک حصہ تھا جس میں لکیروں کی صفائی اور تفصیلات کی صحت پر زور دیے جانے کے ساتھ تناظر سے ارادتاً گریز کیا جاتا تھا۔ اس فن کے دو ابتدائی استاد عبدالصمد اور میر سید علی تھے۔ یہ دونوں 56-1555ء میں ہمایوں کے ساتھ ایران سے آئے تھے۔ اکبر نے اپنے عہد میں فنون لطیفہ خاص طور پر مصوری کی طرف خصوصی دھیان دیا اور اس نے ان ایرانی مصوروں کے ارد گرد فن کاروں کا ایک نیا گروہ تیار کر لیا، جن میں کچھ کر گزرنے کی صلاحیت اور حوصلہ تھا۔ اس مقصد سے اس نے مصوری کے ایک اسکول کی بنا ڈالی، جس میں 'حمزہ نامہ' کی تصویریں بنانے کا کام شروع ہوا۔ اس کے بعد کئی دوسرے مخطوطوں کو تصویروں سے مزین کرنے کا کام کیا گیا، جو اکبر کے عہد میں مستقل جاری رہا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ملک کے مختلف حصے سے مصوروں کو یکجا کیا گیا تھا۔ نتیجتاً مصوری کے مختلف طرز جو ملک کے مختلف حصوں مثلاً مالوہ، گجرات، راجستھان، گوالیار اور کشمیر میں پنپ رہے تھے، اب اکبر کے اسکول میں بنائی گئی تصویروں میں جھلکنا شروع ہو گئے۔ ان ملکی طرز کے ساتھ تفصیلات پر مخصوص توجہ، جو ایرانی مصوری کا بنیادی عنصر ہے، نہ صرف مغل مصوری میں برابر جاری رہی، بلکہ اکبر کی خصوصی توجہ اور عبدالصمد و دوسرے فن کاروں کی کارگزاری کی بدولت اس میں مزید گیرائی پیدا ہو گئی۔ ابوالفضل نے ان مصوروں کی ایک فہرست دی ہے، جن میں خاص طور پر وہ دساونت اور جسونت کی ذہانت وفطانت کی تعریف کرتا ہے۔ مخطوطوں میں موجود مصوری کے نمونوں میں بہت سے دوسرے مصوروں کے نام بھی درج ملتے ہیں۔ اس طرح اس عہد میں مصوری کے ان نمونوں کا بھی پتہ چلتا ہے، جن کو کئی مصوروں نے مل کر تیار کیا تھا۔ ایسی صورت میں شکلیں اتارنے کا کام ایک مصور کرتا تھا اور تزئین وآرائش کسی دوسرے مصور کی ذمے داری ہوتی تھی، بعض اوقات ایک تیسرا مصور بھی اس کام میں شریک ہو جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں تخلیقی عمل کی امتزاجی کیفیت کا نمایاں ہو جانا قدرتی امر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی مصوری میں، چاہے وہ شبیہوں اور اشکال کا بنانا ہو یا قدرتی مناظر یا تاریخی واقعات کی تصویر کشی، حقیقت پسندی پر بہت زور دیا جاتا تھا، جس پر خود ابتدا ہی سے اکبر کا اصرار تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں اکبر کو یورپی مصوری کے نمونوں میں بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے بعد نہ صرف عیسائیت سے مستعار مذہبی پیکر بلکہ یورپی نشاۃ ثانیہ کے دور کے دوسرے عوامل بھی مغل مصوری میں جھلکنے لگے تھے۔ اسی کا اثر تھا کہ مغل مصوری میں تناظر اور تناسب پر خاص توجہ دی جانے لگی تھی۔

جہاں گیر کے عہد میں ہر اعتبار سے مغل مصوری اپنے کمال پر پہنچ گئی تھی۔ اس دور میں کتابوں کی تزئین وآرائش سے ہٹ کر مصوروں نے البم اور افراد کے اشکال تیار کرنے شروع کر دیے تھے۔ جہاں گیر کو افراد کی شکلیں (Portrait) تیار کروانے اور جانوروں، پیڑوں، پودوں

اور پھولوں کے خاکے (Sketch) بنوانے میں خاصی دلچسپی تھی۔ خاکے تیار کرنے میں منصور کو استاد کا درجہ حاصل تھا۔ اس قسم کی مغل مصوری کس حد تک دل کو چھو جانے والی ہو سکتی تھی، اس بات کا اندازہ مرض الموت سے دو چار ایک شخص کی شبیہ سے لگایا جا سکتا ہے، جو کسی نامعلوم مصور نے جہاں گیر کے حکم سے تیار کیا تھا۔ اس شبیہ کی خاص بات یہ ہے کہ جذبات کو چھو لینے کی صلاحیت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مغل طرز کی مخصوص انفرادیت بھی موجود ہے۔

شاہ جہاں کے دور حکومت (59-1628ء) خصوصاً دارا شکوہ کی زیر سرپرستی فن مصوری ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا تھا۔ گرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس دور میں مصوری کے نمونوں کی فراوانی اور ان کی کل تعداد میں کچھ کمی آ گئی تھی۔ بچتر کی صوفی نغمہ سرا' جس میں عام انسانوں کو سر راہ بیٹھا دکھایا گیا ہے، بلاشبہ مغل مصوری کی شاہ کار ہے۔ جہاں اس تصویر کی حقیقت پسندی نشاۃ ثانیہ کے دور کی یورپی مصوری کی یاد تازہ کرتی ہے، وہیں دوسری طرف اس میں تفصیلات پر مخصوص توجہ کلاسیکی مغل مصوری کی روایت کے عین مطابق ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مغل مصوری نے اپنے فن کی نمائش کو جنگ، شکار، درباری تقریبات اور علما کے اجتماعات جیسے موضوعات تک محدود رکھا۔ گرچہ یہ حقیقت ہے کہ مغل مصوری کے زیادہ تر نمونے انھیں موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ایرانی مصوری کی طرح مغل مصوری بھی بنیادی طور پر جمہوری موضوعات پر مشتمل ہے۔

علاقائی اور صوبائی حکومتوں میں موجود مصوری کے اسکولوں اور بازار میں بنے مرقعوں کو فروخت کرنے والے مصوروں کے ذریعے دربار میں پروان چڑھنے والے مغل طرز کا اثر دور دور تک پھیلتا گیا۔ بالآخر اٹھارہویں صدی میں اس عمل کے نتیجے میں کئی صوبائی یا علاقائی رجحانات وجود میں آ گئے، جن کے درمیان پوری طرح سے مسابقت کا فقدان تھا، مثال کے طور پر پٹنہ اسکول اور اودھ اسکول وغیرہ۔ اسی طرح سے راجستھان اور مغربی ہمالیہ میں راج پوت اور پہاڑی اسکول وجود میں آ گئے، جن میں جمہوری موضوعات کے ساتھ ساتھ بھگتی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی، خصوصاً کرشن اور رادھا سے عبارت تصویریں زیادہ اہم تھیں۔

17.6.2 فن موسیقی اور رقص

مغل عہد میں ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کو بہت ترقی ملی۔ خاص طور پر اس عہد میں موسیقی کو ہندو۔مسلم اتحاد کا ایک اہم ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ہندوستانی موسیقی کے ان نظری اصولوں کو بخوبی سمجھا جانے لگا، جن کا ذکر سنسکرت تحریروں میں موجود ہے۔ ابوالفضل نے 'آئین اکبری' میں ان اصولوں کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس نے موسیقی کے 36 ان استادوں کے نام دیے ہیں، جو اکبر کی ملازمت میں تھے۔ ان میں مغنی اور سازندے دونوں شامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم نام تان سین کا ہے۔ اکبر کے دربار میں تان سین کی بڑی پذیرائی ہوئی، جو بہت سے راگوں کا موجد شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے مغل عہد میں موسیقی کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تان سین کے ذریعے مغل عہد میں موسیقی کے ایک اسکول کی بنیاد پڑ گئی۔ روایتی طور پر یہ خیال ہے کہ کلاسیکی موسیقی میں 'کناٹرا زبان' کی جگہ شمالی ہندوستان کی زبان اور خاص طور پر گوالیار کی بولی کا استعمال پندرہویں صدی کے اواخر میں گوالیار کے راجہ مان کے زمانے سے شروع ہوا۔ اب اس عہد میں 'دھرپد' موسیقی کا سب سے مقبول طرز بن گیا۔ نائک بخشو کو اس طرز کا استاد شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سولہویں صدی کے اوائل سے ایک نیا طرز وجود میں آیا، جس کو 'خیال' کا نام دیا گیا۔ اس طرز میں موسیقی کار کو برجستہ انداز میں تکلے لگانے کا موقعہ تھا۔

موسیقی کی ترقی میں اکبر کے جانشینوں جہاں گیراورشاہ جہاں نے اسی کی پیروی کی، ساتھ ہی مغل امراء نے بھی موسیقی کے فروغ میں اہم کردار نبھایا۔اورنگ زیب کے ذریعے موسیقی کا جنازہ نکالنے سے متعلق تاریخی کتابوں میں بہت سی غیر مستند روایتیں موجود ہیں۔مگر جدید تحقیقات سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنے دربار میں مغنیوں پر پابندی عائد کی نہ کہ موسیقی کے آلات پر۔اورنگ زیب خود ایک باکمال وینا ساز تھا۔اسی طرح سے اورنگ زیب کے دورِ حکومت میں کلاسیکی ہندوستانی موسیقی پر فارسی زبان میں متعدد کتابیں تحریر کی گئیں۔ اس بنا پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اورنگ زیب کے عہد میں بھی ملک میں موسیقی کا فروغ ہوتا رہا۔مغل عہد میں موسیقی کے شعبہ میں آخری اہم کام اٹھارہویں صدی عیسوی میں محمد شاہ کے دورِ حکومت (1720-48ء) میں ہوا۔

مغل مصوری کے نمونوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح مغل دربار میں آہستہ آہستہ وسط ایشیا کے سازوں اور رقاصی کی جگہ ہندوستانی سازوں اور رقص کے طریقوں نے لے لی۔'بابرنامہ' کی ایک تصویر میں بابر کو ہمایوں کی پیدائش کے موقعے پر جشن مناتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔اس تصویر میں چار مرد اور تین عورتیں مختلف قسم کے ساز بجاتے ہوئے دکھائے گئے ہیں اور ایک مرد ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے ایک عورت کے ساتھ جو سر سے پیر تک ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہے، سازوں کی تال پر رقص کر رہے ہیں۔رقص کے اس وسط ایشیائی منظر کا مقابلہ 'پادشاہ نامہ' کی ایک تصویر سے کیا جاسکتا ہے، جس میں شاہ جہاں کی بیالیسویں سال گرہ کی تقریب دکھائی گئی ہے۔'پادشاہ نامہ' کی تصویر میں پندرہ سے زیادہ مرد بیٹھے ہوئے یا کھڑی حالت میں مختلف قسم کے ساز بجا رہے ہیں اور تین مرد اور ایک لڑکا کچھ گا رہے ہیں۔ان لوگوں کے سامنے دس عورتیں ہیں، جن میں ایک کے سوا سب کی سب ہندوستانی لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔ان کے اوپری کپڑے اتنے شفاف اور باریک ہیں کہ ان کے نیچے جو کسے ہوئے کپڑے پہنے ہیں، وہ صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ان عورتوں میں سے ہر ایک رقص کی کسی نہ کسی حالت میں ہے لیکن رقص کرنے والوں میں کوئی مرد شامل نہیں ہے۔واقعہ یہ ہے کہ دربار میں رقص کا فن عورتوں تک محدود تھا، جو'لولیان'یا'کچنیاں'وغیرہ جیسے ناموں سے پکاری جاتی تھیں اور دربار تک پہنچنے سے پہلے انھیں کافی تربیت دی جاتی تھی۔ جہاں گیر کے ایک امیر اسلام خاں فتح پوری کی ملازمت میں ایسی عورتوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی تنخواہوں پر ہر مہینہ اسلام خاں -/80,000 روپیہ خرچ کرتا تھا۔مگر تاریخی کتابوں میں ان عورتوں کی مخصوص فن کاری کی تفصیلات کے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔

17.7 فن تعمیر

فنون لطیفہ کے میدان میں ہندوستانی مغل حکمرانوں کی سب سے اہم یادگاریں فن تعمیر کے میدان میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ان عمارتوں کی جس بڑے پیمانے پر منصوبہ سازی کی گئی، ان میں پائی جانے والی عمارتی تفصیلات، ان کی نفاست، آرائش و زیبائش اوران کا جمال دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔مغل عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کی بنیادی تکنیک اوران کے مختلف النوع خاکوں کو مختلف عناصر سے اخذ کیا گیا ہے۔ان میں ایک بڑا حصہ ان اشکال کا ہے جن کو سلطنت کے فن عمارت سازی نے عطا کیا۔اس سلسلے میں گنبد، محراب اور قوسی چھت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔مغلوں نے بہت سی نئی جہات اور عمارتی اشکال ان صوبائی طرز تعمیر سے مستعار لیں جو سلطنت کی عمارتوں سے شروع ہو کر گجرات، راجستھان، مالوہ، مشرقی سلطنت اور بنگال میں نمایاں ہوتی گئی تھیں۔اس کے ساتھ ہی متعدد نئے آرائشی طریقے وسط ایشیا اور ایران سے یہاں لائے گئے، جن میں ابھرے ہوئے گنبد، پچی کاری کا کام اور مربع قطعات میں باغات کی ترتیب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاں

تک پانی کی موجودگی سے لطیف کیفیات پیدا کرنے کا تعلق ہے، ہندوستان، ایران اور وسط ایشیا تینوں جگہوں کی تعمیراتی روایتوں میں یہ خصوصیت مشترک ہے، لیکن مغل عمارتوں میں ان روایتوں کو نہ صرف ایک دوسرے سے ہم آہنگ کیا گیا ہے بلکہ اس کا زیادہ دل کش پہلو تجربہ اور ندرت سے عبارت وہ رجحان ہے جو مغل تعمیراتی روایت میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔ دور اکبر کے محل نما شہر فتح پور سیکری میں یہ رجحان نہایت تابناک انداز میں ملتا ہے۔ یہاں پر محراب اور کڑیوں سے عبارت تعمیراتی اصولوں کو نہایت سلیقے سے یکجا کر کے بہت خوب صورت اور دل کش عمارتیں کھڑی کی گئی ہیں۔ شاہ جہاں کا تاج محل ایک مستند تعمیراتی کارنامہ ہے، جس میں ہر وہ خوبی اور حسن موجود ہے جو مغل حکمراں اپنی عمارتوں میں پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے۔

جہاں تک مغل عہد میں تعمیر ہونے والی عمارتوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں تاریخی شواہد اور حوالوں کی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں مغل حکومت کے بانی بابر کے دور حکومت (30-1526ء) میں بہت سی عمارتیں تعمیر کی گئیں لیکن اس عہد کی باقی بچی عمارتوں میں صرف دو مسجدوں کا نام لیا جا سکتا ہے ایک پانی پت میں واقع ہے اور دوسری سنبھل میں۔ اسی طرح سے ہمایوں کو اپنے زمانے کے سیاسی حالات کے پیش نظر بہت زیادہ عمارتیں تعمیر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ مورخین آگرہ اور حصار میں اس کے ذریعے بنوائی گئی کچھ مسجدوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ حقیقی طور پر مغل فن تعمیر کی تاریخ کی ابتدا اکبر کے دور حکومت (1556-1605ء) سے ہوتی ہے، جب اس نے عظیم سلطنت کے قیام کے بعد ملکی صلاحیتوں کو استعمال کرنا اور ہندوستانی فن تعمیر کے نمونوں سے فیضان حاصل کرنا شروع کیا۔

مغل طرز تعمیر کا پہلا نمونہ ہمایوں کا مقبرہ ہے جو 1564ء میں دہلی میں تعمیر کیا گیا۔ اس عمارت کے بارے میں عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس عمارت کا تصور ایرانی ہے لیکن کاری گری ہندوستانی۔ یہ عمارت ایک بڑے اور اونچے چبوترے پر کھڑی ہے، جس کے اوپر گنبد اور چاروں طرف چھتریاں اور کوشکیں ہیں۔ مرکزی عمارت کے چاروں پر ایک چوکوشہ باغ ہے جو دیوار سے گھرا ہوا ہے اس باغ کو سیراب کرنے کے لیے نالیاں بنی ہوئی ہیں جو ایک دوسرے میں سے گزرتی ہوئی مختلف سمتوں میں نکل جاتی ہیں۔ ہمایوں کی وفات کے بعد یہ مقبرہ اس کی ایک بیوی حمیدہ بانو بیگم نے تعمیر کرایا۔ یہ خوب صورت مقبرہ ایک ایرانی ماہر فن تعمیر ملک مرزا غیاث کی زیر نگرانی ہندوستانی کاری گروں اور راج گیروں کے ذریعے تعمیر کیا گیا۔ اپنی انھیں خصوصیات کی بنا پر اسے ہند، ایرانی فن تعمیر کا ایک عمدہ نمونہ شمار کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے میں اکبر نے آگرہ کے قلعے کو دوبارہ تعمیر کروایا، جس میں زیادہ تر لال رنگ کا ریتیلا پتھر استعمال کیا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اکبر کے عہد میں آگرہ کے قلعے میں تقریباً 500 عمارتیں تعمیر کی گئیں، لیکن ان میں سے آج صرف چند ہی محفوظ ہیں۔ فتح پور سیکری شہر کی بنیاد 1570ء میں پڑی، یہاں بھی لال ریتیلا پتھر زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اس جگہ پر جس قسم کی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لایا گیا ہے وہ تعمیر کے اصولوں اور استعمال کیے گئے سامان کی قیود سے باہر کی چیز معلوم ہوتی۔ عمارتوں اور محلوں کے اس انبوہ کا خاکہ اکبر نے اس وقت تیار کیا تھا، جب اس کے مذہبی افکار و خیالات میں اس طرح کی تبدیلیاں نہیں رونما ہوئی تھیں، جو بالآخر بعد کے دور میں وقوع پذیر ہوئیں۔ اس لیے فنون لطیفہ کے بعض مورخین کا یہ کہنا پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ یہاں محراب اور کڑیوں سے عبارت تعمیرات کے اصولوں کو یکجا کرنے کے پیچھے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا جذبہ کارفرما تھا۔ حقیقت میں اس بات کی بھی کوئی سند موجود نہیں ہے کہ تعمیرات کے ان اصولوں کی ہندو اور مسلم خانوں میں تقسیم کا اکبر کو احساس بھی تھا۔ لیکن اتنا ضرور واضح ہے کہ اسے عمارتوں کو صرف محرابی یا خمیدہ اشکال میں ہی دیکھنا پسند نہیں تھا۔ اس کے لیے شاید ان کا تنوع

زیادہ دل فریب تھا۔ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ یہاں پر کس طرح اس نے ایسی تعمیرات کو بکھرے ہوئے تناسب کی حامل عمارتوں کے درمیان رکھ کر ایک عمدہ معیار کی چیز بنا دی ہے، جو اپنی جگہ پر بے مثال اور غیر معمولی ہیں۔ فتح پور سیکری کی عظیم مسجد کا مغل طرز میں بنا ہوا بلند دروازہ سامنے کی طرف یوں کھڑا ہے کہ اس کی مدد سے محلوں اور اس کے احاطوں اور تالابوں کی قطار بندی نکالی جا سکتی ہے۔اسی کے ساتھ ساتھ اٹکن ندی پر بند باندھ کر اس کے پانی کو چرخیوں کے ذریعے اٹھانے کے بعد مرتفع نالیوں کے ذریعے محلوں کے حوضوں تک پہنچایا گیا ہے۔

سکندرہ میں واقع اکبر کا مقبرہ، جو اس کے بیٹے جہاں گیر کے عہد (27-1605ء) میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، کسی طرح بھی کم ندرت کا حامل نہیں ہے۔اس میں ستونوں پر کھڑی کئی منزلہ عمارت کا اوپری حصہ سنگ مرمر سے بنا ہے، جس سے گنبد غائب ہے۔اس عہد میں سنگ مرمر کا استعمال عام ہو گیا تھا اور زیادہ پسند کیا جانے لگا تھا۔ آگرہ میں واقع اعتمادالدولہ (وفات 1622ء) کا نہایت خوب صورت مقبرہ، جس میں کئی ایرانی خصوصیات دیکھی جا سکتی ہیں، اس رجحان کی نمائندگی کرتا ہے۔اس عمارت میں اور لاہور میں تعمیر شدہ جہاں گیر کے مقبرے میں بھی گنبد کا موجود نہ ہونا ایک قابل توجہ بات ہے۔

شاہ جہاں کا دور حکومت (58-1628ء) مغل فن تعمیر کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے۔اس نے اپنی بیوی ممتاز محل کا مقبرہ آگرہ میں تعمیر کروایا، جو اب تاج محل کے نام سے مشہور ہے۔ جمنا ندی کے کنارے پر واقع یہ مقبرہ دراصل ایک چھوٹے سے شہر کا حصہ معلوم ہوتا ہے، جس کا خاکہ نہایت اچھے طریقے سے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں پر دکانیں اور کارواں سرائے وغیرہ موجود ہیں۔انھیں ایک چوکور نقشے کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ مقبرہ کی مرکزی عمارت مکمل طور پر سنگ مرمر سے تیار کی گئی ہے۔اس کے دونوں بازوؤں کی سمت میں سرخ ریتیلے پتھروں کی عمارتیں ہیں اور سامنے کی طرف ایک عمدہ دروازہ ہے۔ان تینوں عمارتوں میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر فن تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔مرکزی عمارت اور دروازہ کے درمیان نہریں اور پگ ڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں اور دائروں کے شکل کی آرام گاہیں بھی مہیا کی گئی ہیں۔یہ سب مل کر اس پورے منظر کو دل کش بنا دیتی ہیں۔اس کے بعد مقبرے کی سنگ مرمر سے بنی ہوئی مرکزی عمارت اور اس کا چبوترہ ہے، جس کے چاروں کونوں پر ایک ایک مینار کھڑے ہیں۔ مقبرے کے اندرونی حصے پر پیاز کی شکل کا ایک گنبد تعمیر کیا گیا ہے۔گنبد کے چاروں طرف چار چھتریاں بنی ہوئی ہیں، جن کی انفرادی حیثیت کو واضح کرنے کے لیے ان کی اونچائی گنبد کی کرسی سے کم رکھی گئی ہے۔تاج محل میں پچی کاری کا کام اور اس میں جڑے ہوئے نگینوں اور قیمتی پتھروں کا استعمال، خاص طور پر سنگ مرمر میں تراشے ہوئے حسین نقش و نگار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس کام کے لیے کاری گروں کی ایک بڑی جماعت کو لگایا گیا تھا، جن میں ہندوستانی اور ایرانی دونوں طرح کے کاری گر شامل رہے ہوں گے۔شاہ جہاں نے آگرے کے قلعے کی عمارتوں میں کئی قابل ذکر اضافے کیے، جن میں موتی مسجد کافی اہم شمار کی جاتی ہے۔یہ مسجد زیادہ تر سنگ مرمر کی ہے اور بعض لوگوں کے خیال میں دنیا کی خوب صورت ترین مسجد ہے۔اسی طرح شاہ جہاں نے دہلی میں جمنا کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا، جو تاریخ میں شاہ جہان آباد کے نام سے مشہور ہے۔دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد اس نئے شہر کا حصہ تھے۔لال قلعے کے اندر اس نے بڑے پیمانے پر خوب صورت محل اور عمدہ عمارتیں تعمیر کرائیں۔دہلی کی جامع مسجد بلاشبہ مغلوں کی بنائی ہوئی مسجدوں میں عظیم ترین مسجد ہے۔اس میں سرخ ریتیلے پتھر اور سنگ مرمر کو نہایت موزوں تناسب میں استعمال کیا گیا ہے۔دراصل پتھروں کے استعمال میں یہ تناسب اور موزونیت شاہ جہاں کی تمام عمارتوں میں نظر آتی ہے۔شاہ جہاں کے عہد میں مغل طرز تعمیر کے خط و خال اپنے کمال کو پہنچ چکے تھے۔شاہ جہاں کے عہد میں تعمیر ہونے والی تمام عمارتوں کے میر عمارت اس

عہد کے مشہور ماہر تعمیر استاد احمد شمار کیے جاتے ہیں، خاص طور پر تاج محل، دہلی کا لال قلعہ اور جامع مسجد انھیں کے زیر نگرانی تعمیر کیے گئے۔ ان کی حیثیت کا اندازہ اس اعتبار سے لگایا جا سکتا ہے کہ جو مقام و مرتبہ عثمانی سلطنت میں سلیمان اعظم کے دور حکومت میں خواجہ سنان کو حاصل تھا، مغل عہد میں شاہ جہاں کے دور حکومت میں وہی مقام و مرتبہ استاد احمد کو حاصل تھا۔ اورنگ زیب کے عہد حکومت (1707ء-1659ء) میں بھی تعمیرات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس زمانے کی تعمیر شدہ عمارتوں میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جس کی بنا پر ان کو فن تعمیر کی تاریخ میں کوئی خاص مقام مل پاتا۔ اس عہد کی قابل ذکر عمارتوں میں لاہور کی بادشاہی مسجد اور اورنگ آباد میں تعمیر کیا گیا رابعہ دورانی کا مقبرہ ہے۔ مورخین کا بیان ہے کہ رابعہ دورانی کے مقبرے کو تاج محل کے طرز پر تعمیر کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ مغل طرز تعمیر کے نمونے صرف دارالسلطنتوں اور بڑے شہروں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ پورے ملک کے دور دراز علاقوں تک میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسی طرح سے مغل طرز تعمیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کی عمارتیں صرف مسجدوں، مقبروں، قلعوں اور شاہی محلوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں رفاہ عامہ سے متعلق مختلف عمارتیں تعمیر کروائیں اور یہ تمام بھی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ شمار کی جاتی ہیں۔ مغلوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سے پل بھی تعمیر کروائے۔ ان پلوں میں جون پور میں گومتی ندی پر بنا ہوا پل سب سے اہم شمار کیا جاتا ہے۔ اس پل کی تعمیر 68-1567ء میں ہوئی تھی۔ اس طرح سے مغل عمارت سازی کا ایک اہم شعبہ سرائے کی تعمیر ہے۔ ان کی تعمیر کی ہوئی بے شمار سرائیں موجود ہیں۔ یہ سرائیں عام طور پر چوکوشہ عمارتیں ہوا کرتی تھیں، جن میں وسیع آنگن کے چاروں طرف کمروں اور ان کے سامنے بنے ہوئے دالانوں کی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔ مغل فن تعمیر کا ایک اہم کارنامہ مغربی جمنا نہر بھی ہے۔ یہ نہر شاہ جہاں کے عہد میں بنائی گئی تھی۔ 250 کلومیٹر لمبی مغربی جمنا نہر اینٹ اور چونے سے بنی ہوئی بھاری بھاری نلکیوں کے ذریعے دہلی تک جمنا ندی کی سطح سے کافی اونچائی پر پہنچتی تھی۔ مغل عمارت سازی کی ایک ندرت ان کے ذریعے تعمیر کیے گئے باغات بھی ہیں۔ یہ باغات عام طور پر مغلوں کی بڑی عمارتوں خاص طور پر مقبروں کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ ایسے باغات عام طور پر چار حصوں میں منقسم ہوتے تھے۔ ہر حصے میں پھولوں کی کیاریاں اور پھلوں کے درخت، ان کی آبیاری کے لیے حوض، تالاب، کنویں اور پختہ نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ بعض اوقات ان کے درمیان ایسے بنگلے یا شہ نشین بنے ہوتے تھے، جن میں کمرے ہوں اور ان پر گنبد کا چھت ہو۔ زیادہ تر ایسے باغات ذاتی ملکیت میں تھے، لیکن بعض میں عام لوگوں کو اندر جانے کی اجازت تھی۔

مغل طرز تعمیر کی انھیں خصوصیتوں کی بنا پر اس عہد میں مغل طرز تعمیر کی نقالی کا عام رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں آمیر کے حکمرانوں نے خاص کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے پہلے پہل سترہویں صدی عیسوی میں مشرقی راجستھان میں آمیر کے محلوں کا پورا سلسلہ تعمیر کیا اور پھر اٹھارہویں صدی عیسوی میں جے پور کا پورا نیا شہر آباد کیا۔ اس کے علاوہ 1590ء میں متھرا کے قریب ورندا بن کے مقام پر اکبر کے امیر آمیر کے حکمراں مان سنگھ نے گووند دیو کا مندر تعمیر کرایا، جس میں مغل طرز تعمیر پوری طرح جھلکتا ہے۔ اس بڑی عمارت کو گنبد اور ڈاٹوں سے اس طرح ڈھکا گیا ہے کہ مرکزی کمرے کے اوپر بنے ہوئے گلیارے ایک صلیب کی شکل اختیار کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ عمارت کسی کلیسا سے مشابہ نظر آتی ہے۔ جہانگیر کے عہد میں بیر سنگھ بندیلہ کے ذریعے بنوائے گئے چتر بھج کے مندر میں بھی مغل طرز تعمیر کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ امرتسر میں واقع سکھوں کے ہرمندر جو گولڈن ٹمپل کے نام سے مشہور ہے، میں بھی مغل طرز تعمیر کی بنیادی خصوصیت یعنی محراب

اور گنبد کے ساتھ ساتھ بہت سارے مغل طرز کے نمونوں کی جھلک صاف دکھائی پڑتی ہے۔

مغل طرز تعمیر کی اپنی خوبیوں کے باوجود اس عہد یعنی سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی میں دکن کی سلطنتوں میں فروغ پانے والے طرز تعمیر کو کسی بھی طرح سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 1591ء کا بنا ہوا حیدر آباد کا چار مینار ایک دروازے کی عمارت ہے، جس میں چاروں سمتوں میں باہر جانے کا راستہ ہے۔ ایک دوسرے پر کھڑے ستونوں کی قطاروں کے ذریعے اس عمارت کی کئی منزلیں اوپر اٹھتی ہیں اور اس کے چاروں کونوں پر چار بھاری بھرکم مینار ہیں، جو اس شہر کی پہچان بن گئے ہیں۔ بیجاپور میں محمد عادل شاہ (وفات 1656ء) کا مقبرہ واقع ہے، جس کو لوگ گول گنبد کے نام سے جانتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک فنی امتیاز یہ ہے کہ اس کا گنبد ہندوستان میں تعمیر شدہ سب سے بڑا صحیح گنبد ہے۔ اس عہد میں جنوبی ہندوستان کے مندروں کی تعمیر میں دراوڑی طرز ہی نمایاں رہا۔ اس بات کا انداز مدورا کے میناکشی سندریشور کے مندر اور رامیشورم کے لنگیشور مندر سے لگایا جا سکتا ہے، جو بالترتیب سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئے۔ آخر الذکر مندر میں 650 میٹر طویل ایک اندرونی غلام گردش ہے، جس کی چھت سنگ تراشی سے مزین بھاری ستونوں پر استوار ہے۔ دراوڑی طرز تعمیر کیرل میں بھی جا پہنچا تھا۔ تری وندرم میں تعمیر شدہ پدم نبھ سوامی کا مندر اسی طرز کا بنا ہوا ہے۔ اس مندر میں بڑے پیمانے پر لکڑی کا استعمال کیا گیا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا تنجاور کا ایک مندر گرچہ باہر سے عام مندروں کی مانند ہے، لیکن 60 میٹر اونچائی والے اس مندر کے بالائی حصے پر کسی قلعے کی برجی کی شکل کو تعمیر کرنے کے لیے محرابی طرز تعمیر بروئے کار لایا گیا ہے۔

17.8 خلاصہ

عالمی تاریخ میں بالعموم اور مسلم و ہندوستانی تاریخ میں بالخصوص مغل دور حکومت کو ایک امتیازی مرتبہ و مقام حاصل ہے۔ یہ مرتبہ و مقام اسے سیاسی عروج و استحکام کی بنا پر حاصل نہیں ہوا بلکہ اس دور حکومت میں جس طرح سے تہذیبی و تمدنی جلوے بکھیرے گئے اور علوم و فنون اور سائنس و حکمت کے شعبوں میں جو کارنامے انجام دیے گئے، اس کا نتیجہ ہے۔ مغل دور حکومت میں پورے ملک میں علمی و عملی سرگرمیاں انجام دی گئیں۔ اس کے لیے ملک کے ہر حصے میں اسکول و مدارس کا جال بچھایا گیا، اعلیٰ تعلیمی ادارے قائم کیے گئے، طلبہ کے لیے رہائش گاہوں اور کتب خانوں کا انتظام کیا گیا اور انھیں ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ ملک میں تعلیمی فضا ہموار ہو۔ ملک میں علمی و تعلیمی فضا ہموار کرنے میں حکمراں، امراء اور عوام الناس سبھی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیے اور ان کے یہ علمی کارنامے علم کے تمام شعبوں پر محیط ہیں، چاہے وہ مذہبی علوم ہوں یا فنی اور سائنسی۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں علماء، فضلاء اور دانشوروں کا پورا ایک قافلہ رواں دواں نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پورے ملک میں ادبی سرگرمیوں کا ایک سیلاب امڈ آیا ہو۔ اس ادبی سیلاب سے ملک کی تمام زبانیں اور بولیاں سیراب ہو رہی ہیں، چاہے وہ سرکاری یا قومی زبانیں ہوں چاہے صوبائی یا علاقائی۔

مغل عہد حکمت میں ان علمی، تعلیمی، سائنسی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ فن لطیف کے تمام شعبوں میں بھی بڑے پیمانے پر کارنامے انجام دیے گئے۔ ہندوستان نے مغل دور حکومت میں مصوری کے میدان میں عالمی شہرت حاصل کی۔ اسی طرح موسیقی، خطاطی اور صنعتی فنون کو بھی اس عہد میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ فن تعمیر مغل دور حکومت کے تہذیبی و ثقافتی مظہر کا ایسا شعبہ ہے، جس میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ مغل

عہد حکومت میں ملک کا کوئی بھی ایسا حصہ باقی نہیں بچا، جہاں پر انھوں نے اپنے اعلیٰ تعمیراتی نمونے کے مظاہر نہ چھوڑے ہوں۔ اس لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی تہذیب وثقافت کے فروغ میں مغل دور ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

17.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. مغل دور کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیجیے۔
2. مغل عہد کی علمی و سائنسی ترقی پر ایک مضمون لکھیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

3. فنون لطیفہ میں مغلوں کی حصہ داری کی وضاحت کیجیے۔
4. مغل دور کی تعمیراتی ترقیوں کا جائزہ لیجیے۔

17.10 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ عہد اسلامی میں تعلیمی ترقی، پروفیسر این این لا، اردو ترجمہ: اخلاص حسین زبیری وسلطان فاطمہ بلخی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی

2۔ عہد وسطیٰ کا ہندوستان: ایک تہذیب کا مطالعہ عرفان حبیب، اردو ترجمہ: اقتدار عالم خاں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، 2010ء

3۔ اسلام اور ہندوستانی ثقافت، بی این پانڈے، اردو ترجمہ: تقی رحیم، خدا بخش اورینٹل، پبلک لائبریری، پٹنہ 1998ء

4۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ جلد دوم: ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

5۔ اسلامی ہند میں علوم عقلیہ، شبیر احمد خاں غوری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1997ء

6۔ رودِ کوثر، شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

7۔ آئین اکبری، ابوالفضل، اردو ترجمہ: مولوی محمد فدا علی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

8۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی کارنامے، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

اکائی 18 : دورِ زوال اور حکومت کا خاتمہ

اکائی کے اجزاء

18.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو مغل سلطنت کے زوال اور خاتمے کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے اور انھیں اس بات سے واقف کرانا ہے کہ وہ کون سے حالات اور اسباب تھے، جن کی وجہ سے ایک ایسی حکومت جس نے ہندوستان پر صدیوں حکومت کی، اپنی مضبوطی و پائیداری اور وسعت میں اپنی مثال آپ ہے، زوال کا شکار ہوئی۔ اس اکائی کا مقصد طلبہ کو عہد زوال کے حکمرانوں سے متعارف کرانا بھی ہے۔ اس کے ساتھ اس اکائی میں مغل سلطنت کے زوال میں کارفرما عوامل اور محرکات کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا جائے گا تاکہ طلبہ ان تمام حقائق سے بخوبی واقف ہوسکیں اور انھیں اس بات کی آگہی ہو کہ مغل سلطنت کیوں کر روبہ زوال ہوئی؟

18.2 تمہید

پچھلی اکائیوں میں آپ ہندوستان میں مغل حکومت کے قیام، عروج واستحکام اور مسلم وہندوستانی تہذیب وتمدن میں ان کے ذریعے کیے گئے اضافے کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اس مطالعے کے بعد آپ بخوبی واقف ہو چکے ہوں گے کہ ہندوستانی تاریخ اور تہذیب وثقافت میں مغلوں کا اضافہ غیر معمولی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ گزشتہ حکومتوں سے زیادہ ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایک ایسی حکومت، جس نے اپنے عروج واستحکام کے زمانے میں ترقی کے اعلیٰ منازل کو طے کیا تھا، 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی زوال کا شکار ہوگئی۔ پھر اس کے بعد اس سلطنت میں کوئی بھی ایسا حکمراں نہیں پیدا ہو سکا جو اس زوال اور سکوت کو

روک سکے بلکہ دھیرے دھیرے سلطنت مغلیہ سمٹتی گئی اور 1857ء میں پوری طرح سے اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

18.3 سلطنت مغلیہ کا زوال

یہ نہ صرف ایک تاریخی حقیقت بلکہ قانون فطرت بھی ہے کہ ہر عروج کے لیے زوال ہے اور اس بات کا اطلاق فرد کی انفرادی زندگی سے لے کر سماج اور قوم کی اجتماعی زندگی تک ہر سطح پر ہوتا ہے، اگر ہم اقوام عالم کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی تاریخ کے کسی دور میں ترقی اور عروج کے منازل طے کیے۔ عروج اور ترقی کی ایک خاص سطح پر پہنچنے کے بعد ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اسی لیے عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ کسی بھی قوم کی ترقی کا نقطۂ انتہا ہی اس کے زوال کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ حکومتوں اور قوموں کی ترقی وخوش حالی اور عروج واستحکام کے زمانے میں ارباب اختیار واقتدار کی جانب سے جو بے اعتدالیاں ہوتی ہیں، اگر وقت پر ان کے تدارک کے اقدامات نہیں کیے جاتے، تو بہت جلد وہ مرض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ یہی مرض ان کے زوال وادبار اور ہلاکت وخاتمے کا سبب بن جاتا ہے۔ ہندوستان کی سلطنت مغلیہ کے عروج وزوال میں بھی یہی فطری قانون پنہاں نظر آتا ہے۔ ہندوستان کی عظیم مغلیہ سلطنت کا آغاز 1526ء میں پانی پت کی پہلی جنگ میں ابراہیم لودھی کی شکست اور ظہیر الدین محمد بابر کی تخت نشینی سے ہوا۔ جلد ہی اس خاندان کے حکمرانوں نے اس حکومت کو وقت کی ایک اہم اور عظیم سلطنت میں تبدیل کر دیا، جو جنوبی ایشیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے ہی ہندوستان میں مغل سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہو گیا۔ اسی وجہ سے ہندوستانی تاریخ میں اورنگ زیب کی وفات کو ایک عہد کے خاتمے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اورنگ زیب کی وفات کے پچاس سالوں کے اندر ہی پوری مغلیہ سلطنت بکھر چکی تھی۔

عام طور پر مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے تصور کی جاتی ہے، جب کہ اس کی علامتیں، خاص طور پر زرعی بد عملی اور جاگیرداری نظام کی بڑھتی ہوئی پریشانیوں کی صورت میں بہت پہلے شمالی ہند میں بھی ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ مغلوں نے عام بے چینی کو دور کرنے کی غرض سے بعض رعایتیں دیں۔ مثلاً 1713ء میں جزیہ موقوف کر دیا گیا۔ بہادر شاہ اول نے مراٹھوں کو خوش کرنے کے لیے شیواجی کے پوتے شاہو کو قید سے آزاد کر دیا۔ راج پوت سرداروں کا اونچے منصبوں اور گورنوں کے عہدوں پر تقرر کیا گیا، لیکن ان تمام کے باوجود بھی دربار میں اندرونی خلفشار بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہر نئے حکمراں کے تخت پر آنے کے وقت مختلف دعوے داروں کے درمیان جنگوں نے اس خلفشار کو بڑھاوا دیا۔ محمد شاہ کے عہد میں مرکزی حکومت بتدریج کمزور ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ گورنروں نے اپنے تبادلے کے احکام کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا شروع کر دیا اور خود مختار بنتے چلے گئے۔ یہ بات خاص طور پر دکن کے وائس رائے اور بنگال واودھ کے صوبے داروں پر صادق آتی ہے۔

ان حالات کے پیدا ہونے سے مغلوں کی عسکری طاقت کمزور ہو گئی۔ مختلف قسم کے آتشی ہتھیاروں مثلاً توپ بندوق وغیرہ کی بڑھتی ہوئی قوت اور میدان جنگ میں گھڑ سوار تیر اندازوں کی برتری تیزی کے ساتھ ماند پڑنے لگی۔ اس وجہ سے منصب داری ایک عسکری نظام کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھوتی جا رہی تھی۔ 1737ء میں ایک لمبی جدوجہد کے بعد مراٹھوں نے مالوہ اور گجرات پر قبضہ جما لیا۔ اب وہ ان علاقوں پر مغل بادشاہوں کے حکمرانی کے دعوے کو برائے نام ہی قبول کرتے تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد یعنی 1739ء میں نادر شاہ کی رہنمائی میں ایرانی

حملے نے مغل سلطنت کی حالت کو مزید ابتر کر دیا۔ دہلی پوری طرح سے تاراج کر دیا گیا اور وہاں پر جو دولت موجود تھی اسے لوٹ لیا گیا۔ اسی طرح سے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع صوبہ کابل کا پورا علاقہ اب مغلوں کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور اس کے ساتھ سندھ کا صوبہ بھی چلا گیا۔ اس تباہی نے مغل سلطنت کے زوال کے عمل کو مزید تیز کر دیا۔ پنجاب میں سکھوں کی بغاوتیں بھڑک اٹھیں۔ روہیلہ سرداروں نے دہلی کے مشرق میں واقع علاقوں پر اپنا دبدبہ قائم کر لیا۔ جاٹوں نے اپنے سردار سورج مل کی رہنمائی میں دہلی کے جنوب میں حکومت قائم کر لی۔ دور دراز کے صوبوں پر بھی اب عملی طور پر کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں مراٹھا طاقت تیزی سے ابھری اور 1771ء سے 1803ء تک مغل شہنشاہ مراٹھا سرداروں کے کنٹرول میں رہا۔ 1803ء میں انگریزوں نے انھیں دہلی سے بے دخل کر دیا اور اب مغل شہنشاہ انگریزوں کے کنٹرول میں آ گیا۔ بالآخر 1857ء میں انگریزوں نے مغل سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

18.4 دورِ زوال کے حکمراں

اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی اس کے بیٹوں میں جانشینی کے لیے جنگ شروع ہو گئی۔ جس کا خاتمہ بڑے بیٹے محمد معظم کی فتح اور جانشینی کے ساتھ ہوا۔ جس وقت محمد معظم مغل سلطنت کا حکمراں بنا اس وقت اس کی عمر 65 سال تھی۔ محمد معظم (1707ء-1712ء) نے بہادر شاہ اول اور شاہ عالم اول کے نام سے پانچ سال تک حکومت کی۔ اس عہد میں آسام بھی سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا تھا، جب کہ دیگر بہت سے علاقے مغل سلطنت سے الگ ہونا شروع ہو گئے۔ اورنگ زیب کے تحت گیر دور حکومت کی گھٹن کے نتیجے میں ملک بھر میں بغاوتیں سر ابھارنے لگی تھیں۔ جنوب اور مغرب میں مراٹھوں، شمال میں پٹھانوں، سکھوں اور جاٹوں کی بغاوتیں شدید ہو گئیں۔ بہادر شاہ اوّل نے مفاہمت اور مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور اس نے راجپوتوں، مراٹھوں، بندیلوں، جاٹوں اور سکھوں سے مصالحت اور تال میل کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود بھی اس دور میں مراٹھے اور سکھ طاقتور ہوتے گئے۔ مغلیہ سلطنت کے پاس اب کوئی ایسا لیڈر نہیں رہا تھا جو ان تمام بغاوتوں کو کچل سکتا۔ بہت سے مسلم منصب داروں نے بھی بغاوتیں کرتے ہوئے اپنی اپنی ریاستوں کی آزادی کا اعلان کرنا شروع کر دیا تھا۔ 1712ء میں 69 سال کی عمر میں بہادر شاہ اول کا انتقال ہوا اور دہلی میں مشہور صوفی بزرگ بختیار کاکی کے مزار کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

جانشینی کے لیے جنگ مغلیہ خاندان کا ایک خاصہ تھی اور بہادر شاہ اول کے انتقال کے بعد اس میں مزید شدت آئی۔ اس کی سب سے بنیادی وجہ امراء و روٴسا کا طاقتور ہونا شمار کیا جاتا ہے، حکومت میں اعلیٰ مناصب کے حصول کے لیے امراء کے مختلف گروہ جانشینی کے الگ الگ دعوے داروں کا ساتھ دیتے، جس کا آخری فیصلہ جنگ کے ذریعہ ہوتا۔ جہاں دار شاہ (1712ء-1713ء) جو بہادر شاہ اول کا جانشین ہوا وہ ایک کمزور اور نااہل حکمراں تھا، مغل حکمرانوں میں اس کا شمار ایک کٹھ پتلی بادشاہ کے طور پر ہوتا ہے۔ بادشاہ کی نااہلی اور مضبوط قیادت کے بحران کی وجہ سے دربار میں سازشیں عروج پر پہنچ گئی تھیں، جہاں دار شاہ نے صرف ایک سال حکومت کی اور مغل سلطنت کے اگلے حکمراں یعنی فرخ سیر (1713ء-1719ء) کے ذریعہ قتل کر دیا گیا۔ فرخ سیر اس دور کی درباری سازشوں کا پیداوار تھا اور خود بھی اسی کا شکار ہوا۔ فرخ سیر نے درباری سازشوں سے وجود میں آنے والی خفیہ بادشاہ گر طاقت یعنی سادات برادران کی مدد سے اپنے پیش رو کو قتل کر کے حکومت پر قبضہ کیا اور چھ سالوں تک انھیں کے اشاروں پر ناچتا رہا، جو اس عہد میں مغلیہ سلطنت کے حقیقی حکمراں تصور کیے جاتے تھے۔ بالآخر جب فرخ سیر نے ان سے نجات کی کوشش کی تو نہ صرف حکمرانی سے برطرف ہوا بلکہ انھیں کے ہاتھوں قتل بھی کیا گیا، اس دور کی ایک اہم بات یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے

ایک فرمان جاری کیا گیا، جس میں انھیں بنگال میں بلا محصول تجارت کی اجازت دی گئی تھی۔

مغلیہ سلطنت پر سادات برادران کی پوری گرفت قائم ہو چکی تھی اور انھوں نے ایک ہی سال میں چار بادشاہ تبدیل کیے تھے، تاریخ میں جن کے نام رفیع الدرجات، رفیع الدولہ یا شاہجہاں دوم، نیکوسیار محمد اور محمد ابراہیم تحریر کیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد بہادر شاہ اول کا 18 سالہ پوتا محمد شاہ (1748ء-1719ء) سید برادران کی مدد سے تخت نشین ہوا۔ اس کے بعد اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے ہی محسنوں کو انجام تک پہنچا کر درباری سازشوں کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بھی اپنے آبا و اجداد کی تمام خوبیوں سے محروم تھا۔ آرام طلبی اور عیش پسندی اس کے یہاں بڑے پیمانے پر تھی انتظامی صلاحیت، تدبر اور دور اندیشی سے کوسوں دور تھا۔ اس لیے اسے تاریخ میں بجا طور پر محمد شاہ رنگیلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ محمد شاہ کا 30 سالہ دور حکومت سلطنت مغلیہ کو دوبارہ مستحکم کرنے کا آخری موقع تھا۔ کیوں کہ اس عہد کی ابتدا تک سلطنت مغلیہ کے اثر و رسوخ اور سیاسی اقتدار میں کوئی فرق نہ آیا تھا، یہ سلطنت اب بھی اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود بھی عوام الناس میں اپنا ایک سیاسی مقام رکھتی تھی اور ایک مضبوط، طاقت ور اور اولوالعزم حکمراں مغلیہ خاندان کی حکومت کو بچا سکتا تھا لیکن محمد شاہ اس اہم کام کے لیے کسی بھی طرح موزوں نہ تھا۔ حکومتی و انتظامی امور میں اس کی کوئی بھی دلچسپی نہ تھی اور اس نے کبھی بھی لائق و فائق وزراء کو مکمل تعاون نہ دیا۔ محمد شاہ کی اس کمزور حکمرانی اور امراء و رؤسا کی آپسی چپقلش کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چند مضبوط علاقائی امیروں نے اپنی خودمختار اور آزاد ریاستوں کی بنیا ڈالی، جن میں حیدرآباد، بنگال، اودھ اور روہیل کھنڈ کی ریاستیں قابل ذکر ہیں۔ یہ ریاستیں اپنے آپ میں خودمختار تھیں لیکن اس کے باوجود بھی سلطنت مغلیہ کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں اور اس کی وفادار تھیں۔ ان علاقائی ریاستوں کے ابھرنے کی وجہ سے مغل سلطنت دھیرے دھیرے کمزور ہوتی گئی اور انتشار کا شکار ہو گئی۔

داخلی انتشار، خودمختار ریاستوں کے وجود، کمزور انتظامیہ و فوج نے بیرونی حملہ آوروں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ مغل سلطنت کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1739ء میں ایرانی حکمراں نادرشاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جنگ میں اس نے آسانی کے ساتھ محمد شاہ کو شکست دے کر قید کر لیا۔ ہندوستان کے لیے نادرشاہ کا یہ حملہ بڑا تباہ کن ثابت ہوا۔ دہلی کے باشندے تین سو سال سے امن و امان کی زندگی گزار رہے تھے، تیمور کے قتل عام کے بعد سے ان کو کسی تباہی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا، لیکن نادرشاہ نے تیمور کی یاد تازہ کر دی۔ نادرشاہ نے نہ صرف دہلی کو بڑے پیمانے پر تاخت و تاراج کیا، قتل و غارت گری کی بلکہ اپنے ساتھ تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرے کے ساتھ ساتھ بے شمار مال و دولت اور خزانہ لوٹ کر ایران لے گیا۔ نادرشاہ کے اس حملے کے بعد مغل سلطنت کا رعب و دبدبہ لوگوں کے دلوں سے نکل گیا۔ ملک میں جگہ جگہ بغاوتیں سر ابھارنے لگیں۔ سلطنت کے بکھراؤ میں مزید تیزی آ گئی۔ مغل صوبے داروں نے مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اپنے صوبوں میں آزاد حکومتیں قائم کر لیں، جن کا تذکرہ پیچھے گزر چکا ہے۔ مغل سلطنت اب صرف دہلی اور اس کے اطراف تک محدود ہو کر رہ گئی۔ محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ (1754-1748ء) عالم گیر دوم (1759ء-1754ء) اور شاہ عالم دوم (1806ء-1759ء) مغل سلطنت کے اس زوال کو نہ روک سکے۔ ان حکمرانوں کی حیثیت امرائے سلطنت کے ہاتھوں میں ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ امراء مختلف گروہوں میں منقسم تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ یہ امراء اپنے مقاصد کے حصول اور مخالف کو شکست دینے کے لیے اپنے دشمنوں سے مدد لینے میں بھی کوئی عار یا ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے تھے۔ اسی دور میں شہاب الدین نامی ایک امیر کا اثر و رسوخ مغل دربار میں اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے پہلے احمد شاہ کو معزول کر کے اسے اندھا کر دیا اور پھر اس کے جانشین عالم گیر دوم کو قتل کر کے اس کے لڑکے شاہ عالم دوم (1806ء-

1759ء) کی بادشاہت کا اعلان کردیا۔لیکن شاہ عالم خوف کی وجہ سے دہلی سے فرار ہوکر الہ آباد چلا گیا اور وہاں پہلے اودھ کے نوابوں اور پھر انگریزوں کی پناہ حاصل کی، جو بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد الہ آباد تک پہنچ چکے تھے۔جہاں ایک طرف مشرق سے انگریز دہلی کی طرف بڑھ رہے تھے،وہیں دوسری طرف شمال مغرب سے احمد شاہ ابدالی، جو نادر شاہ کے بعد افغانستان کا حکمراں بن چکا تھا، دہلی سلطنت کے صوبوں پر حملے کررہا تھا۔وہ 1756ء میں دہلی پر قابض بھی ہو چکا تھا اور شہاب الدین کو دہلی سے بے دخل کر کے واپس بھی چلا گیا تھا۔اس کی واپسی پر شہاب الدین نے مراٹھوں کی مدد سے دہلی پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ہندوستانی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مراٹھے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے۔اس کے بعد وہ لاہور تک بڑھتے چلے گئے اور ابدالی کے عہدے داروں کو لاہور سے نکال دیا۔مراٹھوں کی اس بڑھتی ہوئی طاقت سے ہندوستانی مسلم دانشوروں اور امراء کو تشویش لاحق ہوئی۔خاص طور پر شاہ ولی اللہ دہلوی، روہیلہ سردار نواب نجیب الدولہ اور چند دوسرے امراء نے مراٹھوں کا زور توڑنے کے لیے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی دعوت دی۔ابدالی اس دعوت پر ایک بار پھر ہندوستان آیا۔دہلی کے قریب پانی پت کے میدان میں جنوری 1761ء کو ابدالی اور مراٹھوں کی جنگ ہوئی۔اس جنگ میں مراٹھوں کو شکست ہوئی اور ان کے کئی بڑے بڑے سپہ سالار مارے گئے۔پانی پت کی اس جنگ میں فتح یاب ہونے کے باوجود بھی احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم نہیں کی بلکہ اس نے شاہ عالم کو جوان دنوں انگریزوں کی پناہ میں الہ آباد میں تھا تخت پر بحال رکھا۔اودھ کے شجاع الدولہ کو اس کا وزیر اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو اس کا سپہ سالار مقرر کیا اور احمد شاہ ابدالی خود افغانستان واپس چلا گیا۔

1498ء میں پرتگالی ملاح واسکوڈی گاما کے ذریعے مغرب سے ہندوستان کا نیا بحری راستہ دریافت کرنے کے بعد جنوبی ایشیا کی طرف یورپی تاجروں کی آمد کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔جن میں پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز سبھی شامل تھے۔مغل سلطنت کے دور عروج میں ہی انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک میں تجارت کی اجازت حاصل کرلی تھی اور انھوں نے کولکاتہ، ممبئی اور چنئی وغیرہ میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرلی تھیں۔انھوں نے دھیرے دھیرے اپنی ان تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کرلیا اور وہ یہاں پر ہر قسم کا اسلحہ جمع کرنے لگے۔کولکاتہ میں ہگلی ندی کے قریب پرتگالیوں کی بھی اسی طرح کی ایک بستی تھی، شاہ جہاں کے عہد میں انھوں نے ہنگامہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن شاہی فوجوں نے ان کو وہاں سے بے دخل کردیا۔اورنگ زیب کے زمانے میں انگریزوں نے ممبئی میں ہنگامہ برپا کیا،لیکن ان کو بھی ناکامی ہوئی اور معافی تلافی کے بعد اورنگ زیب نے انھیں قیام کی اجازت دے دی،مگر دھیرے دھیرے جب مغل سلطنت زوال پذیر ہوئی اور پورا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہوگیا تو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی مراد بر آئی۔انھوں نے اپنے تجارتی قلعوں میں فوجوں کی تعداد بڑھالی اور کچھ علاقوں پر قبضہ بھی کرلیا۔انھوں نے سب سے زیادہ طاقت کرناٹک کے علاقے میں حاصل کی، جہاں چنئی شہر ان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔جب اس علاقے میں وہ طاقت ور ہوگئے،تو انھوں نے بنگال پر حملہ کیا۔یہ عالم گیر دوم کا دور تھا اور اس وقت بنگال کا حکمراں نواب سراج الدولہ تھا۔1757ء میں پلاسی کے مقام پر سراج الدولہ اور انگریزوں کی جنگ ہوئی۔اس جنگ میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔چند سالوں بعد 1764ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں نے بنگال کے سابق نواب میر قاسم اور اودھ کے نواب کو شکست دے کر الہ آباد پر بھی قبضہ کرلیا۔شاہ عالم نے 1765 میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کردی تھی،جس نے ان علاقوں سے محصول اکٹھا کرنے کا حق کمپنی کو دے دیا۔

پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ذریعہ گرچہ مراٹھوں کو شکست فاش ہوئی تھی اور چند سالوں کے لیے ان کا زور ٹوٹ گیا تھا، لیکن ان کی یہ شکست دائمی نہیں تھی ۔ چند سالوں بعد مراٹھوں نے پھر شمال کی جانب سے دہلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا اور 1772ء میں وہ پھر دہلی پر قابض ہو گئے ۔ شاہ عالم دوم جو اب تک انگریزوں کی سرپرستی اور پناہ میں تھا اب اس نے خود کو مراٹھوں کے حوالے کر دیا اور الہ آباد سے دہلی آ گیا ۔ اس دوران جاٹوں اور سکھوں کی بغاوتیں اور ان کے حملے جاری رہے ۔ شاہ عالم دوم کے عہد میں مرزا نجف خان کی سربراہی میں مغل فوج کو مضبوط بنانے اور ان کی تنظیم نو کی بھی کوشش کی گئی، مگر اس کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نظر نہ آیا ۔ 1788ء میں روہیلہ سردار غلام قادر نے دہلی پر قبضہ کر کے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دیں ۔ دہلی پر روہیلہ سردار غلام قادر کے قابض ہونے کے بعد فوراً مراٹھوں نے مہادجی شندے کی سربراہی میں جوابی کارروائی کی اور غلام قادر روہیلہ کو دہلی سے نکال کر شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بحال کیا ۔ لیکن اب حقیقی حکومت مراٹھوں کی تھی، شاہ عالم صرف نام کا بادشاہ تھا ۔ اسی لیے تاریخ میں یہ مثل مشہور ہے ۔ ''سلطنت شاہ عالم از دہلی تا پالم ۔''

اس یوروپی نو آبادیاتی دوڑ میں یورپ کے مختلف ممالک پوری دنیا میں اپنی نو آبادیاں بڑھانے میں لگے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے لیے خطرہ بھی بن رہے تھے ۔ اس کے اثرات ہندوستان میں بھی ظاہر ہوئے کہ جب اٹھارہویں صدی کے اخیر میں انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا کہ فرانسیسی یورپ اور دنیا کے تمام ممالک میں ان کے لیے خطرہ بن رہے ہیں اور اس کے نتائج ہندوستان میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں ۔ کیوں کہ دہلی کی مغل سلطنت پورے طور پر زوال پذیر ہو چکی ہے اور اس کے اندر کسی بھی حملے کی طاقت نہیں ہے ۔ 1795ء کے بعد مراٹھے بھی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے اور 1799ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد برصغیر ہند میں کوئی ایسی طاقت نہ رہی جو باہری حملے کا مقابلہ کر سکے ۔ انگریز مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے تقریباً پورے ہندوستان پر قابض ہوتے جا رہے تھے ۔ دکن کے نظام اور مراٹھوں کے ایک گروہ نے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی تھی ۔ 1803ء میں دہلی کے پاس انگریزوں نے مراٹھوں کے ایک دوسرے گروہ کو شکست دے کر دہلی، آگرہ اور علی گڑھ پر قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد مراٹھوں نے بھی مکمل طور پر انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی ۔ اب مغل سلطان شاہ عالم انگریزوں کی حفاظت میں چلا گیا اور انگریزوں نے لال قلعے میں بھی فوجی دستے تعینات کر دیے ۔

شاہ عالم کے بعد اس کے دو جانشین اکبر شاہ دوم (1806ء–1837ء) اور بہادر شاہ ظفر (1837ء–1857ء) بھی صرف لال قلعے کے حکمراں رہے اور انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنشن خوار ۔ 1857 میں جب انگریزی فوج کے ہندوستانی دستوں نے بغاوت کی تو انھوں نے دہلی پر قبضہ کر کے بہادر شاہ کو جنگ آزادی کی قیادت سپرد کرنی چاہی، لیکن بوڑھے بادشاہ کے اندر اس کام کی سکت نہ تھی ۔ نتیجتاً بغاوت یا پہلی جنگ آزادی ناکام ہو گئی ۔ انگریزوں نے دہلی پر دوبارہ قبضہ کر کے 22 ستمبر 1857ء کو بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر لیا ۔ لال قلعے میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور بغاوت کے جرم میں 9 مارچ 1858ء کو رنگون جلاوطن کر دیا گیا، جہاں 7 نومبر 1862ء کو انتقال ہوا ۔ اس طرح 1857ء میں اس مغل سلطنت کا خاتمہ ہو گیا، جس کی ابتداء 1526ء میں بابر کے ذریعہ ہوئی تھی ۔

18.5 مغل سلطنت کے زوال کے اسباب

یہ ایک تاریخی حقیقت اور فطری اصول ہے کہ ہر عروج کو زوال و انحطاط جھیلنا پڑتا ہے، اس کے بغیر اس دنیوی زندگی میں مفر نہیں ۔

مغل سلطنت، جس نے اپنے قیام کے بعد بڑا عروج واستحکام حاصل کیا اور اس عہد میں تہذیب وثقافت کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ آخر کار انیسویں صدی عیسوی میں اس کا بھی زوال ہوا۔ مورخین اور تاریخی تجزیہ نگاروں نے اپنے مطالعے کے مطابق مغل سلطنت کے زوال کے بہت سے اسباب اپنی تحریروں میں بیان کیے ہیں۔ ان اسباب میں سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور انتظامی تقریباً سبھی طرح کے اسباب وعوامل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان تاریخی کتابوں میں جو ہندوستانی تاریخ کے عہد وسطیٰ سے متعلق ہیں، ان میں حکمرانوں کی بے اعتدالیوں اور ان کی ان پالیسیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے مغل سلطنت رو بہ زوال ہوئی۔ ذیل میں مؤرخین اور تجزیہ نگاروں کے ذریعہ پیش کردہ ان اسباب وعوامل کا ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے تا کہ طلبہ مغل سلطنت کے زوال کے اسباب سے واقف ہو سکیں۔

18.5.1 جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی

مغلوں کے یہاں جانشینی کا کوئی واضح قانون نہ تھا، اس وجہ سے تقریباً سبھی حکمرانوں کی وفات کے وقت جانشینی کے لیے اس کے بھائیوں اور بیٹوں میں جنگ چھڑ جاتی تھی، کیوں کہ سبھی شہزادے اپنے آپ کو جانشینی کا اہل سمجھتے تھے۔ اس جانشینی کا آخری فیصلہ تلوار کے ذریعے ہوتا۔ جانشینی کے اس قانون کی عدم موجودگی میں درباری امراء اس کا غلط فائدہ اٹھاتے تھے اور اس طرح امراء کے درمیان گروہ بندی کی نوبت آتی تھی، جو اپنے ذاتی فائدے کے لیے مختلف طرح کی سازشیں کرتے تھے۔ اس بات کی واضح اور بین مثالیں ہم مغل تاریخ میں دیکھ اور پڑھ سکتے ہیں۔ شاہ جہاں کے آخری دور میں کس طرح مغل دربار منقسم تھا؟ اورنگ زیب کو حکمراں بننے کے لیے اپنے بھائیوں سے جنگ اور باپ کو قید کرنا پڑا۔ 1712ء میں بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جانشینی کے لیے ہونے والی جنگ میں ذوالفقار خان نے بادشاہ گر کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح سے 1713ء سے 1720ء تک سید برادران بادشاہ گر کا کردار نبھاتے رہے اور اس دور میں انھوں نے چار حکمرانوں کو تخت شاہی پر متمکن اور پھر اس سے معزول کیا۔ مغل دربار کے منظر نامے سے سید برادران کے غائب ہونے کے بعد میر محمد امین اور آصف جاہ نظام الملک بادشاہ گر کا کام کرتے رہے۔ اس لیے بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی نے مغل حکومت کے زوال میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

18.5.2 اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت افتراق وانتشار کا شکار ہوگئی۔ تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اورنگ زیب اس بات کو محسوس کرنے میں ناکام رہا کہ اس عظیم مغل سلطنت کا قیام واستحکام عوام الناس کے تعاون پر منحصر ہے، جس کے لیے ان کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنا حکومت کے لیے بے حد ضروری ہے۔ لیکن بعض مؤرخین کی نظر میں اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیاں ملک کے اکثریتی فرقے یعنی ہندوؤں کے خلاف رہیں، جن کی وجہ سے حکومت کو نہ صرف اس گروہ کا تعاون نہیں ملا بلکہ وہ حکومت مخالف سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ اس لیے اورنگ زیب کی یہ مذہبی پالیسیاں مغل سلطنت کے زوال کی سب سے اہم وجہ بیان کی جاتی ہیں۔ اورنگ زیب کی انھیں مذہبی پالیسیوں کی وجہ سے ہندو معاشرے میں بہت سے افراد اورنگ زیب کے نام سے بھی اسی طرح متنفر ہوتے ہیں، جس طرح انھیں محمود غزنوی اور محمد غوری کے ناموں سے نفرت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بہت سارے لوگ ہندوؤں کے سیاسی حقوق کے نام پر بھی اورنگ زیب کو برا بھلا کہتے ہیں۔

مذہبی معاملات میں اورنگ زیب کی منفرد پالیسیوں کی ابتدا اس کے حکمراں بننے کے ساتھ ہی ہو جاتی ہے۔ 1658ء میں حکمراں بننے کے ایک سال کے بعد ہی عوام الناس کی اخلاقی صورت حال کی دیکھ ریکھ کے لیے اس نے ملک کے تمام بڑے شہروں میں محتسب متعین کر دیے۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ تمام معاملات میں اسلامی شریعت کی پابندی کی جائے اور وہ اعمال جو اسلامی شریعت میں ناپسندیدہ ہیں، جیسے شراب نوشی اور جوا وغیرہ، ان کے کھلے عام استعمال پر پابندی عاید کر دی گئی۔

فتح پور سیکری، آگرہ اور دہلی کے وہ تعمیراتی نمونے، جو فن تعمیر میں اپنی ایک مخصوص پہچان رکھتے ہیں، ان میں اورنگ زیب کے لیے کوئی دلچسپی اور کشش نہ تھی۔ اس طرح سے وہ موسیقار جو اورنگ زیب کے پیش روؤں کے دربار سے منسلک تھے، اس عہد میں انھیں دربار سے الگ کر دیا گیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی حکومت کے حصول کی کوشش میں اورنگ زیب کا وہ رویہ جو اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اختیار کیا اور ان کے ساتھ جس طرح کا برتاؤ کیا، وہ اورنگ زیب کی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے کافی تھا، کیوں کہ وہ خود کو حقیقی شریعت کے پابند کے طور پر پیش کرتا تھا۔

ہندو عوام سے متعلق اورنگ زیب کی پالیسیوں کے اثرات 1668ء سے ظاہر ہونے شروع ہوئے۔ 1668ء میں ہندو مذہبی میلے غیر قانونی قرار دے دیے گئے اور 1669ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعے نئے ہندو مندروں کی تعمیر اور قدیم مندروں کی مرمت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ 1669ء میں ہی اورنگ زیب نے اس شاہی درشن کی رسم کو بھی ختم کر دیا، جس کی ابتدا اکبر کے عہد میں ہوئی تھی کہ بادشاہ اپنی ہندو عوام کے سامنے ظاہر ہو کر انھیں اپنا 'درشن' یعنی دیدار کراتا تھا اور نیک خواہشات و دعائیں دیتا تھا۔ 1679ء میں ملک کی غیر مسلم عوام پر جزیہ نافذ کر دیا گیا، ایک تاریخی ماخذ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ لال قلعے کے اطراف میں ہاتھیوں کو تعینات کیا گیا کہ اگر کوئی جزیہ وصول کرنے والوں کو جزیہ دینے سے منع کرتا ہے تو اسے کچل کر مار دیا جائے۔ مؤرخ John F Richards کا مجہول سا خیال ہے کہ ''اورنگ زیب کا حقیقی مقصد غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنا تھا۔ جب بھی موقع ملتا بادشاہ نو مسلموں کو عزت و احترام، قیمتی تحائف اور اعلیٰ عہدوں سے نوازتا۔ اس طرح جلد ہی یہ بات عام ہو گئی کہ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تبدیلی مذہب سب سے اچھا طریقہ تھا۔''

سکھوں کے معاملے میں بھی اورنگ زیب کی پالیسیوں کو مغل حکومت کے لیے سودمند نہیں سمجھا جاتا۔ خاص طور سے گرو تیغ بہادر کی پھانسی کو بہت بڑی حکومتی غلطی شمار کی جاتی ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گرو تیغ بہادر کو پھانسی دے کر اورنگ زیب نے تمام سکھوں کو مغل سلطنت کا دشمن بنا دیا، جنھوں نے بعد کے ادوار میں گرو گوبند سنگھ کی سربراہی میں نہ صرف بڑی فوجی طاقت حاصل کر لی بلکہ مغل حکمرانوں کے لیے مصیبتیں بھی کھڑی کیں اور حکومت کے زوال کا سبب بنے۔ مؤرخین کے بیان کے مطابق اسی طرح مذہبی تشدد کی پالیسی مراٹھوں کے ساتھ بھی اپنائی گئی، جس نے انھیں شیواجی کی سربراہی میں ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔ اس تشدد آمیز اور متعصّبانہ رویے نے ہندوؤں کے کردار کو تخت بنا دیا اور وہ مغلوں کے سخت دشمن بن گئے۔ لین پول کے مطابق ''شیواجی سے متعلق اورنگ زیب کی پالیسی نے طاقت و قوت کے ایک مرکز کو پنپنے کا موقع فراہم کیا، جو اس کی سلطنت کے لیے ایک کامیاب حریف ثابت ہوئے۔''

اگر تاریخی حقائق اور ماخذ کا موازنہ اور تجزیہ کیا جائے تو شاید یہ بات مشتبہ معلوم ہو کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسیاں ہندوؤں، سکھوں اور دوسری غیر مسلم اقوام کے لیے امتیاز پر مبنی تھیں۔ پروفیسر عرفان حبیب لکھتے ہیں کہ ''مغل بادشاہ مذہبی قوانین اور مروجہ دستوروں اور ضوابط کو

تبدیل کرنا اپنی ذمے داری نہیں سمجھتے تھے۔ہاں یہ ضرور ہے کہ جن معاملات میں مذہبی قوانین ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے، وہاں شہنشاہ کو کچھ اختیار تھا۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر اور جہاں گیر کے عہد میں بعض علاقوں میں گائے کشی پر پابندی تھی جو ہندوؤں کے رواج کے مطابق تھا۔دوسری طرف اورنگ زیب کا ہندوؤں پر جزیہ نافذ کرنا مسلم قانون کے مطابق تھا۔یہی بات اورنگ زیب کے ہاتھوں بعض مندروں کے منہدم کیے جانے کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔عورتوں کو زبردستی ستی پر مجبور کیے جانے کے خلاف حکم یقیناً ایک علیحدہ قسم کا قدم تھا۔اس کے پیچھے کوئی مذہبی ہدایت نہیں تھی بلکہ صرف انسانیت کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔''

بہر حال تاریخی ادب سے بہت سے خلاصے اور تجزیے تیار کیے گئے ہیں، جن پر تاریخی ماٰخذ اور حقائق شاید نہیں ہیں۔گرچہ بہت سے مؤرخین نے ہندوؤں کی تبدیلی مذہب پر اپنی تحریریں چھوڑی ہیں، مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ شواہد بہت کم ہیں۔اگر پیشکش کا کوئی ثبوت موجود بھی ہےتو یہ بات دیکھنے کے قابل ہے کہ کتنے ہندوؤں نے مذہب تبدیل کیا اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ کیا ایک بھی کوئی ایسی سرکاری پالیسی تھی جو ہندوؤں کے تبدیلِ مذہب کی حوصلہ افزائی کرتی تھی؟ اسی طرح اورنگ زیب کی اس تصویر اور شبیہ کی حقیقت کیا ہے کہ وہ ایک زبردست مندر شکن اور بت شکن تھا؟ دکن میں اورنگ زیب کی وسیع فوجی مہمات کے باوجود بھی شاید ہی کبھی اس علاقے میں ہندو مندر مسمار کیے گئے ہوں۔یہ حقیقت ہے کہ شمالی ہندوستان میں بلاشبہ کچھ ہندو مندروں کو ڈھادیا گیا، لیکن زیادہ اہم اور ضروری کام ان وجوہات کی حقیقی نشان دہی ہے جن کے تحت عین مطابق حالات قائم رکھنے کے لیے اس طرح کی تباہی کے کام انجام دیے گئے۔متھرا کا مشہور کیشورائے مندر اس طرح کے مندروں میں سے ایک ہے، لیکن یہاں اورنگ زیب کی مسمارانہ پالیسی انتقامی کارروائی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے، جہاں سے اس علاقے میں جاٹوں کو بغاوت کے لیے شہہ مل رہی تھی۔اپنے پیش روؤں کی طرح اورنگ زیب نے بھی ہندو مندروں، جیسے کہ الہ آباد میں سومیشور ناتھ مہادیو مندر، بنارس میں جنگم باڑی شیو مندر اور گوہاٹی میں اما نند مندر کو جاگیریں عطا کرنے کی پالیسی برقرار رکھی۔اگر کوئی بھی شخص حکمراں کے اس عمل کو صرف مصلحت قرار دیتا ہےتو ٹھیک اسی طرح سے مندروں کی مسماری کے معاملے کو حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی کے بجائے مصلحت کا معاملہ کیوں نہیں تصور کیا جاسکتا؟ مزید برآں موجودہ تاریخی ماٰخذ اس بات کے شاہد ہیں کہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندو منصب داروں، عدالتی حکام، ریاستی منتظمین اور دوسرے سرکاری عہدے داروں کی تعداد 24.5 فیصد تھی، جب کہ اورنگ زیب کے عہد کی چوتھی دہائی میں یہ تعداد بڑھ کر 33 فیصد ہوگئی تھی۔اسی طرح یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ ایک راسخ العقیدہ سنی کے طور پر اورنگ زیب نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ کیا، جس طرح اس نے ہندو اور دوسری غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔کوئی بھی آدمی بآسانی اس بات پر زور دے سکتا ہےاور یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اورنگ زیب نے اپنی مسلم قوم کے مفادات کو محفوظ کرنے، ان میں اضافہ کرنے اور سنی علما کی مراعات کو بحال کرنے کے لیے کام کیا، لیکن ہندوؤں، شیعوں اور دوسرے لوگوں سے متعلق اورنگ زیب کے فرامین اور کارنامے اتنے واضح ہیں کہ ان کی تشریح کی ضرورت نہیں۔ڈاکٹر ستیش چندرا کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کو اس وقت کے سیاسی، سماجی اور معاشی سیاق میں دیکھا جانا چاہیے۔

18.5.3 اورنگ زیب کی دکنی پالیسی

اورنگ زیب کی دکنی پالیسی بھی مغل حکومت کے زوال کے لیے کچھ حد تک ذمہ دار رہے۔اورنگ زیب مراٹھوں کی طاقت کو پوری طرح

سے ختم کرنے میں مصروف تھا۔اس کا خیال تھا کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں مراٹھوں کے لیے امداد کا ماخذ ہیں، جہاں پر وہ بڑے پیانے پر ملازم تھے۔ان دونوں ریاستوں میں مراٹھے شہری اور انتظامی امور کے اہم عہدوں پر فائز تھے اور ان ریاستوں کی فوجوں میں بھی ان کی بڑے پیانے پر بھرتی ہوتی تھی۔اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر ان دونوں ریاستوں کا صفایا کر دیا جائے تو مراٹھوں کو حاصل ہونے والے تعاون کا خاتمہ ہو جائے گا۔مزید برآں یہ دونوں ریاستیں شیعی مسلک کی پیروکار تھیں،اس کے مقابلے میں مغل حکومت سنی مسلک کی سربراہی کر رہی تھی۔ان دونوں ریاستوں سے مغل حکومت کی دشمنی کی ایک اہم وجہ مسلکی منافرت بھی تھی۔اس وجہ سے اورنگ زیب کا خیال تھا کہ اگر یہ دونوں ریاستیں ختم ہو جائیں تو مراٹھوں کو سیدھا مغل حکومت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا اور اس کی ان کے پاس طاقت نہیں ہے۔اپنے ان مقاصد کے تحت اورنگ زیب خود دکن پہنچا اور اس نے بالترتیب 1686ء اور 1687ء میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا۔بجا طور پر دکن کی دونوں شیعہ ریاستوں کے خاتمے کا سہرا اورنگ زیب کے سر جاتا ہے،مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس نے اس کام کو انجام دے کر بہت بڑی بھول کی تھی کیوں کہ اگر وہ مراٹھوں کے خلاف ان دونوں ریاستوں کو تعاون دیتا اور پھر بعد کے ادوار میں ان سے نبرد آزما ہوتا تو اس میں مغل حکومت کو کم نقصان اٹھانا پڑتا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو ختم کرنے کے بعد اورنگ زیب نے مراٹھوں کی طاقت کو کچلنے کی کوشش کی۔شیواجی کا بیٹا سمبھاجی پکڑا گیا اور اسے مار دیا گیا۔اسی طرح سے اس کا پوتا شاہو بھی پکڑا گیا اور وہ 1707ء تک مغلوں کی قید میں رہا۔لیکن اس کے باوجود بھی مراٹھوں نے شیواجی کے دوسرے بیٹے راجہ رام اور اس کی بیوہ تارابائی کی سرکردگی میں مغلوں کے خلاف اپنی کوششیں جاری رکھیں۔1707ء میں جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا اس وقت تک مراٹھوں کی طاقت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی اضافہ ہوا تھا۔اورنگ زیب کی دکنی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے وی، اے، اسمتھ لکھتا ہے کہ ''دکن اورنگ زیب کی شہرت اور اس کے جسم دونوں کا مرقد بن گیا۔''

18.5.4 اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین

مغل سلطنت کے زوال کی ایک اور اہم وجہ اورنگ زیب کے جانشینوں کی نااہلی اور کمزوری ہے۔اگر وہ اہل، ہوشیار اور سمجھدار ہوتے تو وہ مغل حکومت کے زوال کو روک سکتے تھے۔افسوس کی بات یہ ہے کہ ان جانشینوں میں سے اکثر نااہل تھے، وہ صرف اپنی عیش پرستی اور ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مشغول رہے اور مغل سلطنت کی سیاست میں ابھرنے والی بیماری کے لیے کسی طرح کا کوئی علاج نہ کر سکے۔1707ء میں بہادر شاہ اول جب تخت شاہی پر متمکن ہوا تو اس وقت اس کی عمر 63 سال تھی۔اس کے پاس اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ حکومتی ذمے داریوں کو انجام دے سکے۔اسی طرح جہاں دار شاہ، فرخ سیر، محمد شاہ، احمد شاہ، اکبر شاہ دوم اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ بھی اچھے حکمراں ثابت نہیں ہو سکے۔ان میں سے زیادہ تر امراء اور وزراء کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی تھے۔

18.5.5 مغل حکمرانوں اور امراء کی بتدریج اخلاقی گراوٹ

مغل سلطنت کے زوال کی ایک اور وجہ مغل حکمرانوں کی اخلاقی گراوٹ بھی شمار کی جاتی ہے۔مؤرخین اور سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو کابل سے نکلنے کے بعد دہلی کے راستے میں پڑھنے والی تمام ندیوں اور رکاوٹوں کو پار کیا اور دہلی کے قریب

پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودی کو شکست دی۔ وہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے بہت مضبوط انسان تھا۔ وہ اپنے بغل میں ایک انسان کو دبا کر قلعے کی دیوار پر دوڑ سکتا تھا۔ ہمایوں کی قوت ارادی اتنی مضبوط تھی کہ سامنے پڑنے والی پریشانیوں اور مصیبتوں سے بے پروا ہو کر اس نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کو دوبارہ حاصل کر لی۔ اسی طرح کی مضبوط قوت ارادی اور جاں فشانی اکبر کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے کہ اپنی انھیں خوبیوں کے نتیجے میں اس نے نہ صرف پورے شمال ہندوستان بلکہ دکن کے بھی ایک حصے پر اپنی مضبوط حکومت قائم کی۔ گھوڑے کی کتنی بھی لمبی سواری اسے تھکا تی نہیں تھی۔ وہ میلوں پیدل چل سکتا تھا۔ مغل سلطنت میں اورنگ زیب کے عہد تک یہ تمام خوبیاں حکمرانوں کے اندر پائی جاتی تھیں، لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل حکمرانوں میں سہل پسندی اور بزدلی در آئی۔ ان کے حرم، غلاموں، باندیوں اور خداموں سے پُر رہنے لگے۔ وہ تقریباً مدہوشی میں چلے گئے اور ایک ایسے ملک میں جہاں کی اکثریت مغل حکومت سے نفرت کرنے لگی ہو بمشکل ہی حکمرانی کے قابل رہے۔ یہ بعد کے ادوار میں مغل حکمرانوں کی اخلاقی گراوٹ ہی کا نتیجہ تھا کہ انھیں لوگوں نے رنگیلا جیسے خطاب سے نوازا اور آج بھی تاریخ میں انھیں ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

حکمرانوں ہی کی طرح مغل امراء اور روساء کی اخلاقی گراوٹ اور نااہلی نے بھی مغل سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو وہ اخلاق و کردار کا اعلیٰ نمونہ پیش کر رہے تھے۔ لیکن دولت و ثروت کی افراط اور عیش و عشرت نے ان کے اندر اخلاقی برائیاں پیدا کیں۔ ان کے اندر تمام طرح کی اخلاقی و سماجی برائیاں پیدا ہونے لگیں، جس کے سبب اب وہ میدان جنگ میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ رہ سکے۔ ان برائیوں نے ان کے اندر کم ہمتی اور بزدلی کو بھی جنم دیا اور اب وہ مراٹھوں، راجپوتوں اور سکھوں کے مقابلے سے گھبرانے لگے۔ سر جادو ناتھ سرکار لکھتے ہیں کہ ایک یا دو پشتوں سے زیادہ کسی بھی مغل امیر خاندان کی اہمیت قائم نہ رہتی تھی۔ اگر کسی امیر کے کارنامے تین صفحات میں بیان کیے جائیں تو اس کے بیٹے کے کارناموں کے لیے صرف ایک صفحہ کافی ہوگا اور اس کے پوتے کے کارناموں کے لیے صرف ایک سطر جیسے کہ اس نے کوئی بھی ایسا قابل ذکر کام انجام نہیں دیا جس کو یہاں پر بیان کیا جا سکے۔''

18.5.6 جدید اسلحوں اور فوجیوں کی عدم فراہمی

مغل حکومت کے زوال کا ایک سبب مغل فوجوں میں کمی اور ان کی اخلاقی گراوٹ بھی شمار کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں دولت و ثروت کی افراط، آرام دہ زندگی اور شراب کے استعمال نے مغل فوج پر اپنے برے اثرات ڈالے اور ساتھ ہی فوجیوں کی کمی کی روک تھام کا کوئی مناسب بندوبست نہیں کیا گیا۔ فوجیوں نے میدان جنگ جیتنے کے بجائے ذاتی آرام و آسائش میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ دنیا کے سامنے مغل فوج کی اہمیت کا اندازہ اسی وقت ہو گیا تھا کہ جب مسلسل تین کوششوں کے باوجود بھی وہ قندھار کو دوبارہ فتح کرنے میں ناکام رہی۔ 1739ء میں نادرشاہ نے صرف پوری دہلی کو تباہ و برباد نہیں کیا بلکہ اس نے مکمل قتل عام کا حکم جاری کر دیا تھا۔ جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں اور ان کے روک تھام کے لیے حکمراں اور فوج کے اندر طاقت نہیں بچتی تو فوج اور عوام دونوں پست ہمتی اور بزدلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عوام کے دلوں سے اپنی حکومت اور فوج سے بھروسہ اٹھ جاتا ہے۔ سر او سلے ہیگ کے خیال میں ''مغل حکومت کے انتشار و افتراق کی ایک اہم وجہ مغل فوج کی اخلاقی پستی اور ان کی پست ہمتی بھی تھی۔''

مغل حکومت کی فوجی کمزوری کی سب سے اہم بنیاد اس کی تنظیم تھی جو بنیادی طور پر بڑے امراء اور جاگیرداروں کے ذریعہ تیار کیے گئے

دستوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ان امراء کو حکومت کی طرف سے یہ حکم ہوتا تھا کہ وہ بڑی جاگیروں اور منصبوں کے بدلے حکومت کو ضرورت پڑنے پر فوجی مہیا کریں۔اس طرح کی فوجی تنظیم میں ترتیب و تنظیم کی کمی پوری فوج کو ایک بھیڑ کی شکل دے دیتی تھی۔ان میں فوجی تربیت کی بھی کمی تھی، بمشکل ہی ایک فوجی اپنے ان ہتھیاروں سے مشق کرتا تھا، جن سے عام طور پر وہ لیس ہوتا تھا۔فوجی جرائم کے لیے کوئی مستقبل سزا بھی نہیں تھی۔

مغلوں کے طریقۂ جنگ اور ان کے اسلحوں کے بارے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ یہ جدید تقاضوں اور طریقوں سے ہم آہنگ نہیں تھے بلکہ قدیم ہو چکے تھے۔مغل فوج توپ خانوں (Artillery) اور گھڑ سوار تیر اندازوں (Cavalry) پر زیادہ منحصر تھے۔ جب کہ عملاً توپ خانے کی مار زیادہ دور تک نہیں تھی اور اسے حرکت دینے میں بھی زیادہ طاقت اور وقت برباد ہوتا تھا۔اس طرح کے طریقۂ جنگ کے لیے کیمپ کی شکل میں لازمی اشیاء اور معاونین کی ایک لمبی فہرست درکار ہوتی تھی، جو دیکھنے میں اپنی لوازمات کے ساتھ پورا ایک شہر معلوم پڑتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ، مرد و عورتیں، نوجوان و بوڑھے، فوجی و غیر فوجی، ہاتھی، گھوڑے اور بوجھ اٹھانے والے جانور، غرض مغل فوج کے ساتھ انسانوں، جانوروں اور اشیاء کا ایک بڑا کارواں ساتھ ہوتا تھا۔اس کے مقابلے میں دشمنوں کی فوج کم بوجھل اور سریع الحرکت ہوتی تھی، جو آندھی کی طرح مغل فوج پر حملہ آور ہوتے اور جب تک مغلوں کو سنبھلنے کا موقع ملتا دشمن اپنا کام پورا کر کے آگے بڑھ چکا ہوتا۔بارتھولڈ کا یہ خیال درست ہے کہ ''ہندوستان میں مغلوں کا عروج بارود کے استعمال کا نتیجہ تھا تو بجا طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آتشیں ہتھیاروں یعنی توپ اور بندوق کے استعمال کا بڑھنا اور گھڑ سواروں کی جنگی افادیت کم ہونے کے نتیجے میں مغل فوجوں کا دبدبہ کم ہو گیا تھا۔''

18.5.7 بحری فوج کی جانب سے عدم توجہی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مغلوں نے بحری فوج کی جانب کوئی توجہ نہیں دی، اس وجہ سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے خودکشی کو دعوت دی، مغل حکمرانوں خاص طور سے بعد کے دور کے حکمرانوں نے سمندری طاقت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور تمام ساحلی علاقوں کو غیر مسلح اور غیر محفوظ حالت میں چھوڑ دیا۔یوروپی قوموں نے اپنے نوآبادیاتی دور میں مغلوں کی اس کمزوری کا پورا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام میں اس بات کا بڑا اہم رول رہا ہے کہ مغلوں کے یہاں بحری فوج نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور انھوں نے اس کی طرف کبھی دھیان نہیں دیا تھا۔

18.5.8 معاشی بدحالی اور مغل خزانے کا دیوالیہ پن

عام طور پر مغل سلطنت کے زوال کی ابتدا اورنگ کی وفات سے متصور ہے، جب کہ اس کی علامتیں خاص طور پر زرعی بدعملی اور جاگیری نظام کی بڑھتی ہوئی دقتوں کی صورت میں بہت پہلے ظاہر ہونا شروع ہو چکی تھیں۔مغل سلطنت میں معاشی بدحالی کی اہم وجہ سیاسی اور سماجی اداروں میں گہرے تضادات کو شمار کیا جاسکتا ہے، جن کے زیر اثر جب ایک بار مغل سلطنت منتشر ہونا شروع ہو گئی تو پھر اس عمل کو روکنا مشکل ہو گیا۔مغل حکومت میں سب سے اہم سماجی تضاد مغل حکمراں طبقہ یعنی امراء اور زمین داروں کے درمیان تھا۔مغل امراء ایک طرف مطلق العنان حکومتی نظام کا حصہ تھے اور دوسری طرف اصل محصول کے بڑے حصے پر ان کا دعویٰ بھی تھا۔جب کہ زمین دار موروثی حقوق رکھنے والوں کا ایک ایسا گروہ تھا جن کو زرعی پیداوار کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ملتا تھا، اس کے علاوہ ان کو زرعی محصول ادا کرنے اور مدد کے عوض بھی ایک مخصوص ادائیگی کرنا پڑتی

تھی۔ جہاں ایک طرف مغل امراء کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی تو زیادہ تر زمین دار ہندو تھے۔ان دونوں طبقات کے پاس اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ہتھیار بند لوگوں کی فوج موجود رکھتی تھی۔ مغل حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ زمیندار طبقے کو اپنے چھوٹے حلیف کی طرح ساتھ رکھیں، کیوں کہ ان دونوں کا کسانوں کو دبائے رکھنے اور ان کے معاشی استحصال میں ہی فائدہ تھا۔ زمینداروں کو زرعی ٹیکس جمع کرنے کے ایک کارآمد آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ان کو رعایتیں بھی دی جاتی تھیں، لیکن کبھی کبھی ان کا تعاون حاصل کرنے کے لیے سختی بھی کی جاتی تھی۔ زمیندار جن کے پاس ہتھیار بند ہم راہیوں کی ایک بڑی تعداد مہیا تھی، اپنے ذرائع آمدنی میں اضافے کی غرض سے ہر موقع کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔

مغلوں کی طاقت میں کسی بھی قسم کی کمزوری کا ایک مظہر زمین داروں کی بدلتی ہوئی وفاداریوں کی صورت میں ہی سامنے آتا تھا۔ ساتھ ہی اگر کوئی زرعی بحران پیدا ہوتا اور اس کی وجہ سے تباہ حال کسانوں سے زرعی ٹیکس کی وصول یابی مشکل ہو جاتی تو ایسی حالت میں زمین داروں کا رویہ یہ ہوتا تھا کہ وہ حکومت کی طرف سے زرعی ٹیکس وصول کرنے کی غرض سے کارروائی کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتے تھے کیونکہ ان حالات میں زرعی ٹیکس کی وصول یابی کے نتیجے میں زرعی پیداوار پر ان کا اپنا حق تلف ہوسکتا تھا۔ ان حالات میں زمین داروں کی بغاوتیں زیادہ تواتر سے وقوع پذیر ہونے لگی تھیں۔

اس قسم کے زرعی بحران کے حالات اورنگ زیب کے عہد کے ابتدائی برسوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے۔ برنیر نے یہ نوٹ کیا ہے کہ اس زمانے میں کاشت کاروں پر مالی دباؤ تواتر سے بڑھتا جا رہا تھا۔اس کے خیال میں یہ صورت حال جاگیروں کے بدلنے کا براہِ راست نتیجہ تھی۔ یہ تشخیص صرف برنیر ہی کی نہیں تھی۔اورنگ زیب نے رسک داس کے نام 1666ء کے ایک فرمان میں زراعت کی ابتری اور ٹیکسوں کے ناقابلِ برداشت بوجھ کا ذکر کیا ہے، ان حالات میں کاشت کار اپنی زمین چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہوتے تھے۔اس آخری صورت حال کی طرف اورنگ زیب نے محمد ہاشم کے نام 69-1668ء کے اپنے ایک فرمان میں خاص طور پر اشارہ کیا ہے، معاشی بدحالی کے ایسے حالات میں مختلف علاقوں میں کسان بغاوتیں بھی وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔

شاہ جہاں کی تعمیراتی دلچسپی نے مغل خزانے پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ ساتھ ہی دکن میں اورنگ زیب کی جنگوں کی وجہ سے خزانے پر مزید بوجھ پڑا اور حالت یہاں تک پہنچی کہ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد مغل خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا۔ان دونوں بنیادی وجوہات کے علاوہ مغل خزانہ خالی ہونے کے اور بھی بہت سارے اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ان میں سے ایک اہم وجہ سرکاری عمال کا بے ایمان اور رشوت خور ہونا بھی شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے سرکاری آمدنی میں کمی واقع ہوئی۔ ولیم نورس کے مطابق "اورنگ زیب کی حکومت کے آخری سالوں میں سرکاری خزانہ خالی ہو چکا تھا، لڑائیاں مسلسل جاری تھیں، فوج غیر منظم ہو چکی تھی اور حکام ناخوش و غیر بھروسے مند ہو چکے تھے۔" اسی طرح سے سرکاری خزانہ خالی ہونے اور مغل حکومت میں کمی واقع ہونے کی ایک دوسری وجہ علاقائی ریاستوں کا قیام بھی شمار کیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے حکومتی آمدنی میں بڑے پیمانے پر کمی واقع ہوئی اور اخراجات میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ مستقل جنگوں نے ملکی معیشت پر بھی برے اثرات ڈالے، زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت سبھی میں کمی واقع ہوتی گئی۔ نتیجتاً ایک وقت ایسا آیا کہ پوری ملکی معیشت کا ڈھانچہ چرمرا گیا، جو مغلیہ سلطنت کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔ برنیر کے بقول "مغل حکومت میں بڑے بڑے وزراء اور سپہ سالار موجود تھے، لیکن عوام الناس کی اکثریت انسانی بھیڑوں

کے مترادف ہوچکی تھی ۔"

18.5.9 بیرونی حملے

نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے مغلیہ سلطنت کی بچی کھچی طاقت اور وقعت کو بھی ختم کر دیا، ساتھ ہی رو بہ زوال مغل سلطنت کی ابتری میں مزید اضافہ کر دیا۔ دہلی پر نادرشاہ کی بآسانی فتح اور احمد شاہ ابدالی کے مکرر حملوں نے دنیا کے سامنے مغل سلطنت کی فوجی کمزوریوں کو واضح کر دیا۔ بیرونی حملہ آوروں نے نہ صرف ملک میں لوٹ مار اور قتل و غارت گری مچائی بلکہ وہ بہت سارا قیمتی مال غنیمت بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ ساتھ ہی بیرونی حملوں کا ایک منفی اثر عوام الناس پر یہ پڑا کہ ان کے دلوں سے مغل حکومت کا رعب و دبدبہ اور بھروسہ جاتا رہا۔ اب وہ اس مغل سلطنت کو بچانے کے بجائے اس کے خاتمے اور زوال کی کوششوں میں حصہ لینے لگے۔

18.5.10 مغل حکومت کی بے جا وسعت

اورنگ زیب کے عہد میں مغل حکومت بہت زیادہ وسیع ہو چکی تھی۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ذرائع ابلاغ اور نقل و حمل کے ذرائع محدود تھے، کسی بھی حکمراں کے لیے ایک جگہ سے اتنی بڑی حکومت کو سنبھالنا مشکل تھا۔ ابتدائی عہد کے مغل حکمرانوں کا اپنے وزراء، امراء اور فوج پر مکمل اختیار اور کنٹرول حاصل تھا، جب کہ اس کے مقابلے میں بعد کے ادوار کے حکمراں کمزور منتظم ثابت ہوئے، جو اپنے وزراء کے ساتھ ساتھ اپنی فوج پر مکمل اختیار قائم نہ رکھ سکے۔ نتیجتاً دور دراز کے صوبے خود مختار ہونے لگے اور اس طرح آزاد و خود مختار ریاستوں کے ظہور نے مغل سلطنت کے زوال میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر ستیش چندرا کا خیال ہے کہ "اگر اورنگ زیب اپنے بڑے بیٹے شاہ عالم کا مشورہ قبول کر لیتا اور بیجاپور و گولکنڈہ کی ریاستوں کو پوری طرح سے ختم کرنے کے بجائے انھیں صرف کچھ علاقوں سے بے دخل کرتا اور کرناٹک کے علاقے پر ان کی حکمرانی تسلیم کر لیتا، جو مرکز سے نہ صرف بہت زیادہ دوری پر واقع تھا بلکہ اس کا انتظام و انصرام بھی مشکل تھا تو شاید مغل حکومت کے لیے بہتر ہوتا۔"

18.5.11 اندرونی بغاوتیں

مغل حکومت کے زوال کا ایک اور اہم سبب ملک کے مختلف صوبوں میں ابھرنے والی بغاوتیں ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد تک کسی بھی صوبائی امیر یا گورنر میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ مرکزی حکومت کو چیلنج دے سکے یا مرکزی حکومت سے بغاوت کی سوچ سکے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ امراء یا صوبے دار اندرونی طور پر حکمرانوں سے دشمنی یا عناد رکھتے ہوں، لیکن اورنگ زیب کے عہد میں بھی کسی نے کھلے عام اس کی طاقت کو للکارا نے کی ہمت نہیں کی۔ مزید برآں اس عہد میں بہت سے ایسے صوبے دار تھے جو اس سے اندرونی طور پر دشمنی رکھتے تھے، وہ تمام اپنی طاقتوں کو یکجا کرنے، حلیفوں کی تلاش اور اپنے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس بات کے منتظر تھے کہ کب بوڑھا بادشاہ اس دنیا کو خیر آباد کہے۔

اورنگ زیب کے تمام بیٹے اس گروہ میں شامل تھے اور حکام میں سے بہادر خاں، دلیر خاں اور ذوالفقار خاں بھی اس طرح کے مشتبہ خیالات اپنے دلوں میں رکھے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کی وفات کے ساتھ ہی مغل حکومت بکھرنے لگی اور بعد کے ادوار میں اس بکھراؤ اور زوال میں مزید اضافہ ہوا۔ پورے ملک میں بغاوتوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، کہیں جاٹوں کی بغاوت تو کہیں راجپوتوں کی، کہیں افغانوں کی بغاوت تو کہیں سکھوں کی، کہیں روہیلوں کی بغاوت تو کہیں مراٹھوں کی۔

موجودہ تاریخی ماخذ اور شواہد کا باریکی سے جائزہ لینے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ بغاوتیں، جنھوں نے مغل سلطنت کی بنیادوں کو ہلا دیا مختلف وجوہات کا نتیجہ تھیں۔ ان میں سے سب سے اہم ملک کی زرعی اور معاشی بدحالی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ مراٹھا بغاوت نے بڑی حد تک ایک زمین دار بغاوت کا رنگ اختیار کرلیا تھا۔ اس بغاوت کی رہنمائی زیادہ تر مقامی سرداروں اور موروثی حکمرانوں یعنی دیسائیوں اور دیش مکھوں کے ہاتھ میں تھی۔ مراٹھوں کے مرکزی اقتدار کا حامل کوئی ادارہ قائم نہ کرسکنے کی شاید وجہ بھی یہی تھی، لیکن جس طرح وہ 'بارگی' سپاہیوں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرنے میں کامیاب رہے تھے یہ ظاہر کرتا ہے کہ عام زرعی تنگ دستی نے ان کا کام آسان کردیا تھا۔ اسی عہد کے مصنف بھیم سین کے مطابق ''کسان ہتھیار اور گھوڑے حاصل کرکے مراٹھا باغیوں میں مل جاتے تھے۔'' مغل جاگیرداروں اور مراٹھا سرداروں کے حریفانہ مالی مطالبوں کے سبب زرعی تنگ دستی اور پریشانی اور بھی گہری ہوتی جارہی تھی۔

اسی طرح شمالی ہندوستان میں بندیلہ بغاوت کو بھی زمین داروں کی بغاوت قرار دیا جاسکتا ہے، جہاں تک جاٹوں کی اس بغاوت کا تعلق ہے، جو آگرہ کے آس پاس بھڑک اٹھی تھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے کسانوں کے ایک مخصوص گروہ کی ایسی بغاوت کی شکل اختیار کرلی تھی، جس کی رہنمائی زمینداروں کے ہاتھ میں تھی۔ اس بغاوت کے سب سے اہم رہ نما سورج مل کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زمینداروں کا لباس پہنا کرتے تھے۔

بعض دوسری بغاوتوں میں ذات پات یا زمیندارانہ اثرات کے بجائے مذہب نے لوگوں میں اسی طرح کا اتحاد پیدا کرنے میں مدد دی، جس کے بغیر کسی معمولی سی کامیابی کی امید بھی نہیں کی جاسکتی۔ 1672ء میں ہریانہ کے علاقے میں کاشت کاروں اور چھوٹے کاروباریوں پر مشتمل جن ست نامیوں نے ایک خاصی بڑی بغاوت شروع کی تھی، وہ وحدانیت پر یقین رکھنے والوں کا ایک گروہ تھا، جو کبیر داس کو اپنا مرشد مانتے تھے۔ اسی طرح جن سکھوں نے پنجاب میں گرو گوبند سنگھ کی سرکردگی میں ایک بڑی بغاوت شروع کی، وہ جاٹ کسانوں کے وسیع تر حلقے کا ایک جزء تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ 1709ء میں ان باغیوں کے رہ نما بندہ بہادر نے اپنی کمان میں عام آدمیوں کی ایک بہت بڑی فوج جمع کرلی تھی، یہ لوگ ہندو سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر چلتے۔ یہاں بھی وحدانیت میں یقین رکھنے والے ایسے مذہب کا اثر کارفرما تھا، جس نے گرو کی اطاعت کے گہرے جذبے کی بنیاد پر دبے کچلے باغیوں کو یکجا کرلیا تھا۔ ست نامیوں کو دبا دیا گیا تھا اور بعد میں تاریخ انھیں بھول سی گئی، سکھ فتح یاب ہوئے لیکن ان کی اس جیت نے ہی کسی معنی میں ان کے کسان ماضی کی نفی کردی۔ ان کے رہ نما جو خود نچلے طبقوں سے ابھرے تھے، اپنے آپ کو زمین دارانہ درجہ دینے کے لیے کوشاں تھے۔ یہاں تک بالآخر پنجاب کے عظیم رہ نما رنجیت سنگھ نے مہاراجہ کا لقب اختیار کرلیا، جو بہت سے راج پوت سرداروں کی تمناؤں کا مرکز تھا۔

18.5.12 اٹھارہویں صدی میں خودمختار ریاستوں کا ظہور

مغل حکومت کے عہد زوال میں مختلف صوبوں نے اپنے آپ کو مغل سلطنت سے الگ کرلیا اور بہت سی خودمختار ریاستیں ظہور پذیر ہوگئیں۔ ان آزاد اور خودمختار ریاستوں نے نہ صرف مغل حکومت کے لیے پریشانیاں کھڑی کیں بلکہ اس کے زوال کو مزید تیز کردیا اور مغل حکومت سمٹتے سمٹتے دہلی تک محدود ہوگئی۔ ذیل میں ان آزاد ریاستوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے جو مغل حکومت کے عہد زوال میں ظہور میں آئیں۔

18.5.12.1 حیدرآباد کی ریاست

حیدرآباد ریاست کا قیام قمرالدین صدیقی کے ذریعہ عمل میں آیا جنھیں 1712 میں فرخ سیر کے ذریعہ 'نظام الملک' کے خطاب کے ساتھ دکن کا وائس رائے متعین کیا گیا تھا۔ اس نے تقریباً ایک خودمختار ریاست قائم کی لیکن محمد شاہ کے عہد حکومت میں دہلی واپس آیا۔ 1724ء میں 'آصف جاہ' کے خطاب کے ساتھ دوبارہ دکن کا وائس رائے متعین کیا گیا۔ اس نے آصف جاہی حکمراں خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس کے جانشینوں کو حیدرآباد کے نظام کے طور پر جانا جاتا ہے۔ مغل سلطنت کے عہد زوال میں ہندوستان میں جو خودمختار ریاستیں وجود میں آئیں، ان میں سب سے بڑی اور پائیدار ریاست حیدرآباد ہی کی تھی، آصف جاہ نے دکن میں مکمل آزادی اور خودمختاری کے ساتھ حکومت کی، بغاوتوں اور طاقت ور زمین داروں کا خاتمہ کیا اور اپنی حکومت میں ایک مضبوط نظام قائم کیا۔ حیدرآباد کی اس آزاد ریاست کے حکمراں مغل بادشاہ کی بالادستی تسلیم کرتے رہے، انھیں کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری رکھا اور تخت نشینی کے وقت ان سے فرمان حاصل کرتے تھے۔

1748ء میں نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں کی آپسی لڑائی سے حیدرآباد کی اس ریاست کو بڑا نقصان پہنچا۔ آصف جاہ کے انتقال کے بعد پندرہ سال کے اندر ہی حیدرآباد ریاست کی حدود آدھی رہ گئیں۔ 1798ء میں حیدرآباد کے نظام نے انگریزوں کے فوجی امداد کے نظام یعنی Subsidiary System کو قبول کر کے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ اس طرح حیدرآباد کی آصف جاہی حکومت اپنے قیام کے 74 سال بعد انگریزوں کے ماتحت ریاست بن گئی۔ 1800ء میں انگریزوں نے حیدرآباد کی تمام آزادی سلب کر لی اور اب حیدرآباد برطانوی ہندوستان کی ایک محکوم ریاست بن گئی۔

18.5.12.2 بنگال کی ریاست

اٹھارہویں صدی کا بنگال بہت بڑے علاقے پر مشتمل تھا، اس میں بنگال کے ساتھ ساتھ بہار اور اڑیسہ کے علاقے بھی شامل تھے۔ مرشد قلی خاں اورنگ زیب کے عہد میں بنگال کے دیوان تھے، جب کہ فرخ سیر نے 1717ء میں انھیں بنگال کا صوبے دار مقرر کیا۔ انھوں نے مرشدآباد کا شہر آباد کر کے بنگال کا دارالسلطنت ڈھاکہ سے مرشدآباد منتقل کر دیا۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مرشد قلی خاں عملی طور پر خودمختار ہو گیا۔ مرشد قلی خاں (1717ء-1727ء) اور اس کے جانشینوں شجاع الدین خاں (1727ء-1739ء) اور علی وردی خاں (1739ء-1756ء) نے ایک لمبی مدت تک بنگال کی ریاست کو ایک مضبوط، مستحکم اور پرسکون نظم و انصرام فراہم کیا۔ ان تینوں حکمرانوں نے ریاست میں نظم وضبط اور تجارت کو فروغ دیا لیکن باہری تجارتی کمپنیوں پر کڑی نگاہ رکھی۔ علی وردی خاں نے انگریزی اور فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کو بنگال میں اپنے علاقوں کو قلعہ بند کرنے کی اجازت نہیں دی، مگر بعد کے حکمراں ریاست کی اس مضبوطی کو قائم نہ رکھ سکے۔ انھوں نے ریاست کی بری اور بحری فوجوں پر کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نتیجتاً علی وردی خاں کے جانشین سراج الدولہ کے عہد میں انگریزوں نے صرف تین ہزار فوج کی مدد سے 1757ء میں مرشدآباد کے قریب پلاسی کے میدان میں بنگال کی فوج کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح بنگال ہندوستان او رمغلیہ سلطنت کا پہلا صوبہ تھا جو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں گیا۔

18.5.12.3 اودھ کی ریاست

مغل حکومت کے دورِ زوال میں جو آزاد ریاستیں قائم ہوئیں ان میں ایک اہم ریاست اودھ کی تھی۔ اس وقت اودھ کا صوبہ بنارس کے ساتھ ساتھ الہ آباد کے نزدیک چند ضلعوں کو بھی اپنے اندر شامل کیے ہوئے تھا۔ مغل حکمرانوں کے ذریعہ ایک ایرانی امیر سعادت خاں برہان الملک 1739ء-1722ء کو اودھ کا صوبے دار مقرر کیا گیا تھا، لیکن جلد ہی وہ خود مختار ہو گئے۔ سعادت خاں نے ایک مضبوط اور مستحکم ریاست کی بنیاد ڈالی، علاقائی زمین داروں کی طاقت ختم کر کے ریاست میں نظم وضبط اور امن وسکون قائم کیا۔ سعادت خاں کے جانشینوں صفدر جنگ (1754ء-1739ء) اور شجاع الدولہ (1775ء-1754ء) کے زمانے میں اودھ کی ریاست کو مزید عروج واستحکام حاصل ہوا۔

1764ء میں بکسر کی جنگ میں انگریزوں سے شجاع الدولہ کی شکست کے بعد اودھ کی ریاست انگریزوں کے زیر اثر آ گئی، لیکن انگریزوں نے اودھ ریاست کے وجود کو ختم نہیں کیا بلکہ اسے برقرار رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد یعنی 1774ء میں انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ کے حکمراں رحمت خاں کو شکست دے کر اس علاقے کو بھی ریاست اودھ میں شامل کر لیا گیا۔

شجاع الدولہ کے بعد اودھ ریاست پر انگریزی دباؤ بڑھنے لگا اور اودھ کے نواب انگریزوں کے آگے بے بس ہو گئے۔ دھیرے دھیرے اودھ ریاست کا دائرہ سمٹنے لگا، یہاں تک کہ 1856ء میں اودھ کی ریاست کو ختم کر کے برطانوی ہندوستان میں ضم کر دیا گیا۔

18.5.12.4 میسور کی ریاست

اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں میسور پر ایک ہندو راجہ کی حکمرانی تھی۔ اس ہندو راجہ کی فوج میں حیدر علی نام کا ایک سپاہی تھا، وہ اپنی بہادری اور قابلیت کی بنیاد پر جلد ہی راجہ کی فوج کا سپہ سالار بن گیا۔ حیدر علی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے راجہ اور اس کے وزراء نے اس کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اس کے بعد حیدر علی نے میسور کے تخت پر قبضہ کر لیا میسور کی ریاست پر حیدر علی کی حکمرانی کا آغاز 1761ء میں ہوا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بھی حیدر علی ایک زبردست اور کامیاب منتظم اور حکمراں ثابت ہوا۔

حیدر علی جس وقت ریاست کا حکمراں ہوا اس وقت تک میسور کی ریاست کمزور اور منقسم تھی۔ لیکن جلد ہی حیدر علی نے میسور کو ہندوستان کی بڑی طاقتوں میں شامل کر دیا۔ اس نے اپنی فوج کو جدید اسلحوں سے آراستہ کیا اور جدید تقاضوں کے مطابق ان کی تنظیم نو کی۔ اس نے اپنی ریاست کو نہ صرف بڑے پیمانے پر وسعت دی بلکہ انگریزوں کے ایک بڑے حریف کے طور پر ابھرا۔ 1782ء میں حیدر علی کی وفات کے بعد اس کے جانشین فتح علی ٹیپو سلطان انگریزوں سے مستقبل نبرد آزما رہا۔ بالآخر 1799ء میں سرنگاپٹنم میں انگریزوں سے لڑتا ہوا مارا گیا اور اس کے بعد میسور کی ریاست پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

18.5.12.5 راج پوت حکومتیں

مغل حکومت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راج پوت علاقے عملی طور پر آزاد ہو گئے، لیکن راج پوت حکمراں اپنی پرانی روش کی طرح اب بھی منقسم ہی تھے۔ بہت سی راج پوت ریاستیں آپسی خانہ جنگیوں میں مشغول تھیں۔ لیکن ان تمام کے باوجود بھی انھوں نے مغل حکومت کو کمزور کرنے اور ان کے زوال میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آمیر کے راجہ سوائی جے سنگھ (1743-1681ء) ایک مشہور اور نامور راج پوت راجہ

رہے ہیں۔انھوں نے جے پور شہر بسایا۔اس کے علاوہ انھوں نے اچھے اور جدید آلہ جات کے ساتھ دہلی، جے پور، اجین، بنارس اور متھرا میں رصد گاہیں قائم کیں۔مراٹھوں کے ظہور اور عروج کے ساتھ ہی راج پوت ریاستیں دھیرے دھیرے ختم ہونے لگیں۔

18.5.12.6 پنجاب کی حکومت

سکھ مذہب کے دسویں اور آخری گرو، گرو گوبند سنگھ کی قیادت میں سکھ قوم ایک سیاسی اور فوجی طاقت بن چکی تھی۔ساتھ ہی نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں اور مغل حکومت کی مستقل کمزور پڑتی طاقت نے سکھوں کو ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔1765ء سے 1800ء کے درمیان انھوں نے پنجاب اور جموں کے علاقوں پر اپنا قبضہ جمالیا۔اٹھارہویں صدی کے آخر میں سکھ قوم کے ایک مشہور سردار راجہ رنجیت سنگھ نے تمام سکھ سرداروں کو اپنے ماتحت کرلیا اور پنجاب میں ایک مضبوط و مستحکم سکھ حکومت قائم کی۔

رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھ ریاست اندرونی انتشار کا شکار ہوگئی۔ہندوستان کی انگریزی حکومت جو اس گھات میں لگی ہوئی تھی کہ کس طرح اپنی سرحدوں کو وسیع کیا جائے؟اس نے سکھ ریاست کے انتشار کا فائدہ اٹھایا اور 40-1839ء میں پنجاب کی سکھ حکومت کو شکست دے کر اس کا خاتمہ کردیا۔

18.5.12.7 مراٹھوں کی حکومت

شیواجی کے بڑے بیٹے ساہوجی جنھیں اورنگ زیب نے قید کر کے جیل میں ڈال دیا تھا، 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد بہادر شاہ اول نے انھیں آزاد کردیا۔اس عہد میں مراٹھا ریاست کی حکمرانی تارابائی کے ذریعہ انجام دی جارہی تھی۔مغل قید سے رہائی کے بعد ساہوجی نے 1713ء میں بالاجی وشوناتھ کو اپنا پیشوا یعنی وزیر اعظم نامزد کیا۔بالاجی وشوناتھ نے اپنے عہدے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوری طاقت اپنے گرد جمع کرلی اور مراٹھوں کا حقیقی حکمراں بن گیا۔اصل حکمراں کو پس پشت ڈال دیا گیا۔بالاجی وشوناتھ نے نہ صرف اپنی ریاست کو وسیع کیا بلکہ مراٹھا سرداروں کو چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کے لیے نئے اور علیحدہ علاقے فراہم کیے۔

بالاجی باجی راؤ (1740ء-1761ء) نے مراٹھوں کی ریاست کو مزید وسعت و استحکام بخشا۔اس عہد میں مراٹھا حکومت اپنے عروج کو پہنچ گئی اور انھوں نے دہلی تک کا علاقہ فتح کرلیا اور مغلوں کو اپنی مدد کی پیش کش کی۔مراٹھوں کے ذریعے پنجاب کے علاقے سے احمد شاہ ابدالی کے حاکموں کے نکالے جانے کے بعد مراٹھوں اور احمد شاہ ابدالی کا سیدھا ٹکراؤ ہوا۔جنوری 1761ء میں پانی پت کے میدان میں دونوں فوجوں کے بیچ فیصلہ کن جنگ ہوئی، جس میں مراٹھوں کو بری طرح شکست ہوئی، تقریباً 28,000 مراٹھا فوجی مارے گئے، جون 1761ء میں بالاجی راؤ پیشوا کا بھی انتقال ہوگیا۔اس طرح پانی پت کی تیسری جنگ میں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں مراٹھوں کی شکست سے ان تمام قیاس آرائیوں کا خاتمہ ہوگیا کہ ہندوستان میں مراٹھا قوم ایک بڑی اور مضبوط طاقت بن کر ابھرنے والی ہے۔یہ جنگ انگریزوں کے لیے بھی بڑی مفید ثابت ہوئی اور مراٹھوں کی شکست نے ہندوستان میں برطانوی طاقت کے بڑھنے اور ان کی حکومت کے لیے راستہ صاف کردیا۔

18.5.13 برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا عروج

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا قیام 31 دسمبر 1600ء کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ عمل میں آیا، جس کا مقصد جنوب مشرقی ایشیا میں

برطانوی تجارت کوفروغ دینا تھا۔شروع میں اس کمپنی نے ایک اجارہ دارانہ تجارتی کمپنی کی حیثیت سے کام کیا،لیکن اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں اس کمپنی نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور ہندوستان میں برطانوی سامراج کے ایک کارندے کے طور پر کام کرنا شروع کردیا۔ یہ کمپنی ہندوستان میں تجارت کی غرض سے داخل ہوئی تھی اور انھوں نے مغل بادشاہوں سے برصغیر میں تجارت کی اجازت لے رکھی تھی۔اس مقصد کے لیے انھوں نے ہندوستان میں مختلف مقامات پر زمینیں لے کر تجارتی کوٹھیاں بنائی تھیں۔برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس قسم کی کوٹھیاں ممبئی، چنئی اور کولکاتہ میں بنا رکھی تھیں۔بعد کے ادوار میں انھوں نے حفاظت کے بہانے ان کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کرلیا۔جب مغل حکومت زوال پذیر ہوئی تو برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان قلعوں اور بستیوں سے، جو فوجی چھاونیوں کی شکل اختیار کرچکی تھیں، ملک کے سیاسی معاملات میں مداخلت شروع کردی۔کمپنی نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستانی سیاسی حالات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے مغل حکومت کی نشاۃ ثانیہ کے تمام راستے مسدود کردیے۔انھوں نے 1757ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کوشکست دے کر بنگال کو برطانوی نوآبادی کا حصہ بنادیا۔اس کے بعد انھوں نے اپنی اس ریاست کو مزید وسعت دی، 1764ء میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ کوشکست دے دی۔1798ء میں حیدرآباد نے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی بالادستی قبول کرلی اور 1799ء میں انھوں نے میسور کی ریاست کا خاتمہ کرکے اسے اپنی حکومت میں ضم کردیا۔اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے پورے ہندوستان پر اپنا سکہ جمالیا اور اس طرح انھوں نے مغل حکومت کے دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے کی کوئی بھی گنجائش نہ چھوڑی۔

18.6 خلاصہ

ہندوستان میں مغل حکومت کی حکمرانی کا دور تقریباً تین صدیوں سے کچھ زیادہ عرصے 1526ء سے 1540ء اور 1555ء سے 1857ء پر محیط ہے اور اس میں ڈیڑھ سو سال 1707ء سے 1857ء عہد زوال کے شمار کیے جاتے ہیں۔ اس دور زوال کی ابتدا 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات سے ہوتی ہے۔اورنگ زیب کی وفات کو جہاں ایک طرف مغل سلطنت کے عہد زرّیں کا خاتمہ شمار کیا جاتا ہے، وہیں دوسری طرف اسے دور زوال کی ابتدا بھی مانا جاتا ہے اور اسی وجہ سے مؤرخین اورنگ زیب کی وفات کو نہ صرف مغل تاریخ بلکہ ہندوستانی تاریخ کی بھی ایک حد فاصل شمار کرتے ہیں۔یہیں سے ہندوستانی تاریخ میں عہد جدید کا آغاز بھی تصور کیا جاتا ہے۔

اس اکائی کے خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ مغل سلطنت اپنی وسعت و جسامت کے بوجھ تلے دب گئی۔مغل حکومت کے زوال میں بہت سے اسباب وعوامل نے اپنے کردار ادا کیے، جن میں مغل حکمرانوں کے یہاں جانشینی کے قانون کی عدم موجودگی، اورنگ زیب کی مذہبی ودکنی پالیسی، مرکز سے اس کا بہت دنوں تک دور رہنا، اورنگ زیب کے نااہل اور کمزور جانشین، مغل حکمرانوں اور امراء کی اخلاقی پستی، مغل فوجیوں میں کمی اور ان کی اخلاقی پستی، مغل سلطنت کی معاشی بدحالی، بیرونی حملے، اندرونی بغاوتیں اور خودمختار ریاستوں کا ظہور کافی اہم شمار کی جاتی ہیں۔اس کے ساتھ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع نے تابوت میں آخری میخ کا کام کیا، جس کے بعد مغل سلطنت کا پورے طور سے خاتمہ ہوگیا۔

18.7 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1. مغل دور کے اسباب زوال میں سے تین اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔
2. مغل حکومت کے زوال میں اورنگ زیب کی پالیسیاں کس حد تک ذمے دار ہیں؟ وضاحت کیجیے۔
3. مغل حکومت کے عہد زوال کا جائزہ لیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4. مغل حکومت کے زوال میں اندرونی بغاوتوں اور علاقائی حکومتوں کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
5. مغل حکومت کے زوال میں بیرونی حملوں کو کہاں تک ذمے دار قرار دیا جاسکتا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

18.8 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست، ڈاکٹر ستیش چندرا، اردو ترجمہ: محمد قاسم صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، طبع دوم، 2001ء

2۔ آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان، ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، 1994ء

3۔ رود کوثر، شیخ محمد اکرام، ادبی دنیا، مٹیا محل، دہلی

4۔ ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، جلد دوم، ثروت صولت، مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی

بلاک: 5 جدید ہندوستان

فہرست

اکائی 19 : برطانوی دور

اکائی کے اجزاء

19.1 مقصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ کو یہ معلوم ہو سکے گا کہ ہندوستان کے لئے مغربی اقوام نے بحری راستہ تلاش کرنے کے بعد اس ملک سے براہ راست تجارت کا آغاز کیا اور اس تجارت میں ان کے سامراجی عزائم پوشیدہ تھے جو بہت جلد سامنے آگئے اور انہوں نے جنوبی ہند میں اپنی قوت کا اظہار شروع کیا۔ رفتہ رفتہ برطانوی قوتیں سب پر غالب آگئیں اور انہوں نے ملک پر قبضہ کرلیا۔ اس قبضہ کے خلاف آزادی کی جدو جہد ہوئی اور ایک طویل اور صبر آزما جدو جہد کے بعد آخر ملک انگریزوں کے اقتدار سے آزاد ہو گیا۔

19.2 تمہید

اس اکائی میں ہندوستان کے اندر مغربی اقوام کی آمد ان کی باہمی رقابت اور انگریزوں کے اثر ونفوذ کا بیان ہوگا۔ اس کے بعد مغل سلطنت کے خاتمہ، پہلی جنگ آزادی اس کے اسباب اور ناکامی کی وجوہات کا بیان ہوگا، پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندستان میں بے شمار تحریکات اٹھیں اور متعدد بڑے لیڈر ملک کے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، اس اکائی میں ان میں سے کچھ کا تعارف کرایا جائے گا۔

19.3 ہندوستان میں یورپی اقوام

ہندوستان یوروپی ممالک کے لئے اجنبی تو کبھی نہیں تھا۔ اہل یوروپ ہندستان سے واقف تھے اور ہندوستان سے ان کی تجارت بھی تھی، لیکن یہ تجارت عرب ممالک خاص طور پر مصر کے واسطے سے تھی۔ بعض یوروپی سیاح بھی اس میں ہندستان آئے تھے۔ ہندستان کے ساتھ براہ راست تجارت کے لئے یوروپ کے لوگ مسلسل اس تلاش میں تھے کہ ہندستان کے لئے کوئی ایسا راستہ تلاش کریں جو عرب ممالک کے ذریعے نہ ہو۔ اس کے لئے مسلسل کوششیں ہو رہی تھیں۔ انہی کوششوں میں نئی دنیا یعنی امریکہ کی تلاش ہوئی اور یوروپی اقوام نے امریکہ میں بود و باش اختیار کرنی شروع کی، وہاں کے قدرتی وسائل سے استفادہ میں بڑی تعداد میں یوروپ کے مختلف ممالک کے لوگ وہاں گئے اور بہتر ہتھیاروں اور جنگی مہارت کی بنا پر وہاں کے مقامی باشندوں کو جلد ہی فتح کرلیا۔

1498 میں ایک پرتگالی جہاز راں واسکوڈی گاما نے افریقہ کا چکر لگا کر ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کرلیا۔ ایک عرب جغرافیہ داں ابن ماجد نے اس سلسلے میں اس کی بڑی مدد کی تھی۔ واسکوڈی گاما کالی کٹ آیا، شروع سے ہی ان کے عزائم سامراجی تھے۔ اس لئے دس سال کے قلیل عرصہ میں پرتگالیوں، مصریوں اور ہندستان کے مقامی تاجروں میں تجارت کے مفادات کو لے کر جنگ چھڑ گئی اور 1509 میں پرتگالیوں

نے دیو پر اور 1510 میں گوا پر قبضہ کرلیا۔

سولہویں صدی کے نصف آخر تک تین مزید طاقتیں ہندوستان کے ساتھ تجارت میں شامل ہوگئیں یعنی انگلینڈ، ہالینڈ اور فرانس، ان تینوں طاقتوں کے درمیان اپنی اپنی تجارت کو ترقی دینے کے لئے باہم شدید مقابلہ ہوا۔جنگیں ہوئیں اور آخر پرتگالیوں کوشکست ہوئی۔انگلینڈ اور ڈچ لوگ کامیاب رہے اور ہندوستان سمیت تمام مشرقی ممالک کی تجارت پر انہی کا قبضہ ہوگیا، بعد میں ان دونوں طاقتوں نے اپنے علاقے بانٹ لئے۔انگلینڈ اور فرانس نے ہندوستان سے اپنی تجارت جاری رکھی اور ڈچ قوم نے ہندستان سے مزید مشرق میں جا کر ملیشیا اور انڈونیشیا میں اپنی کالونیاں قائم کیں۔

31 دسمبر 1600 میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم ہوئی اور برطانوی حکومت کی طرف سے اس کو تجارت کا پروانہ مل گیا۔1608 میں انگلستان کے بادشاہ جیمس اول نے مغل حکمران جہانگیر کے دربار میں کپتان ولیم ہاکنس کو بھیج کر تجارتی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی جو ایک سال کی جدوجہد کے بعد منظور ہوگئی اور انگریزوں کو سورت میں فیکٹری قائم کرنے کی اجازت مل گئی،اس کے بعد وہ مزید مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کو جنوبی ہند کے متعدد شہروں میں اپنی فیکٹریاں لگانے کی اجازت مل گئی۔

فرانسیسی کمپنی بھی تجارتی مراعات حاصل کرنے کی کوشش کررہی تھی جو اس کو مل گئیں،اس طرح فرانسیسی اور انگریز دونوں کو تجارتی مراعات مل گئیں تھیں۔ہندوستان کے اپنے تجارتی مفاد کو لے کر دونوں ممالک کے لوگ باہم برسرپیکار بھی رہے بلکہ شروع میں فرانسیسیوں کا پلہ بھاری تھا۔خاص طور پر ڈپلے نے فرانسیسی طاقت کو مضبوط کیا تھا۔اس دوران دونوں قوتیں ہندوستان کی مقامی سیاست پر بھی اثر انداز ہونے کے لئے راہیں ڈھونڈ رہی تھیں، 1748 میں دونوں طاقتوں کو اس کا موقعہ مل گیا۔نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور پوتے مظفر جنگ میں اقتدار کی جنگ ہوئی انگریزوں نے ناصر جنگ کا ساتھ دیا۔فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کا اور مظفر جنگ کامیاب رہا۔اس طرح کرناٹک میں چندا صاحب نے اپنے باپ نواب انوارالدین کے خلاف بغاوت کی اس میں بھی فرانسیسیوں نے چندا صاحب کا ساتھ دیا اور انگریزوں نے نواب محمد علی کا۔اتفاق ایسا ہوا کہ انگریزوں نے جن کی مدد کی تھی وہ دونوں ہار گئے۔لیکن کچھ عرصہ بعد پانسہ پلٹ گیا اور انگریزوں کے حامی جیت گئے۔اس کے بعد فرانسیسیوں کو لگاتار شکست ہوتی رہی۔چند سال کے عرصہ میں انگریزوں نے ہندوستان سے فرانسیسی قوت کا خاتمہ کردیا اور اس طرح وہ بلاشرکت کسی یورپین طاقت کے ہندوستان کے ساتھ تجارت کے میدان میں تنہا رہ گئے۔

19.4 ہندستان میں برطانوی قوت کا آغاز

انگریز چونکہ جنوب کی طرف سے آئے تھے۔اس لئے جنوبی حکمرانوں کی فوجی قوت سے واقف تھے اور انہوں نے نہایت چالاکی سے ان کے اندر اثر ونفوذ کرکے ان کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا تھا۔لیکن مغل حکومت سے ان کا زیادہ سابقہ نہیں پڑا تھا،اس لئے ان کو مغل قوت کا اندازہ نہیں تھا۔انہوں نے جنوبی ہندوستان کے حکمرانوں کی طرح مغلوں کو بھی سمجھا اور انہوں نے مغلوں کے خلاف بغاوت کردی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے شاجہاں اور بعد میں اورنگ زیب نے ان پر حملہ کرکے انگریزی فوج کو پوری طرح کچل دیا اور مجبوراً انگریزوں کو سمندر میں پناہ لینی پڑی۔اس کے بعد انگریزوں کی توجہات دہلی کی طرف بھی ہوگئیں اور ان کو اندازہ ہوگیا کہ مغل حکمراں کی مرضی کے بغیر

ہندستان میں قدم جمانا مشکل ہوگا،اس لئے انہوں نے دہلی کی طرف رخ کیا۔ 1707 میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت میں کسی بادشاہ کو لمبے عرصہ تک حکومت کرنے کا موقعہ نہیں ملا، جانشینی کی جنگوں میں فوج اورامراء کی وفاداریاں بڑی تیزی سے بدلنے لگیں۔ ان حالات میں انگریزوں کو مغل حکمراں سے خصوصی مراعات حاصل کرنے کا موقعہ مل گیا اورانہوں نے 1717 میں انہوں نے مغل حکمران سے تجارتی مراعات حاصل کرلیں۔

بنگال اور کرناٹک کے مسلم نواب جوانگریزوں کو زیادہ بہتر طریقے پر سمجھتے تھے انہوں نے ان کو حاصل مراعات کو نہ صرف محدود کیا۔ بلکہ ان کی سرگرمیوں کو بھی صرف تجارت تک محدود کرنے کی کوشش کی۔ شروع میں ان کو کامیابی ملی۔ تقریباً نصف صدی کی کاوشوں کے بعد انگریزوں نے حالات کو اپنے لئے سازگار بنالیا۔

19.5 پلاسی کی جنگ

1756 میں نواب سراج الدولہ بنگال کا نواب بنا تو انگریزوں نے باضابطہ ٹکراؤ کی پالیسی اختیار کرلی۔ نواب کی فوجوں پر حملے شروع ہوئے اور آخر 1757 میں پلاسی کے میدان میں انگریزوں اور نواب کی فوج کا مقابلہ ہوا۔ انگریزوں نے نواب کی فوج کے بڑے بڑے سرداروں کو خاص طور پر میر جعفر کو پہلے ہی اپنے ساتھ ملالیا تھا،اس لئے برائے نام جنگ ہوئی۔ نواب کو میدان سے فرار ہونا پڑا۔ بعد میں میر جعفر کے بیٹے میرن نے ان کو تعاقب کرکے گرفتار کیا اور قتل کردیا۔

پلاسی کی جنگ ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل ہے،اس جنگ نے انگریزوں کے حوصلے بلند کردیے اورانہوں نے پہلے میر جعفر سے بڑی بڑی مراعات حاصل کیں، پھران کو معزول کرکے میر قاسم کو نواب بنایا، بعد میں ان کو بھی تنگ کرنا شروع کیا تو وہ مجبور ہو کر اودھ کی طرف فرار ہوگئے۔ اودھ کے حکمراں نواب شجاع الدولہ نے مغل حکمراں شاہ عالم کی مدد لے کر بکسر کے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ یہ جنگ 1764 میں ہوئی اورانگریزوں نے میر قاسم، نواب شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ انگریزوں نے اس کے بعد شاہ عالم سے بنگال، بہار اوراڑیسہ کی دیوانی کا حق لے لیا اور نواب شجاع الدولہ سے پچاس لاکھ تاوان وصول کیا اور مختلف قسم کے معاہدات کے ذریعہ اودھ کے معاملات میں دخیل ہوگئے۔

19.6 جنوبی ہند کی قوتیں

جنوبی ہند میں تین مقامی طاقتیں تھیں، ایک نظام حیدرآباد، دوسری مراٹھہ اور تیسری حیدرعلی۔ پلاسی اور بکسر کی فتح سے انگریزوں کے عزائم بلند ہوگئے اورانہوں نے 1766 میں حیدرعلی کی طاقت کو کچلنے کے لئے ان پر حملہ کردیا لیکن حیدرعلی نے ان کو شکست دی اور امن کا معاہدہ کرنے پر مجبور کردیا۔

1779 میں مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل جنگی سلسلہ شروع ہوا وہ بھی بلانتیجہ رہا اور آخر دونوں کے درمیان صلح ہوگئی۔ مراٹھہ ایک بڑی طاقت تھے ان کے ساتھ صلح کے نتیجہ میں انگریزوں کی طاقت بڑھ گئی اورانہوں نے میسور کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے ایک

بڑی فوج کے ساتھ حیدرعلی پر حملہ کیا۔اس جنگ میں نظام نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ 1782 میں جنگ کے دوران ہی حیدرعلی کی وفات ہوگئی ۔ان کے بیٹے ٹیپوسلطان نے جنگ جاری رکھی اور تین سال کے بعد 1784 میں انگریزوں کو پھر مصالحت پر مجبور ہونا پڑا۔انگریزوں کی نظر میں اب صرف ٹیپوسلطان ہی واحد رکاوٹ تھی جوان کو ہندوستان پر حکومت کرنے کا خواب پورا ہونے میں مانع تھی اس لئے انہوں نے ایک مرتبہ پھر بڑی فوجی قوت جمع کی اور نظام اور مراٹھہ کا اتحاد کیا اور 1790 میں ٹیپوسلطان پر حملہ کردیا،اس جنگ میں 1792 میں ٹیپوسلطان کی فوج کو شکست ہوئی اور ٹیپوسلطان کو اپنے آدھے مقبوضات بھی چھوڑنے پڑے ۔جنوب کی سب سے بڑی اور سب غیور شخصیت ٹیپوسلطان نے اس کے بعد ترکی کے خلیفہ،افغانستان اور عرب کےعلاوہ فرانس سے بھی امداد کی درخواست کی لیکن اس کو کوئی مدد نہ مل سکی آخر 14 مئی 1799 میں میر صادق کی غداری سے ٹیپوسلطان شہید ہوگئے اور میسور پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور پورے ملک میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے والی کوئی قوت باقی نہیں رہی۔

19.7 انگریزوں کی استعماری پالیسی

ٹیپوسلطان کی شہادت کے بعد ہندستان میں ان کا مقابل کوئی نہیں رہا۔اس لئے انگریزوں نے بتدریج اپنے دائرہ اختیارات کو وسعت دینی شروع کی اور مختلف طریقوں سے ہندستان کے سیاسی اور معاشی مفادات کا استحصال کرنے لگے۔کمپنی کی طرف سے گورنر ہند لارڈ ویلزلی نے اس دوران ایک نئی پالیسی اختیار کی جس کے ذریعہ ہندوستان میں ان کے قدم اور مضبوط ہوگئے ۔یہ پالیسی تھی ثالثی، ذیلی اتحاد یا جنگ، جہاں جیسی سہولت ہوتی وہ ان کو اختیار کرتے تھے۔اس کے نتیجہ میں کمپنی کو اکثر ریاستوں میں اثرونفوذ حاصل ہوگیا اور وہ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں بھی پوری طرح دخل اندازی کرنے لگے۔

ٹیپوسلطان کی شہادت کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کا کوئی مضبوط حریف باقی نہیں رہا۔اس لئے اپنے استعماری منصوبوں کو بھی عملی شکل دینے کا موقعہ ملا۔لارڈ ویلزلی سے پہلے کرناٹک تنجور اور سورت کے حکمرانوں کو پنشن کے عوض ریاست سے دستبردار کردیا اور اس کے بعد مرہٹوں جو دوسال پہلے تک انگریزوں کے حلیف تھے ان کے خلاف جنگ چھیڑ دی اور ان کو شکست دے کر ان کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ پیشوا کی حیثیت صرف کٹھ پتلی حکمراں کی رہ گئی۔

ویلزلی کی توسیع پسندانہ پالیسی کے نتیجہ میں ان کا سامراج تو پھیلا تھا لیکن تجارت کو نقصان ہوا اور جنگوں کے اخراجات بہت ہوگئے ۔ اس لئے کمپنی نے لارڈ ویلزلی کو واپس بلالیا اور ان کی جگہ وارن ہیسٹنگز کو گورنر جنرل مقرر کیا۔اس کے دور میں پیشوا نے آخری مرتبہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کئی جنگوں کے بعد ناکام رہا اور انگریزوں نے پیشوا کو پنشن دے کر اقتدار سے بے دخل کردیا،اب سندھ سے لے کر جنوب ہند تک صرف سکھوں کی طاقت تھی جو انگریزوں کے اقتدار سے آزاد تھی،باقی ہرجگہ بالواسطہ یا بلاواسطہ انگریزوں کی عملداری قائم ہوگئی تھی ۔اتفاق سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو ان کے جیسے جانشیں نہیں ملے اس لئے 1939 میں ان کی وفات کے بعد افراتفری کا عالم ہوگیا۔اوپر سے انگریزوں نے حملہ کردیا۔اگر چہ پنجاب کے لوگوں نے بلالحاظ مذہب زبردست مقابلہ کیا لیکن ہار گئے اور 1846 میں لاہور کا معاہدہ ہوا جس کی رو سے پنجاب کے کئے حصہ کردیے، جموں وکشمیر راجہ گلاب سنگھ کو فروخت کردیا۔جالندھر پر براہ راست انگریزوں نے قبضہ کرلیا اور بقیہ

پنجاب کو برٹش ریزیڈنٹ کے ماتحت کردیا۔

1848 میں لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہوکر آیا۔اس کے لئے ہندوستان میں جنگ کرنے کا تو کوئی موقعہ ہی نہیں بچا تھا اس نے انگریزوں کے ماتحت جو نام کے راجہ یا نواب رہ گئے تھے ان کی ریاستوں کو بھی براہ راست انگریزی عملداری میں لانے کی کوششیں شروع کیں۔ اس سلسلہ میں اس نے ایک قانون پاس کرایا جو Doctrine of Lapse کہلاتا ہے۔اس قانون کے تحت وہ ریاستیں جن کے والی بغیر وارث کے مرگئے ان پر کمپنی نے قبضہ کرلیا، دوسرا کام یہ کیا، بعض حکمرانوں کی پنشن ضبط کرلی اور بعض کے خطاب واپس لے لئے ۔اودھ کے نواب واجد علی شاہ پر بدانتظامی کا الزام لگا کر اس کو بے دخل کردیا اور نظام حیدرآباد سے بھی برار کا علاقہ چھین لیا۔

لارڈ ڈلہوزی نے چند سال کے عرصہ میں ہندوستانیوں کو پوری طرح مفلوج کردیا اور ملک کے تمام مفادات کا کمپنی کے حق میں پوری طرح استحصال ہونے لگا۔اس کے نتیجہ میں پورے ملک کے اندر بے چینی پیدا ہوگئی اور ہندوستانی ذہن بلالحاظ مذہب وملت ملکی مفاد میں سرگرم فکر ہوا اور آخر اس بارود کے ڈھیر کو میرٹھ چھاؤنی میں چنگاری مل گئی۔جس کے نتیجہ میں پورا شمالی ہندوستان آزادی کی جنگ میں کود پڑا۔

19.8 پہلی جنگ آزادی

1857 کی بغاوت کے اسباب کئی تھے۔سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب، ''اسباب بغاوت ہند'' میں ان اسباب کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔وہ سیاسی، معاشی اور مذہبی ہر قسم کے اسباب تھے، لیکن ان میں قدر مشترک یہ تھی کہ انگریز ہندوستان کا استحصال کررہے تھے۔ ہر قسم کی آزادی پر پابندی لگادی تھی اور رویہ اس طرح کا تھا کہ ہندوستان کے لوگ اپنے آپ کو ذلیل اور کمتر سمجھیں۔بغاوت کی ناگزیریت کو سمجھنے کے لئے ذیل میں تین اسباب کا مختصر بیان ہے۔

سیاسی اعتبار سے انگریزوں نے ملک کو مفلوج کردیا تھا۔زیادہ تر علاقوں پر براہ راست انگریزوں کی عملداری تھی اور جن ریاستوں میں براہ راست ان کی حکومت نہیں تھی ان کے حکمرانوں کو بھی بڑی حد تک بے دست و پا کررکھا تھا، خود ان کی ریاستوں میں ان کے اختیارات کمپنی کے ماتحت ہوگئے تھے، آخری فیصلہ ہر حال میں کمپنی کا ہی مانا جاتا تھا۔

معاشی طور پر بھی انگریزوں نے ہندوستان کو بہت کمزور کردیا تھا، صدیوں پرانی مقامی دستکاریاں دم توڑ رہی تھیں۔خام مال کی سپلائی بڑے پیمانے پر برطانیہ کو ہوتی اور وہاں کی کمپنیوں میں تیارشدہ مال کئی گنی قیمت پر ہندوستان میں فروخت ہوتا۔اس طرح پرانے دستکار اور ہنرمندوں کے مال کی کھپت بازار میں کم ہوگئی اور ان کو شدید بھکمری کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے مال پر محصول بھی زیادہ لگادیا اور برطانوی مال کو ٹیکس فری کرکے اور سستا کردیا۔

مذہبی اعتبار سے بھی انگریزوں کی پالیسیاں ہندوستانیوں کو ناپسند تھیں سرسید احمد خاں نے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے مذہبی منافرت کا وجود نہیں تھا۔انگریز اپنے ساتھ مشنری لے کر آئے اور انہوں نے ہندوستانیوں میں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی اور اس کے لئے ہر طرح کے وسائل بھی اختیار کئے، مثلاً بجائے مذہبی مقامات کے عام پبلک مقاموں میں مذہبی وعظ کہنے لگے اور اپنے وعظوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب پر سخت تنقیدیں کرتے تھے۔ان پادریوں کے ساتھ پولیس کے آدمی ہوتے تھے اس لئے

عوام صرف غصہ پی کر بیٹھ جاتے تھے، مشنری اسکولوں میں چھوٹے بچوں کو عیسائیت کے فضائل اور اسلام اور ہندو مذہب کی برائیاں بتائی جاتی تھیں، عیسائی ہونے والوں کو بڑی مراعات دی جاتی تھیں اور حکومت ان کی امداد کرتی تھی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں ہی مذہبی اعتبار سے بھی برطانوی حکومت سے بدظن ہو گئے۔

انگریزی فوج میں دونوں مذاہب کی تحقیر و تذلیل کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ کارتوس کے اوپر جو جھلی ہوتی تھی اس کو گائے اور خنزیر کی چربی سے بنایا گیا تھا اور اس کو ہٹانے کے لئے دانتوں سے اس کو کاٹنا پڑتا تھا بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی مجبور ہو کر عیسائی ہو جائیں۔ چونکہ عیسائی ان دونوں جانوروں کا استعمال جائز سمجھتے تھے۔

چربی کے کارتوسوں کے خلاف 29 مارچ 1857 کو میرٹھ چھاؤنی کے کچھ فوجیوں نے احتجاج کیا اور ان کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ میں وہ رجمنٹ برخاست کر دی گئی، منگل پانڈے نام کے ایک فوجی نے انگریز افسر پر گولی چلا دی اس کو گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ 24 اپریل کو بھی ایک رجمنٹ نے ان کے استعمال سے انکار کر دیا۔ 9 مئی کو ان میں سے بہت سے فوجیوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اس طرح کے لگاتار واقعات سے میرٹھ چھاؤنی میں بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی اور انہوں نے باضابطہ بغاوت کر کے متعدد انگریز افسروں کو گولی ماردی اور اپنے ساتھیوں کو رہا کر کے آزادی کا اعلان کر دیا۔ پھر یہ فوج دہلی کی طرف روانہ ہو گئی اور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس تحریک کا مرکزی کردار بنا کر پورے ملک میں نقیب بھیجے اور یہ تحریک آناً فاناً پنجاب سے بنگال تک پھیل گئی، ہر جگہ فوجیوں نے بغاوت کر دی۔ عوام نے بھی فوجیوں کا ساتھ دیا۔ متعدد امراء اور والیان ریاست بھی اس میں شریک ہو گئے۔ نواب جھجر نے باغیوں کا ساتھ دیا، رانی جھانسی نے تلوار اٹھائی۔ بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپے، جنرل بخت خاں جیسے لوگوں نے اس کی قیادت کی، عوامی سطح پر بہار میں کنور سنگھ، فیض آباد میں مولوی احمد اللہ، میوات میں چودھری الف خاں اور وسط ہند میں عظیم اللہ خاں جیسے لوگ اس تحریک کے قائد تھے۔ یہ تحریک اس زور سے اٹھی تھی کہ کسی بھی بڑی سے بڑی طاقت کے لئے اس کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہ تھا اور انگریزوں کا اقتدار بھی ان علاقوں سے ختم ہو گیا تھا۔ لیکن عملاً یہ بغاوت ختم کر دی گئی اور انگریزوں کا اقتدار چھ ماہ کے اندر اندر دوبارہ قائم ہو گیا۔

مؤرخین نے اس تحریک کی ناکامی کے اسباب بہت تفصیل سے لکھے ہیں۔ چند یہ ہیں اول یہ کہ بقول شاعر ؎ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی۔ یہ تحریک اول دن سے ہی شکست کے عمل سے دوچار تھی، دراصل یہ کوئی باضابطہ پلاننگ یا سوچی سمجھی اسکیم نہیں تھی بلکہ مختلف طبقات میں مختلف طرح کے مظالم کے خلاف شدید غصہ تھا، وہ اچانک پھٹ پڑا، چونکہ انگریزوں نے بہت بڑی تعداد میں زمینداروں، راجاؤں اور نوابوں کو نوازا تھا اس لئے ہر جگہ اہم عہدوں پر ان کے حامی فائز رہے، جنہوں نے اس بغاوت کو اندرونی طور پر کچل دیا۔ حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کی فوجوں کا اسلحہ خانہ بھی کسی نے بارود سے اڑا دیا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ الگ الگ مقامات پر فسادات بھڑکے تھے۔ ان کا مرکزی اتحاد برائے نام تھا یعنی بہادر شاہ ظفر کو صرف برائے نام امیر مانا گیا، ورنہ جھانسی میں رانی لکشمی بائی اکیلے لڑی مہاراشٹر اور یوپی میں تانتیا ٹوپے، اودھ میں بیگم حضرت محل اور مختلف علاقوں میں چھوٹے زمیندار اور نواب لڑے پوری طاقت ایک ساتھ مجتمع نہیں ہو پائی۔ تیسری بات یہ ہے کہ انگریز بہتر اسلحہ اور مواصلات کے زیادہ بہتر انتظامات سے لیس تھے۔ انہوں نے اپنی فوجوں کو متحد کر کے ایک ایک مقام پر انتظام درست کرتے گئے اور آخر دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔

1857 کی سعی انقلاب ناکام ہوکر بھی بہت سے سبق دے گئی۔ ہندو مسلم اتحاد کی شاندار روایت قائم ہوگئی اور یہاں کے لوگ اپنی ناکامی کا افسوس کرنے کے بجائے اسباب ناکامی کی تلاش میں لگ گئے، اس کے نتیجہ مختلف قسم کے تعلیمی ادارے قائم ہوئے۔ مثلاً دارالعلوم دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مختلف تحریکات سرگرم عمل ہوئیں جن کا تذکرہ آگے رہا ہے۔ ان کے ذریعہ بالآخر ہندوستان میں ایک نئی بیداری آئی اور بے شمار بڑے بڑے لیڈر، دانشور اور علماء پیدا ہوئے انہوں نے قوم کی رہنمائی کی اور آخر کار 90 سال بعد ملک آزاد ہوگیا۔

19.9 کانگریس کا قیام

سعی انقلاب 1857 کی ناکامی نے ہندستان کے لوگوں نے حوصلہ نہیں ہارا بلکہ نئی امنگ کے ساتھ ملک کی آزادی کی جدو جہد میں لگ گئے۔ اس سلسلہ میں کانگریس کا قیام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کانگریس ایک امریکی آئی سی ایس آفیسر آکٹیو بن ہیوم نے 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی، بعد میں یہ تنظیم تحریک آزادی ہند کے لئے روح رواں بن گئی۔

کانگریس کے قیام سے قبل ہندو مسلمانوں میں اپنی اپنی اور مشترکہ متعدد تنظیمیں قائم ہوچکی تھیں اور ملک میں بیداری کی جدو جہد جاری تھی۔ کانگریس نے سب کو مشترکہ پلیٹ فارم دیا۔ اس میں شروع سے ہی ہندو مسلم، عیسائی اور پارسی مذہب کے لوگ شریک رہے۔ 1905 تک 21 سال میں اس کے لگاتار 21 اجلاس ہوئے جن میں ملک کے اہم دانشور شریک ہوتے رہے۔ دادا بھائی نوروزی، بدرالدین طیب جی رحمت اللہ سیانی، فیروز شاہ مہتہ، ومیش چندر بنرجی وغیرہ نے شرکت کی اور حکومت برطانیہ کے سامنے ہندستانیوں کے مسائل رکھتے رہے۔ 1905 میں بنارس کانگریس کا اجلاس ہوا، اس اجلاس کی صدارت گوپال کرشن گوکھلے نے کی اور انہوں نے براہ انگریزوں سے ٹکراؤ کی پالیسی آغاز کیا اور برطانوی سامراجیت پر سخت تنقید کی۔ اس دوران برطانوی معاشی پالیسیوں سے تنگ آکر ملک میں سودیشی کی تحریک چلی یعنی ہندستان کی بنی ہوئی مصنوعات کا استعمال کیا جائے۔ اس سے ملکی معیشت کو بہت فائدہ ہوا۔

1906 میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم ہوئی، بظاہر اس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس ملک میں جس مذہبی اتحاد کی دعوت دے رہی ہے اس کو زک پہنچائی جائے۔ اس لئے بڑے بڑے مسلم رہنماؤں نے اس پر سخت تنقیدیں کیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر نے اس پر تنقید کی، بعد میں مسلم لیگ بھی تحریک آزادی میں شامل ہوگئی اور 1910 کے اجلاس میں مولانا مظہر الحق نے برطانوی سامراجیت پر تنقید کی۔

19.10 تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون

1919 میں دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ پر ترکی کی شکست ہوگئی اور برطانوی سفارت خلافت کو ختم کرنے کے درپے ہوگئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر نے خلافت کے تحفظ کے لئے تحریک خلافت شروع کی، کانگریس نے اس کی پوری طرح تائید کی۔ اس وقت تک کانگریس کے افق پر مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی آگئے تھے۔ وہ بھی اس تحریک میں شریک رہے، پنڈت مدن موہن مالویہ اور سوامی شردھانند نے بھی اس تحریک کی حمایت کی۔

تحریک خلافت کے ذریعہ ایک نئی تحریک کا آغاز ہوا جس نے برطانوی سامراجی عزائم کو بہت نقصان پہنچایا اور وہ تھی تحریک عدم

تعاون، مہاتما گاندھی اس کے رہنماؤں میں تھے۔ اس تحریک نے ہر سطح پر برطانوی حکومت کا بائیکاٹ کیا، برطانوی حکومت نے تحریک خلافت کو دبانے کی کوشش کی۔ متعدد جگہ لوگوں کو مارا پیٹا گیا، سر عام ذلیل کیا گیا اور متعدد جگہ لوگوں کو گولی مار کر قتل بھی کیا۔ اس کے احتجاج میں پورے ملک میں جلسے ہوئے، ایسا ہی ایک جلسہ جلیانوالہ باغ میں ہوا جس میں جنرل ڈائر نے بغیر کسی انتباہ کے گولی چلا دی، متعدد لوگ مارے گئے اور بے شمار زخمی ہوئے، اس کے بعد اس تحریک میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ ہر طبقہ کے لوگوں نے حکومت کا بائیکاٹ کیا، حکیم اجمل خاں نے قیصر ہند کا طلائی تمغہ واپس کر دیا اور بھی لوگوں نے اپنے خطابات اور تمغے واپس کیے، انگریزی طریقہ تعلیم کا بائیکاٹ کر کے، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور کاشی ودیا پیٹھ جیسے قومی ادارے قائم ہوئے، یہ تحریک بڑی کامیابی سے چل رہی تھی کہ چورا چوری کے مقام پر ایک مشتعل ہجوم نے 22 پولیس والوں کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد یہ تحریک واپس لے لی گئی۔

19.11 نمک ستیہ گرہ

برطانیہ کی استحصالی پالیسی کے نتیجہ میں پورے ملک میں غربت و افلاس کا عالم تھا کسانوں اور تاجروں سب کی حالت خراب تھی۔ مہاتما گاندھی نے 1930 میں وائسرائے کو خط لکھ کر اس اقتصادی بد حالی کی طرف توجہ دلائی اور کچھ مطالبات پیش کیے۔ لیکن وائسرائے نے ان کو تسلیم نہیں کیا۔ اس لئے 12 مارچ 1930 کو مہاتما گاندھی نے نمک ستیہ گرہ کا آغاز کیا اور اپنے 89 ساتھیوں کو ساتھ لے کر سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف پیدل کوچ کیا جو وہاں 241 میل دور واقع ہے۔ گاندھی جی کا یہ سفر 24 دن تک جاری رہا اور اس کو پورے ملک میں زبردست مقبولیت ملی، ملک کے طول و عرض سے ہزاروں لوگ اس میں شریک ہونے کو چل دیے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی ایک وفد اس میں شریک ہوا۔ 6 اپریل 1930 کو ڈانڈی کے مقام پر مہاتما گاندھی نے نمک بنا کر سرکار کا قانون نمک توڑ دیا، اس کے بعد پورے ملک میں سول نافرمانی شروع ہو گئی، پورے ملک میں مختلف ظالمانہ قوانین کی خلاف ورزی کی گئی۔ پشاور سے لے کر کلکتہ تک کروڑوں لوگوں نے اس میں حصہ لیا صوبہ سرحد میں سرحدی گاندھی خاں عبد الغفار خاں کی قیادت میں پٹھانوں نے زیادہ بے جگری دکھائی اور متعدد لوگ پولیس کی گولیوں سے مارے گئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ افراد جیل گئے۔ کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر اس کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ اس موقعہ پر فوج نے بھی بڑی تعداد میں ستیہ گرہ کرنے والوں کا ساتھ دیا اور متعدد جگہ ان پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔

نمک ستیہ گرہ کی تحریک بہت کامیاب رہی۔ اس کے حل کے لئے گول میز کانفرنس ہوئی اور متعدد مذاکرات ہوئے آخر 25 جنوری 1931 کو وائسرائے نے کانگریس کے اوپر سے پابندی ختم کر دی گئی اور گاندھی جی کو مذاکرات کی دعوت دی۔ اس کے نتیجہ میں گاندھی اِرون پیکٹ ہوا اور سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دی گئی۔ اگر چہ اس معاہدہ کو پورے طور پر مقبولیت نہیں ملی، خاص طور پر اس لئے بھی کہ گاندھی جی نے بھگت سنگھ کو پھانسی سے بچانے کے لئے کوئی گفتگو نہیں کی، تاہم مذاکرات کا ایک سلسلہ شروع ہوا، دوسری گول میز کانفرنس ہوئی وہ بھی ناکامی پر ختم ہوئی اس کے بعد سول نافرمانی کا دوسرا دور شروع ہوا، لیکن اس دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔

19.12 بھارت چھوڑو تحریک

جنگ عظیم میں برطانیہ نے ہندستانی رہنماؤں سے مشورے کے بعد ہندستان کو بھی شریک کر دیا اور ہندستانی فوج متعدد مقامات پر جنگ میں

شریک ہوئی، ہندستانی رہنما اس کے خلاف تھے۔ آخر میں اس وقت جب جنگ اپنے عروج پر تھی 8 اگست 1942 کو مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور اس میں بھارت چھوڑو تحریک کا آغاز ہوا۔ اس دوران بنگال میں سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج قائم کی اور پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف ماحول بن گیا۔ آخر انگریزوں کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ جنگ کے بعد ملک کو آزاد کر دیں گے، جنگ کا فیصلہ ہو جانے کے بعد لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے بن کر آیا اور اس نے ملک کی آزادی کو نافذ کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس درمیان کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے اس لئے ملک آزاد تو ہوا لیکن دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ 15 اگست 1947 کو ملک کی باضابطہ آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

19.13 انقلابی تحریک

1857 کے انقلاب کی ناکامی کے بعد دو محاذوں پر کام کئے گئے ایک تعلیمی محاذ تھا اور دوسرا کانگریس کا دور تھا۔ ان دونوں تحریکات کے ساتھ اول دن سے ہی انقلاب پسند لوگ سرگرم رہے۔ انہوں نے 1857 سے قبل برطانوی اقتدار کے خلاف مسلح جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ مداری صوفیہ کی تحریک کا تذکرہ جنگ آزادی میں مسلمانوں کے کردار کے ضمن میں آ گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک زبردست تحریک شہیدین کی تھی یعنی شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید بریلوی نے آزادی کی مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ اگر چہ ان کا ابتدائی ہدف پنجاب کے سکھ اقتدار سے لڑنا تھا لیکن وہ اس پورے خطے میں آزادی کے داعی تھے اور اس تحریک نے بلاشبہ ہندستان کے طول وعرض میں ایک نئی بیداری پیدا کر دی تھی۔ خاص طور پر مسلمانوں کے درمیان اس تحریک کے بڑے مثبت اثرات مرتب ہوئے، ملک کے اندر پھیلی ہوئی بدعات وخرافات کا خاتمہ ہوا اور انھوں نے مسلمانوں میں قرآن وسنت سے وابستگی پر زور دیا، یہ تحریک شمالی ہند میں اٹھی اور اس کے بعد یہ پورا قافلہ حج کرنے گیا اور کابل کے راستہ ہندستان کا رخ کیا۔ اس تحریک نے افغانستان کو سکھوں کے قبضہ سے آزاد کرا لیا تھا لیکن اس کے بعد حالات ایسے ہو گئے کہ ایک طرف تو افغانوں نے بغاوت کر دی اور دوسری طرف سکھوں نے بڑی طاقت سے حملہ کیا۔ اس کشمکش میں یہ دونوں بزرگ بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے اور یہ تحریک عملاً ختم ہو گئی۔ لیکن اس تحریک نے شمالی ہندستان میں جو بیداری پیدا کی تھی اس کے اثرات نے حالات کو بہت بہتر بنا دیا اور پورے خطے میں دینی بیداری کی فضا عام ہو گئی۔

19.14 برطانوی استبداد اور اس کا ردعمل

برطانوی حکومت نے پوری طرح استبدادی طریقہ اختیار کیا۔ 1857 کے بعد ان کی مقابل کوئی طاقت باقی نہیں رہی تھی اس لئے انہوں نے ہر مسئلہ کا حل بندوق کی گولی یا پھانسی کی شکل میں نکالا۔ ہندستانی عوام جن کا ہر طرح استحصال کیا جا رہا تھا بہت دن اس ظلم کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے بھی مسلح بغاوت کا راستہ اختیار کیا۔ منڈا اور میازو قبائل نے بغاوت کی۔ منی پور میں وطن پرستی پر مبنی مسلح تحریک چلی، میوات میں متعدد مرتبہ مسلح بغاوتیں ہوئیں۔ انگریزوں نے ان حالات کے پیش نظر کانگریس سے گفت وشنید کر کے معاملات کو پرامن طریقے پر حل کرنے کی تجویز رکھی لیکن ان مذاکرات میں عملاً برطانوی مفادات کا تحفظ ہی ملحوظ رکھا گیا۔ اس لئے 1905 کے آتے آتے ملک میں گولوں اور بندوق کا کلچر عام ہو گیا اور کئی جگہ لوگ اپنی جانوں کی پرواہ کئے بغیر انگریزوں سے مڈبھیڑ کرنے لگے۔

19.15 بنگال کی مسلح تحریک

بنگال میں اس مسلح تحریک کے اثرات سب سے زیادہ نمایاں ہوئے، سب سے پہلے اروندو گھوش کے چھوٹے بھائی برندرکمار گھوش اور سوامی وویکانند کے بھائی بھوپندر ناتھ نے تشدد کا طریقہ اختیار کیا اور مذہبی کتابوں کا سہارا لے کر انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کی تشہیر کی، انوشیلن سمیتی نام کی ایک انجمن قائم کی اور یہ انجمن اتنی مقبول ہوئی کہ صرف ڈھاکہ میں اس کی پانچ سو شاخیں قائم ہوگئیں، اس طرح کی اور بھی انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں میں لوگوں کو ورزش کرائی جاتی، اسلحہ کی تربیت دی جاتی اور ان کو ہتھیار مہیا کرائے جاتے، اس طرح کی انجمنوں کے تربیت یافتہ نوجوانوں نے متعدد مقامات پر اس کا مظاہرہ بھی کیا۔ انہوں نے لیفٹینٹ گورنر کی ٹرین کو بم سے اڑا دیا اور ڈھاکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ایلین اور انڈر یوز فریز ر پر حملہ کیا۔

19.16 شمالی ہندستان میں مسلح تحریک

مسلح انقلابی تحریکات بنگال کے علاوہ شمالی ہندستان میں بھی بڑے پیمانے پر قائم ہوئیں۔ پنجاب میں امیر چندر، راس بہاری، دینا ناتھ، اودھ بہاری اور بسنت کمار بسواس نے انقلابی انجمن بنائی اور اس کو بنگال کی انقلابی تحریک سے وابستہ کیا۔ پنجاب میں ان انقلابیوں میں سے بہت سے لوگوں کو موت کی سزا ہوئی۔ امرتسر اور پنجاب میں بموں کے کارخانے قائم کئے گئے اور متعدد مقامات پر سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ اس طرح کی تحریکات سے یقیناً امر شہید سردار بھگت سنگھ بھی متاثر ہوئے ہوں گے جنہوں نے اسمبلی میں بم پھینک کر ہندستان میں انگریزوں کے راج کو غاصبانہ ثابت کردیا۔

19.17 ریشمی رومال تحریک

دارالعلوم دیوبند جو تحریک آزادی ہند کا تعلیمی نقیب ہے اس کے استاذ مولانا محمود حسن نے ملک کی آزادی کے لئے ریشمی رومال تحریک چلائی۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان اور ترکی کی مدد سے ہندستان پر باہر سے حملہ ہو اور ملک کے اندر نوجوان طبقہ انگریزوں کی مخالفت کرے اور اس طرح ترکی اور افغانستان ہندستانیوں کو انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے میں مدد کریں۔ اس تحریک کو روبکار لانے کے لئے افغانستان میں ہندستان کی ایک جلاوطن حکومت بھی قائم کی گئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ تھے اور وزیر اعظم برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی۔ تحریک آزادی کے دوران ہندستان کی جلاوطن قائم کرنے کی یہ پہلی کوشش تھی جو پوری طرح ہندو مسلم اتحاد کا مظہر تھی۔ اس تحریک کے قائد شیخ الہند مولانا محمود حسن نے مکہ مکرمہ کا سفر کیا تا کہ ترکی کے وزیر جنگ انور پاشا سے مزید گفت وشنید کریں۔ لیکن اسی دوران اس تحریک کا راز فاش ہوگیا۔ اس تحریک میں خط وکتابت اور جنگ کے نقشوں کے لئے ریشمی رومال استعمال کئے جاتے تھے اس لئے اس کو تحریک ریشمی رومال کہا جاتا ہے۔ شیخ الہند اور ان کے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عزیز گل، مولانا نصرت حسین اور مولانا وحید احمد کو گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔

19.18 دیگر لوگ

میڈم بھیکا جی کاما نے لندن میں ہندستان کی آزادی کا جھنڈا لہرایا اور وہاں ہندستانی نوجوانوں کو منظم کر کے فری انڈیا سوسائٹی قائم کی، ان کی سرگرمیوں کو روکنے کے لئے حکومت نے ان کو لندن سے نکال دیا وہ پیرس چلی گئیں اور وہاں سے انقلابی تحریک چلائی۔

لوکمانیہ بال گنگادھر تلک نے کیسری نام سے ایک اخبار نکالا اور آزادی کا بگل بجایا، انگریزوں نے ان کا اخبار بند کر دیا اور ان کو چھ سال کی قید کی سزا دی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال، حسرت موہانی کے اردوئے معلّی اور اس طرح کے بہت سے اخبارات کو بند کر دیا اور ان کے مدیروں کو قید یا نظر بند کر دیا۔

برکت اللہ بھوپالی عظیم انقلابی رہنما تھے انہوں نے ابتداء برطانیہ کے اندر رہ کر ہندستان کی آزادی کے لیے قوم پرستوں کو منظم کیا۔ پھر ہندوستان آنے کے بعد سودیشی تحریک میں شریک ہوئے 1909 میں ان کو جاپان جلاوطن کر دیا گیا۔ وہاں انہوں نے اسلام فریٹنٹی کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ 1914 میں وہ امریکہ چلے گئے اور غدر پارٹی میں شمولیت اختیار کی پھر جرمنی اور ترکی گئے۔ اس کے بعد افغانستان میں ہندستان کی پہلی جلاوطن حکومت کے وزیر اعظم بنے اس کے بعد روس گئے جہاں لینن سے ملاقات کی، اس طرح انہوں نے پوری دنیا میں ہندستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے میں صرف کر دی اور آخر جلاوطنی میں ہی انتقال ہو گیا۔

سوہن لال بھاکنا، لالہ ہردیال اور کاشی رام نے امریکہ میں غدر پارٹی بنائی اور انہوں نے غدر کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا، جس کے ذریعہ انہوں نے برطانوی اقتدار کے خلاف عوام کو بیدار کیا۔

ونا یک دامودر ویر ساور کر نے مترمنڈل کے نام سے ایک تنظیم بنائی، انہوں نے ابھی نو بھارت اور فری انڈیا سوسائٹی بھی قائم کی، ان کے انقلابی خیالات کی وجہ سے ان کو گرفتار کر کے انڈمان بھیج دیا گیا، بعد میں رہا کر دیے گئے۔

رام پرساد بسمل اور شہید اشفاق اللہ خاں نے مسلح جدوجہد میں حصہ لیا۔ اس کی پاداش میں انگریزوں نے ان کو پھانسی کی سزا دی، اسی طرح چندر شیکھر آزاد ایک پولس مقابلے میں شہید ہوئے، سکھ دیو اور ادھم سنگھ کو بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔

19.19 آزاد ہند فوج

بنگال کے ایک انقلابی رہنما سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج قائم کی اور 1943 میں اس فوج کے ذریعہ انڈمان اور نکوبار میں آزاد ہند حکومت قائم کر لی۔ آزاد ہند فوج نے جے ہند کا نعرہ دیا تھا اور ان کا ارادہ بذریعہ طاقت دہلی پر قبضہ کرنے کا تھا۔ اس سلسلے میں جاپان نے ان کی مدد کی تھی، لیکن 1945 میں جاپان کی شکست کے بعد ان کے عزائم سرد ہو گئے۔ سبھاش چندر ملک سے باہر جانے میں کامیاب ہو گئے، لیکن ان کے قریبی ساتھی جنرل شاہنواز، کرنل گروپال سنگھ ڈھلوں اور میجر سہگل پر مقدمہ چلا۔ پنڈت جواہر نہرو اور آصف علی نے ان کی وکالت کی۔ ان کو سزا ہوئی لیکن بعد میں رہا کر دیئے گئے۔

اس طرح ملک کی تحریک کے نرم رخ یعنی کانگریس، گرم رخ یعنی مسلح تحریک اور تعلیمی اداروں کی مشترکہ کوششوں سے ہندستان کو آزادی کا سورج دیکھنے کا موقعہ ملا۔

19.20 تعلیمی ادارے

1857 کی سعی انقلاب اگر چہ ناکام ہوگئی۔لیکن اس ناکامی کے جلو سے ایک نئے ہندستان کا جنم ہوا، ہندو اور مسلمانوں نے باہم اتحاد کی اہمیت کا شدت سے احساس کیا اور شعوری طور پر ملک میں یکجہتی کی تحریک چلی، اگر چہ انگریزوں نے اس کو محسوس کرلیا تھا اور انہوں نے اس کو ختم کرنے کی کوشش بھی شروع کی۔لیکن مجموعی طور پر ہندو مسلم اتحاد کی روایت باقی رہی اور اس انقلاب کے ناکام ہونے سے ایک نیا رخ یہ نکلا کہ ہندستانیوں نے اپنی قدیم روایات کے تحفظ کے لئے اپنے تعلیمی ادارے قائم کئے۔دراصل انقلاب کی ناکامی سے یہ احساس عام ہوگیا تھا کہ انگریزوں کو سیاسی قوت سے زیر نہیں کیا جاسکتا اور انگریز جس طرح کا تعلیمی نظام چلا رہے ہیں اس میں خطرہ یہ ہے کہ ہندستانی قوم بھی اپنی روایات اور اقدار سے بے گانہ ہو کر اس میں بہہ جائے گی، اس لئے اس وقت کے دانشوروں نے اس کی کوشش کی کہ اپنا تعلیمی نظام اپنے ہاتھ میں رہے۔اس میں دو گروہ ہوگئے۔ایک گروہ تو یہ سمجھتا تھا کہ انگریزوں کی کامیابی کے پیچھے ان کا تعلیمی معیار اور ان کی تعلیمی ترقی ہے۔اس لئے اس نے عصری تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے کی کوشش کی۔دوسرا گروہ یہ سمجھتا تھا کہ ہمارے قدیم علوم ہی ہماری ملی شناخت کو باقی رکھ سکتے ہیں اس لئے انہوں نے قدیم نصاب تعلیم پر مشتمل ادارے قائم کئے۔اول الذکر کی نمائندگی سر سید احمد خاں کرتے ہیں اور ثانی الذکر کی نمائندگی مولانا محمد قاسم نانوتوی کرتے ہیں۔

سر سید احمد خاں، مغربی علوم کی ترقی سے بہت متاثر تھے انہوں نے لندن کا سفر بھی کیا تھا۔وہاں براہ راست یوروپ کے طرز تعلیم اور ان کے مضامین کا مشاہدہ کیا۔اس کے بعد ہندستان آئے یہاں پہلے انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔جس کا مقصد مغربی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنا اور اردو میں ان موضوعات پر بحث و تحقیق کرنا تھا۔اس کے بعد انہوں نے مغربی علوم کی تحصیل کے لیے ایک باضابطہ درسگاہ قائم کی جس کا نام پہلے مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ رکھا، بعد میں اینگلو محمڈن اورینٹل کالج رکھا۔سر سید کے بعد 1920 میں یہ کالج یونیورسٹی بن گیا۔ ہندستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں اس ادارہ کا غیر معمولی کردار ہے اور آج بھی ہندستان کے بڑے تعلیمی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔

مسلم دانشوروں کا ایک طبقہ وہ تھا جس نے مشرقی علوم کے تحفظ کو تحریک آزادی کی ریڑھ کی ہڈی قرار دیا اور انہوں نے حکومت کی ہر طرح کی مداخلت سے آزاد درس نظامی کے ادارے قائم کیے ان میں سب سے مشہور دارالعلوم دیوبند ہے جس کو مولانا محمد قاسم نانوتوی نے پروان چڑھایا دارالعلوم دیوبند ہندستان کی جنگ آزادی کے لیے اور مسلمانان ہند کی دینی بیداری کے لئے ایک سرچشمہ ثابت ہوا، اس کے طرز پر پورے ملک میں مدارس کا جال بچھا دیا گیا اور اس کے ذریعہ متعدد قومی و دینی تحریکات پیدا ہوئیں جنہوں نے نہ صرف ہندستان بلکہ پوری دنیا میں اسلام کا تعارف کرایا اور مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا کی، قرآن و سنت کا تحفظ کیا اور دینی تعلیم کو عام کیا۔سیاسی سطح پر تحریک ریشمی رومال، مجلس الاحرار، جمعیۃ علماء ہند اس ادارے کی دین ہیں اور دینی اعتبار پر تبلیغی جماعت جیسی عظیم جماعت اسی ادارے سے پیدا ہوئی۔ہندستان کے اندر قومی تحریک کو زندہ رکھنے اور مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے میں دارالعلوم دیوبند کا بے مثال کردار ہے۔بعد میں اسی تحریک سے متاثر

ہو کر ندوۃ العلماء قائم ہوا اور دیگر مدارس قائم ہوئے۔

19.21 خلاصہ

واسکوڈی گاما نے 1498 میں یوروپ سے ہندوستان کا بحری راستہ دریافت کیا، اس کے ذریعے یوروپ کی قومیں تجارت کرنے کی غرض سے ہندوستان آنے لگیں اور بہت جلد ان کے عزائم سامراجی ہوگئے۔ انہوں نے یہاں کی سیاست پر اثر انداز ہونا شروع کردیا اور رفتہ رفتہ اپنی فوجی قوت بڑھانے لگے۔ اسی دوران ان کی آپس میں بھی رقابت شروع ہوگئی اور آپسی جنگ میں میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ انگریزوں نے پہلے تجارتی معاہدات کے ذریعہ مراعات حاصل کیں بعد میں نوابوں کو قرض دے کر سود کے جال میں جکڑ لیا اور مختلف نوابوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ریاستوں میں اپنا اثر ڈالنا شروع کیا اور جب ان کو زیادہ قوت حاصل ہوگئی تو انہوں نے باضابطہ جنگیں شروع کردیں، میسور کی ریاست پر قبضہ کیا، پلاسی کے میدان میں شاہ عالم اور نواب سراج الدولہ کو ہرایا۔ مراٹھوں کو شکست دے کر اپنی فوجی قوت کا لوہا منوالیا، ہندستان کے بیشتر حصوں پر بلاواسطہ اور کچھ حصوں پر بالواسطہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا، انگریزوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد زبردست استحصال شروع کیا اور خاص طور پر ہندستانیوں کی تحقیر و تذلیل شروع کی ہندستان میں مذہبی منافرت پیدا کرنے کے لئے مناظرے بازی کا بازار گرم کیا، فوجیوں کی مذہبی تذلیل کے لئے گائے اور خنزیر کی چربی کے کارتوس شروع کیے، رئیسوں اور نوابوں کی تذلیل کے لئے سرعام ان کی نیلامی شروع کی، تاجروں اور دستکاروں کو ناکارہ بنانے کے لئے ان کی مصنوعات پر بھاری ٹیکس لگا دیے اور برطانوی مصنوعات کو ٹیکس فری کردیا، اس طرح ملک میں تاجر پیشہ طبقہ بے کار ہوگیا ان حالات میں ملک کے ہر طبقے میں انگریزوں کے خلاف منافرت کا ماحول پیدا ہوگیا اور پھر بتدریج پورے ملک میں بغاوت شروع ہوگئی۔ اس کو پہلی جنگ آزادی بھی کہتے ہیں۔ 1857 میں ملک کے ہر طبقے نے انگریزوں کے خلاف مسلح کارروائی میں حصہ لیا۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اس تحریک کا قائد مقرر کیا گیا لیکن یہ تحریک ناکام ہوگئی مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا، اور دہلی پر انگریزوں کا اقتدار قائم ہوگیا۔

پہلی جنگ آزادی کے ناکام ہونے کے بعد، ہندستانیوں نے مختلف طرح سے جنگ آزادی کو جاری رکھا، اس میں نمایاں کام تعلیمی اداروں کے قیام اور قومی رہنماؤں کا ہے۔ متعدد تعلیمی ادارے قائم کئے گئے جو انگریزوں کے اثر سے آزاد تھے، اسی طرح کانگریس کا قیام عمل میں آیا، اس نے 1885 سے 1947 تک ایک طبقہ کی نمائندگی کی، اس طرح مختلف سطح پر مسلح تحریکیں بھی چلتی رہیں۔ ریشمی رومال تحریک، تحریک خلافت، عدم تعاون اور سول نافرمانی کے ساتھ ساتھ آزاد ہند فوج اور انفرادی طور پر انقلابی مجاہدین کی سرگرمیوں سے یہ واضح ہوگیا کہ اب ہندستان میں برطانوی اقتدار دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی دوران دوسری جنگ عظیم شروع ہوگئی اور انگریزوں کو ملک کو آزاد کرنے کا وعدہ کرنا پڑا، اس طرح ایک طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد 1947 میں ملک آزاد ہوگیا۔

19.22 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں لکھئے۔

1- ہندستان پر قبضہ کے لئے برطانوی طریقہ کار پر روشنی ڈالئے۔

2- 1857 کی جنگ آزادی پر نوٹ لکھئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھئے۔

1- جنگ آزادی میں کانگریس کی خدمات پر روشنی ڈالئے۔

2- تحریک ریشمی رومال کیا ہے؟

3- سعی انقلاب 1857 کے اسباب بیان کیجئے۔

4- ہندستان کی جنگ آزادی میں انقلابی لیڈروں کی خدمات بیان کیجئے۔

19.23 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- تاریخ ہند عہد جدید، پروفیسر ظفر احمد نظامی

2- 1857،خورشید مصطفیٰ رضوی

3- انقلاب 1857، پی سی جوشی

اکائی۔20: مسلم ریاستیں: بھوپال، حیدرآباد، رامپور، ٹونک میسوراوراودھ

اکائی کےاجزاء

20.1 مقصد

اس اکائی میں برطانوی ہندوستان کی چھ ریاستوں کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اس اکائی کو پڑھنے کے بعد طلبہ برطانوی ہندوستان میں ریاستوں کے قیام واستحکام کو سمجھ سکیں گے، ان ریاستوں نے جن مشکل حالات میں اپنی شناخت بنائی اس سے واقف ہوں گے، برطانوی عہد میں متعدد ریاستیں قائم ہوئیں تھیں، لیکن اس اکائی میں مذکور چھ ریاستیں یعنی بھوپال، حیدرآباد، میسور، ٹونک، اودھ اور رامپور کے قیام میں بڑا تنوع ہے۔ اس کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ مختلف ریاستیں کس طرح قائم ہوئیں اور انہوں نے اپنے وجود اور اپنے تشخص کو باقی رکھنے کے لئے کیا جدوجہد کی۔ ساتھ ہی ان ریاستوں میں جو علمی، ادبی اور فنی ترقی ہوئی، طلبہ ان سے بھی واقف ہوسکیں گے۔

20.2 تمہید

مغلوں کے منصب داری نظام کی وجہ سے، مغل عہد میں بڑے سرداروں کا عروج ہوتا رہا۔ جب تک مغلوں کی مرکزی طاقت مضبوط رہی اس وقت تک یہ سردار مرکز کے خادم رہے، لیکن جیسے ہی مغل حکومت میں مرکزی قوت کمزور ہونے لگی، ان سرداروں نے رفتہ رفتہ خودمختاری حاصل کرنی شروع کردی اور اس طرح ملک میں خودمختار ریاستوں کا فروغ شروع ہوا۔ اودھ کی ریاست، حیدرآباد کی ریاست، بنگال کی ریاست وغیرہ اسی طرح کی ریاستیں تھیں۔ ان ریاستوں کے قیام سے حوصلہ پاکر مقامی قوتوں نے بھی ترقی حاصل کرکے ریاستوں کا درجہ حاصل کیا اور بعض خارجی طالع آزما بھی حکومت حاصل کرنے کی امید میں اپنی صلاحیتوں اور قوت کا استعمال کرتے رہے اس طرح کی ریاستوں کے زمرے میں روہیل کھنڈ، ٹونک اور بھوپال کی ریاست مشہور ہیں اور اول الذکر زمرے میں جاٹ، مرہٹہ، سکھ اور حیدرعلی کی ریاست مشہور ہیں۔

ہندوستان کی یہ ریاستیں ابتداً خودمختار تھیں۔ مغل عہد تک بعض ریاستیں مغل حکمراں کی اخلاقی سرپرستی کو تسلیم کرتی تھی اور بعض ریاستیں اس سے بھی آزاد تھیں۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے اثر و نفوذ کے ساتھ ہی انگریزوں کے ذریعے ان ریاستوں کی داخلی مختاری ختم ہونی شروع ہوگئی اور بعض ریاستیں تو ختم ہوگئیں اور بقیہ نے برطانوی سرپرستی میں اپنا وجود تو باقی رکھا لیکن مکمل طور پر انگریزوں کی ماتحتی قبول کرنی پڑی۔ وہ اپنی ریاست کے اندرونی معاملات میں بھی برطانوی ریزیڈنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتے تھے۔ اس طرح ان ریاستوں کا بظاہر وجود تو تھا لیکن عملاً برطانوی عملداری تھی۔ ان ریاستوں میں اپنے اثرات اور اپنی خدمات کے اعتبار سے درج ذیل ریاستیں زیادہ اہم ہیں۔ بھوپال، حیدرآباد، رامپور، ٹونک، میسور اور اودھ، ذیل میں ان ریاستوں کا مختصر تعارف کرایا جارہا ہے۔

20.3 ریاست بھوپال

برطانوی عہد کی ریاستوں میں ایک مشہور ریاست بھوپال کی تھی، بھوپال کی ریاست اپنی وسعت کے اعتبار حیدرآباد کے علاوہ تمام ہندوستانی ریاستوں سے بڑی تھی اور اپنی علمی خدمات اور علماء نوازی کے اعتبار سے سب پر فائق تھی۔

20.3.1 ریاست بھوپال کے نوابین

ریاست بھوپال میں شروع سے آخر تک حسب ذیل حکمراں رہے۔

1- نواب دوست محمد خاں (1723-1728)

2- نواب یار محمد خاں (1728-1742)

3- نواب فیض محمد خاں (1742-1777)

4- نواب حیات محمد خاں (1777-1807)

5- نواب غوث محمد خاں (1807-1826)

6- نواب وزیر محمد خاں(1807-1816) نواب غوث محمد خاں کے بالمقابل

7- نواب نذر محمد خاں (1816-1819) نواب وزیر محمد خاں کے بیٹے

8- نواب سلطاں قدسیہ بیگم(1819-1837)

9- نواب جہانگیر محمد خاں (1837-1844) سکندر جہاں بیگم کے شوہر

10- نواب سکندر جہاں بیگم (1844-1868)

11- نواب شاہجہاں بیگم(1868-1901)

12- نواب سلطاں جہاں بیگم (1901-1926)

14- نواب حمیداللہ(1926-1969)(وفات 20 رفروری 1960)

20.3.2 ریاست بھوپال کا قیام

بھوپال ریاست کے بانی نواب دوست محمد خاں تھے وہ ابتداً مغل فوج میں ملازم تھے، کچھ عرصہ کے بعد مغل فوج کی ملازمت ترک کر کے دیگر مختلف ریاستوں میں ملازمت کی۔ آخر میں مہارانی منگل گڑھ کے ملازم ہوئے اور بڑی دلجمعی سے ان کی خدمت کی، مہارانی نے ان کی وفاداری سے خوش ہو کر ان کو بیٹا بنالیا اور چونکہ مہارانی کے کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے یہی مہارانی کے وارث بنے۔ اگر چہ ان کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن ان کو وراثت میں بڑی دولت اور علاقہ مل گیا اس کے بعد ان کی طالع آزما طبیعت ان کو نئے میدانوں میں قسمت آزمائی کی طرف متوجہ کیا۔ بھیلسہ کے حاکم محمد فاروق کے دو بڑے سردار شمس خاں اور راجہ خاں میواتی کو قتل کر کے اس علاقہ پر اختیار حاصل کرلیا۔ مالوہ کے صوبہ دار رابابو رائے کو شکست دینے کے صلہ میں مغل حکمراں فرخ سیر نے خاں کا خطاب عطا کیا اب تک ریاست کی راجدھانی اسلام نگر تھی، اسی اثناء میں نظام شاہ گونڈ کی بیوہ رانی کملا پتی کی مدد کے صلے میں موجودہ بھوپال کا خطہ مل گیا اور انہوں نے اس کو دارالحکومت بنالیا۔

دوست محمد خاں کی وفات کے بعد نواب یار محمد خاں کو ان کا جانشین بنایا گیا۔ ان کو آصف جاہ والی حیدر آباد کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس لئے انہوں نے زیادہ خطرات میں الجھے بغیر اپنا عہد آسانی سے گزار دیا۔ کچھ فتوحات بھی کیں، خاص طور پر رائسین کا قلعہ انہوں نے فتح کیا۔

20.3.3 ریاست بھوپال کا استحکام

نواب غوث محمد خاں کے عہد میں ریاست بھوپال پر بڑے خطرات آئے، خاص طور پر مرہٹہ سرداروں نے بڑی بڑی فوج لے کر سات مرتبہ بھوپال پر حملہ کیا، لیکن نواب صاحب کے حسن انتظام اور محنت و جفاکشی سے یہ حملے ناکام ہو گئے اور ریاست بھوپال کا انفرادی وجود باقی رہا، اس درمیاں ریاست بھوپال اور کمپنی کے درمیان معاہدہ ہو گیا، نواب وزیر الدولہ نے وہ معاہدہ جنرل آکٹرلونی کو بھیج کر مرہٹوں کے خلاف مدد مانگی، جنرل اکٹر نے سندھیا کو تنبیہ کی اور اس طرح ریاست بیرونی خطرات کے دائرے سے نکل آئی، لیکن انگریزوں کی طاقت کا سورج طلوع ہو رہا تھا اس لئے مجبوراً ان کی سرپرستی میں ہی ریاست کے تحفظ کی کوشش کی گئی۔

20.3.4 بیگمات بھوپال

نواب نظر محمد خاں نے کمپنی سے معاہدہ کرلیا تھا اور وہ یکسو ہو کر اپنی ریاست کی تعمیر و ترقی میں لگنا ہی چاہتے تھے کہ اچانک ایک حادثے میں ان کی وفات ہوگئی۔ ان کے بعد ان کی حسب وصیت نواب سکندر جہاں بیگم حکمراں ہوئیں۔ اگر چہ اس دوران ملک کے اندرونی حالات بہت خراب رہے۔ کچھ سرداروں نے سکندر جہاں بیگم کی تخت نشینی کی مخالفت کی، ان کے شوہر جہانگیر محمد خاں کو نوابی دی گئی، لیکن کچھ عرصہ بعد ہی میاں بیوی کے درمیان اختلافات ہو گئے اور نواب جہانگیر محمد خاں نے ان پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ جس سے وہ بمشکل جانبر ہو سکیں۔ اس کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی، نواب نظر محمد خاں کی وفات کے بعد سکندر جہاں کو باضابطہ حکمراں تسلیم کرلیا گیا اور اس طرح ریاست بھوپال میں یہ دور شروع ہوا کہ باضابطہ خواتین کی نوابی تسلیم کرلی گئی۔ جو یکے بعد دیگرے 1926 تک چلی۔

بیگمات بھوپال اعلیٰ درجہ کی منتظم اور مدبر خواتین تھیں۔ انہوں نے اپنے حسن تدبیر سے یہ ثابت کردیا کہ خواتین بھی انتظامی قابلیتوں اور نظم و نسق کو چلانے میں مردوں سے کس طرح کم نہیں۔ بیگمات بھوپال کی زندگی کا ایک خاص پہلو ان کی علمی سرپرستی ہے۔ ہندوستان کے تمام تعلیمی ادارے، علی گڑھ، دیوبند، جامعہ ملیہ اور دیگر بے شمار ادارے ان کے عطیات اور سرپرستی سے مستفید ہوتے رہے، دوسری طرف انہوں نے ریاست میں علم و ادب کی بڑی سرپرستی کی ان کی علماء نوازی کی بدولت بھوپال میں بلا دوا مصار کے بے شمار علماء جمع ہو گئے تھے۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی تو ریاست میں دخیل ہی تھے ان کے علاوہ ایسے علماء کی ایک طویل فہرست ہے جو اس دور میں ریاست کے اندر موجود تھے۔

بیگمات بھوپال خاص طور پر نواب شاہجہاں بیگم نے ایک بڑا کارنامہ یہ انجام دیا کہ جو علماء ملک کے اندر اور ملک کے باہر علم و فن سے وابستہ تھے ان کی سرپرستی کی، علامہ شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی لکھنے کا پروگرام بنایا تو اس کے کل مصارف کا اہتمام ریاست بھوپال سے ہوا تھا، اس کا تذکرہ علامہ شبلی نے بھی کیا ہے۔

بیگمات کے عہد میں خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی ترقی کے لئے بھی بہت کوششیں ہوئیں خود بیگمات نے کتابیں بھی لکھیں اور تصنیف و تالیف کو فروغ دیا۔ بیگم سلطان جہاں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کو سامنے رکھ کر متعدد کتابیں لکھیں۔

بیگمات بھوپال نے ریاست کے باہر بھی علمی و تعلیمی سرگرمیوں کی سرپرستی کی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان کے عطیات سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے۔ ہندوستان کے باہر بھی انہوں نے علمی کاموں کو فروغ دیا، مکہ معظمہ میں حاجیوں کے لئے رباط قائم کروائی، لندن میں جامع مسجد تعمیر کروائی اور اس کے علاوہ بے شمار علمی و دینی و رفاہی کام کئے۔

20.4 ریاست حیدرآباد

برطانوی عہد کی سب سے بڑی ریاست نظام حیدرآباد کی تھی۔ اپنے عروج کے زمانہ میں اس کا رقبہ تقریباً 3 لاکھ مربع میل تھا اور سقوط حیدرآباد تک برطانوی ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ با اثر ریاست شمار کی جاتی تھی۔

نظام حیدرآباد کی ریاست 1724 میں قائم ہوئی اور دو سو سال سے زائد عرصہ تک قائم رہ کر 1948 میں انڈین یونین کے اندر ضم ہوگئی۔

20.4.1 حیدر آباد کے نوابین

اس ریاست میں حسب ذیل حکمرانوں نے حکومت کی۔

1- نظام الملک آصف جاہ اول (اصل نام میر قمر الدین)1748-1724

2- نصیر جنگ(1750-1748)

3- مظفر جنگ(1751-1750)

4- صلابت جنگ(1762-1751)

5- نظام الملک آصف جاہ دوم(1803-1762)

6- سکندر جاہ آصف جاہ سوم (1829-1803)

7- نصیر الدولہ آصف جاہ چہارم(1869-1857)

8- افضال الدولہ آصف جاہ پنجم (1857-1829)

9- آصف جاہ ششم میر محبوب علی خاں(1911-1869)

10- آصف جاہ ہفتم میر عثمان علی خاں (1948-1911)

20.4.2 ریاست حیدر آباد کا قیام

ریاست حیدر آباد کے بانی نظام الملک آصف جاہ اول کا اصل نام میر قمر الدین تھا، آبائی وطن ترکستان تھا، عہد عالمگیری کے بڑے امراء میں شمار ہوتے تھے، اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان کے ذاتی جوہر مزید چمکے اور محمد شاہ کے عہد میں 1722 میں مغلیہ سلطنت کے وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ لیکن اس وقت دربار میں نا اہل مصاحبین کا بڑا غلبہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے مغلیہ سلطنت کی گرتی ہوئی ساکھ کو بحال کرنے کی کوشش کی تو ان کے خلاف دربار کے بہت سے امراء نے محاذ کھول دیا، آخر بددل ہو کر دکن چلے گئے۔ یہاں ان کو چھ صوبوں کا گورنر بنا دیا گیا۔ اگر چہ یہاں انہوں نے خود مختار حکمراں کی حیثیت اختیار کر لی تھی لیکن اپنے ولی نعمت مغل حکمرانوں کو ہمیشہ یاد رکھا اور جب ان کو ضرورت محسوس ہوئی اپنی طاقت کے ساتھ ان کی مدد کی۔

نظام الملک کے سامنے سب سے بڑا خطرہ مرہٹوں کا تھا، اور ان کے پورے عہد میں مراٹھوں سے مستقل جنگ وجدال رہی لیکن ان مشکل حالات میں اس نے نہ صرف اپنی ریاست کو باقی رکھا ہے بلکہ بعض نئے علاقے بھی فتح کئے اور دو دفعہ دہلی آ کر مغل بادشاہ کی مدد کی۔

نظام الملک نے دریائے نربدا سے لے کر راس کماری تک بیشتر علاقے فتح کر لیے۔ حیدر آباد، اورنگ آباد، احمد نگر، بیجاپور، تنجور، مدورائی اور ترچناپلی میں اس کی حکومت قائم ہوگئی، کیرالہ اور مہاراشٹر کے علاوہ پورا دکن ان کے زیر تصرف تھا۔ ان کی زندگی میں ان کے ایک بیٹے

ناصر جنگ نے بغاوت کی لیکن وہ نا کام رہا، 1748 میں نظام الملک کی وفات ہوگئی۔

نظام الملک نہایت مدبر حکمراں تھا، بڑی انتظامی قابلیت تھی ذاتی طور پر وہ نہایت دیانتدار اور صاحب کردار حکمراں تھا، اس نے اپنے تدبر اور بہترین انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر یہ عظیم ریاست قائم کی اور اس کو مضبوط بنیادیں عطا کیں۔

نظام الملک آصف جاہ خود بڑے مدبر اور دانشمند تھے، لیکن ان کے جانشین اس تدبر کا مظاہرہ نہ کر سکے ان کے دو بیٹوں ناصر جنگ اور مظفر جنگ کے درمیان جانشینی کی جنگ شروع ہوئی اور اس جنگ میں مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کی مدد لی اور ناصر جنگ نے انگریزوں کا تعاون حاصل کیا۔اس طرح انگریزوں اور فرانسیسیوں کو حیدرآباد میں براہ راست اور دیگر ریاستوں میں بھی عمل دخل شروع ہوگیا۔شروع میں ناصر جنگ کو کامیابی ملی تھی لیکن جلد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔پھر مظفر جنگ حکمراں ہوئے ان کے بعد فرانسیسیوں نے صلابت جنگ کی حمایت کی، پیشوا نے اس کی مخالفت کی وہ غازی الدین کو حکمراں بنانا چاہتا تھا لیکن غازی الدین کی حادثاتی موت کے بعد صلابت جنگ حکمراں ہوگئے، لیکن ان کے بارہ سالہ دور میں وہ محض کٹھ پتلی حکمراں بنے رہے، بیرونی خطرات نے ریاست کو بہت کمزور کردیا۔ریاست کا آدھا اقتدار بھی ختم ہوگیا۔

20.4.3 نظام علی خاں

صلابت جنگ کے بعد نظام علی خاں حکمراں بنا۔ان کا تذکرہ خصوصیت سے کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس کو ریاست حیدرآباد کہتے ہیں اس کا صحیح معنوں میں مؤسس نظام علی خاں ہی ہے، نظام علی خاں نے فرانسیسیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی حمایت حاصل کی اور مختلف معاہدات کے ذریعہ اپنی آزادی تو کھوئی لیکن برطانوی فوج کے ایک بڑے حصہ کو اپنی حکومت اور اپنی حفاظت کے مختص کرالیا۔نظام علی خاں نے ریاست کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کی کوشش کی اور ان کے سامنے جو نظام کے مقبوضات تھے ان کا بہتر انتظام کیا اور ملک میں ایک حد تک خوشحالی لوٹ کر آگئی، نظام نے ہی ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی اور ٹیپو سلطان کی موت کے بعد اس کا علاقہ حیدرآباد اور انگریزوں نے اپنے درمیان بانٹ لیا، اس طرح نظام علی خاں کی مصلحت اندیشی اور مآل اندیشی نے ریاست حیدرآباد کو بھی محفوظ کردیا اور خود نظام علی خاں بھی محفوظ رہے۔

نظام علی خاں کے بعد ریاست پوری طرح انگریزوں کے زیر نگرانی رہی۔1857 کے خونیں ہنگاموں بھی ریاست حیدرآباد نے انگریزوں کی مدد کی، خاص طور پر اس وقت ریاست کے مختار یعنی میر منشی نواب سالار جنگ نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا، اس کے صلے میں، حیدرآباد کا مقام برطانوی حکومت کی نظر میں بہت بلند ہوگیا اور حیدرآباد کو خیر خواہ ریاست کا درجہ حاصل ہوگیا اور پھر انگریزوں نے بیرونی خطرات سے پوری طرح ریاست کی حفاظت میں تعاون دیا اور پھر ریاست کے لئے کوئی خطرہ باقی بھی نہیں رہ گیا تھا۔نظام علی خاں کے بعد ریاست میں پانچ نواب گزرے جنہوں نے نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔آخر کے دو نواب میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے دور میں ریاست کے اندر علمی ادبی اور تاریخی ذوق بہت بلند ہوا۔ریاست میں بہت سے معرکہ آراء علمی کام ہوئے اور اپنے عہد میں اسلامی علوم وفنون اور اسلامی کتابوں کی اشاعت کے لئے حیدرآباد سب سے بڑا مرکز بن گیا۔جس کے اثرات آج تک محسوس کئے جاتے ہیں۔

20.4.4 ریاست حیدرآباد کی علمی وادبی خدمات

ریاست حیدرآباد ایک طرح سے مغل عہد کا ضمنی توسیعہ ہے، نظام الملک دکن میں مغل حکمرانوں کے نائب کی حیثیت سے ہی گئے تھے۔اس لئے مغل دربار کی علم دوستی اور علماء کی سرپرستی کی روایت اس ریاست میں بھی برقرار رہی، شاہ نواز خاں اور غلام علی آزاد بلگرامی جیسے فضلاءروزگاراس دربار سے شروع میں ہی وابستہ ہوگئے۔شاہ نواز خاں جو عصام الدولہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ان کی کتاب مآثر الامراء، عہد عالمگیری کے بنیادی مراجع میں شمار کی جاتی ہے اور غلام علی آزاد بلگرامی کی کتابوں میں سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان، مآثر الکرام، خزانہ عامرہ اور سرو آزاد بہت مشہور ہیں۔

بعد میں مغل دربار کے زوال کے ساتھ ساتھ علماء اور شعراء کا رخ بھی حیدرآباد کی طرف ہوتا گیا، مولانا بحرالعلوم فرنگی محلّی کی وابستگی سے ریاست کو اعتبار حاصل ہوگیا اور بعد میں مولانا شبلی نعمانی، مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شرر، مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے نامور علماء حیدرآباد سے وابستہ ہوگئے، جہاں استاد مرزا داغ دہلوی نے حیدرآباد کی محفلوں کو رونق بخشی اور بعد کے ادوار میں شعراء کی ایک بڑی جماعت نے حیدرآباد ہی کا رخ کیا اور اس سرزمین پر علم وادب کی سرپرستی ایسی ہوئی کہ پھر یہاں بڑے بڑے علماء اور ادباء پیدا ہوئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور امجد حیدرآبادی اسی خاک نے پیدا کئے۔

خاص میر عثمان علی خاں کے دو کارنامے ایسے ہیں جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے ایک جامعہ عثمانیہ کا قیام، دوسرا دائرۃ المعارف کا قیام، اول الذکر اگرچہ ایک قدیم مدرسہ تھا جس کو میر عثمان علی خاں نے 1918 میں جدید طرز کی یونیورسٹی میں تبدیل کیا اور یہاں ذریعہ تعلیم اردو رکھا۔ یہ ہندوستان کی اولین یونیورسٹیوں میں سے ہے اور اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس یونیورسٹی میں تمام علوم کو اردو یعنی مقامی زبان میں پڑھانے کا تجربہ کیا اور مختلف علوم کی اصطلاحات کو سمجھنے کے لئے باضابطہ ایک محکمہ قائم کر کے مختلف علوم کی پانچ لاکھ سے زیادہ اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا۔

دوسرا کارنامہ دائرۃ المعارف حیدرآباد کا قیام ہے۔یہ ادارہ اپنی نوعیت کا منفرد ادارہ ہے۔اس کے تحت عربی زبان کی سینکڑوں کتابیں شائع ہوئیں۔بہت سے متون اور مراجع جو مخطوطات کی شکل میں محفوظ تھے اور ان تک رسائی صرف چند لوگوں کی تھی ان کو ایڈٹ کر کے شائع کیا اور اس طرح ان کتابوں کے عام اسکالروں کی دسترس میں آجانے کی وجہ سے علمی کام میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

20.5 ریاست میسور

ہندوستان کی آخری آزاد ریاست میسور تھی، اس کا دارالحکومت پہلے میسور تھا پھر سرنگا پٹم بنایا گیا میسور کی ریاست کو سلطنت خداداد کہا جاتا ہے۔اس میں صرف دو حکمراں ہوئے، لیکن اپنی قابلیت شجاعت اور بہتر انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس کے حکمراں حسب ذیل تھے:

1- سلطان حیدر علی 1761-1783

2- سلطان فتح علی (ٹیپو سلطان) 1783-1799

20.5.1 ریاست میسور کا قیام

میسور ایک قدیم ریاست تھی جس پر ایک ہندو راجہ کی حکومت تھی، لیکن راجہ برائے نام تھا عملاً سارے اختیارات وزیر نندراج کے ہاتھ میں تھے۔ اسی زمانے میں، سلطان حیدر علی نے نواب آرکاٹ کے یہاں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے نوکری شروع کی، بعد میں نواب آرکاٹ کی سفارش پر نندراج نے ان کو سرنگا پٹم میں ایک چھوٹے سے دستے کی کمان سپرد کی۔ اب حیدر علی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملا اور اس کی انتظامی قابلیتوں اور سپاہیانہ بہادری کا سکہ جم گیا۔ 1755 میں حیدر علی نے مرہٹوں کو زبردست شکست دی، اس کے بعد ان کو میسور کی پوری فوج کا سپہ سالار بنا دیا گیا اور مختلف خطابات بھی دیے گئے۔

میسور کا راجہ کامل طور پر غیر مختار تھا، حکومت عملاً نندراج کے قبضہ میں تھی۔ راجہ نے حیدر علی سے گزارش کی کہ میرے اختیارات مجھے دلائے جائیں۔ نندراج بزرگ ہو چکے تھے اور حیدر علی کو اپنی اولاد کی طرح مانتے تھے۔ ان کی فہمائش پر نندراج نے، وزارت کی سند واپس کر دی اور اپنی جاگیر پر چلے گئے، نندراج نے بعد میں حیدر علی کی بڑی مدد کی تھی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محض حیدر علی کی گزارش پر نندراج نے وزارت چھوڑ دی تھی۔

حیدر علی کے مشورے سے راجہ نے نیا وزیر کھنڈے راؤ کو بنایا۔ لیکن بعد میں راجہ نے احسان فراموشی کی اور نئے وزیر کے ساتھ مل کر خود حیدر علی کے خلاف سازش رچی اور انتہائی نازک وقت میں حیدر علی کا محاصرہ کرلیا گیا۔ حیدر علی نہایت بہادری اور جانبازی سے نہایت مشکل راستوں سے ہوتا ہوا راتوں رات سرنگا پٹم سے نکل کر بنگلور پہنچ گیا اور وہاں اپنے وفاداروں کو جمع کر کے سرنگا پٹم پر حملہ کر کے کھنڈے راؤ کو گرفتار کرلیا اور راجہ کو نظر بند کر دیا، اس کے بعد راجہ سے اجازت لے کر اپنی خود مختار حکومت کا اعلان کر دیا، اس طرح 1761 میں میسور کے اندر ایک نئی طاقت کا سورج طلوع ہوا۔

20.5.2 سلطان حیدر علی

حیدر علی 1761 میں خود مختار حکمراں بنے۔ میسور کے راجہ کو انہوں نے پنشن دے دی اور سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا، اس کے بعد اپنے علاقہ کی توسیع کی طرف توجہ دی اور بہت قلیل عرصہ میں نندی، بدنور، کوچین، گوا اور منگلور کے علاوہ جزائر مالدیپ کو بھی فتح کرلیا۔ ان جنگوں میں مراٹھوں اور پرتگالیوں کو پے در پے شکست ہوئی۔ جس کی وجہ سے حیدر علی کی دھاک بیٹھ گئی اور انگریز، نظام اور مراٹھے سب اس کی طاقت سے گھبرانے لگے اس کے بعد انگریزوں نے نظام، مراٹھہ اور آرکاٹ کے نواب کے ساتھ اتحاد قائم کیا اور سب کی متحدہ فوج نے بغیر کسی عذر کے میسور پر حملہ کر دیا۔ تاریخ میں اس حملہ کو میسور کی پہلی جنگ کہا جاتا ہے۔ یہ 1767-1769 تک چلی اور اس میں تمام اتحادیوں کو شکست فاش ہوئی۔ نظام اور مراٹھوں نے معذرت کر کے جنگ سے علیحدگی اختیار کرلی اور انگریز آخر صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

میسور کی پہلی جنگ کے بعد دس سال تک صلح باقی رہی، اگر چہ اس درمیان ناخوش گوار واقعات آتے رہے لیکن باضابطہ جنگ نہیں ہوئی۔ 1780 میں میسور کی دوسری لڑائی کا آغاز ہوا، اس کا اصل سبب تو معاہدہ مدراس کی انگریزوں کے ذریعہ خلاف ورزی تھی، دوسری وجہ یہ تھی

کہ انگریزوں کی غداری کی وجہ سے حیدرعلی نے فرانسیسیوں کا ساتھ لے لیا تھا اس لئے بھی اختلافات وسیع ہوگئے۔ اس جنگ میں بھی انگریزوں کولگاتار شکست کا سامنا کرنا پڑا اور رفتہ رفتہ حیدرعلی نے انگریزوں کے زیادہ تر مقبوضات پر دوبارہ قبضہ کرلیا، اسی درمیان 6 دسمبر 1782 کو حیدر علی کی وفات ہوگئی۔

20.5.3 ٹیپو سلطان

ٹیپوسلطان کا اصل نام فتح علی تھا۔ شجاعت، بہادری، معاملہ فہمی اور انتظامی صلاحیتوں میں اپنے باپ کا صحیح جانشین ہونے کے ساتھ ان کو علم وادب کا بھی بڑا بالیدہ ذوق تھا، باپ کی وفات کے بعد ٹیپوسلطان میسور کا حکمراں بنا کر ٹیپوسلطان نے میسور کی دوسری لڑائی کو جاری رکھا اور مزید دو سال تک انگریزوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ اس مقابلے میں آخر کار انگریزوں کو پھر صلح کرنی پڑی، 1784 میں صلح ہوئی اس کے ساتھ ہی میسور کی یہ لڑائی ختم ہوگئی۔

جنگ سے فارغ ہونے کے بعد ٹیپوسلطان نے ریاست کی تعمیر وترقی کی طرف توجہ دی اور نہایت قلیل عرصہ میں ریاست پوری طرح خوشحال ہوگئی۔ ٹیپوسلطان نے زمینداری نظام ختم کردیا اور ساری زمینیں کاشتکاروں کے حوالہ کردیں، ریاست میں درآمدات کو کم کرنے اور برآمدات کو بڑھانے کے لئے متعدد کارخانے قائم کئے، تعلیم خاص طور پر اعلیٰ تعلیم کے لئے جوامع العلوم کے نام سے ہندوستان کی پہلی یونیورسٹی قائم کی، فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کے ترجمہ کے لئے ایک دارالترجمہ قائم کیا، سرکاری بینک بنایا اور اسلحہ سازی کا کارخانہ بنایا۔

میسور کی تعمیر وترقی سب سے زیادہ انگریزوں کو ناپسند تھی اور وہ لگاتار اس کوشش میں تھے کہ اس کو ختم کردیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ پھر ایک بڑا اتحاد قائم کیا۔ نظام اور مراٹھوں کو اپنے ساتھ ملا کر میسور پر حملہ کردیا۔ تاریخ میں یہ میسور کی تیسری لڑائی کہلاتی ہے یہ جنگ 1790-1792 تک چلی اور اس جنگ میں ٹیپوسلطان کو مجبور ہوکر صلح کرنی پڑی اور اپنی ریاست کا آدھا حصہ بھی چھوڑنا پڑا۔

ٹیپوسلطان نے اس شکست کے بعد بیرونی امداد حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی، ترکی، ایران، افغانستان کے حکمرانوں سے امداد کی درخواست کی، لیکن کہیں سے امداد نہیں ملی اور اگر کہیں سے کوئی امید ہوتی بھی تو انگریز سازش کرکے اس کو ناکام بنادیتے۔ ٹیپوسلطاں کے لئے سارے راستے بند کردیئے اور ادھر اندرونی طور پر ٹیپوسلطاں کے خاص لوگوں کو انگریزوں نے سازش میں شریک کرلیا خاص طور پر میر صادق علی اور میر غلام علی نے غداری کرکے انگریزوں کو بڑی مدد دی اور 1799 میں میسور کی چوتھی لڑائی آغاز ہوا۔ جو اسی سال 6 مئی 1799 کو ٹیپوسلطان کی شہادت پر ختم ہوگئی۔ انگریز فوج دھوکہ سے قلعہ میں داخل ہوئی تھی اور اس کی کمان لارڈ ویلزلی کررہا تھا۔

20.6 ریاست ٹونک

ہندوستان میں برطانوی عہد کی ریاستوں میں ٹونک کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ریاست ایک طالع آزما اور کسان کے بیٹے کے عزم وحوصلہ کا نمونہ ہے جس نے محض اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خداداد شجاعت کے بل پر اٹھارہویں کے ربع آخر میں انگریز حکومت کا ناطقہ بند کردیا تھا اور جب انگریز اس جانباز کو طاقت سے ختم کرنے میں ناکام رہے تو پھر دام تزویر بچھا کر اس شہباز کو پابہ زنجیر ہونے اور طائر زیر پر منقار کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور کردیا۔ ٹونک کی ریاست 1817 میں قائم ہوئی اور 1947 میں حکومت ہند کے اندر انضمام کے بعد ختم ہوگئی۔

20.6.1 ٹونک کے نوابین

ٹونک میں درج ذیل نواب گزرے ہیں:

1- نواب محمد امیر خاں بانی ریاست (1817-1834)

2- نواب محمد وزیر خاں (1834-1864)

3- نواب محمد علی خاں (1864-1867)

4- نواب محمد ابراہیم علی خاں (1867-1930)

5- نواب محمد سعادت خاں (1930-1947)

20.6.2 ریاست کا قیام

ریاست کے بانی نواب محمد امیر خاں کے دادا طالب خاں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آئے اور رامپور ریاست کے اجداد میں نواب علی محمد خاں کے یہاں ملازمت اختیار کی۔ انہوں نے اپنی زندگی اسی ملازمت میں بسر کر دی، ان کے بیٹے حیات محمد خاں نے نواب علی محمد خاں کے سپہ سالار دوندے خاں کی ملازمت اختیار کی اور ان کے مرنے کے بعد کچھ زمینیں حاصل کر کے کاشتکاری شروع کر دی۔ وہ صوفی منش آدمی تھے۔ اپنی کاشتکاری میں لگے رہے، ان کے یہاں 1764 میں نواب محمد امیر خاں پیدا ہوئے۔

نواب امیر خاں ابتداء سے ہی بڑے طالع آزما تھے، معمولی کاموں اور چھوٹے علاقے میں انہیں محصور رہنا گوارہ نہیں تھا اور باہر جانے کی ان کو اجازت نہیں تھی۔ اس لئے ایک مرتبہ بغیر بتائے گھر سے غائب ہو کر میرٹھ میں غلام قادر کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد واپس گھر آئے والدین سے اجازت لے کر صرف بیس سال کی عمر میں طالع آزمائی کے لئے نکل پڑے۔ شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کی متعدد ریاستوں میں ملازمت کی، آزاد بھی رہے۔ آخر میں جسونت رائے ہولکر سے دوستی ہو گئی اور پھر اسی دوستی میں اس کی زندگی مختلف نشیب وفراز سے گزری، نواب امیر خاں نے متعدد مرتبہ انگریزوں کو شکست دی۔ ایک مرتبہ پیشواء کو بھی شکست دے کر پونہ پر قبضہ کر لیا۔ لارڈ ویلزلی، جنرل مٹکاف، راجہ رنجیت سنگھ جیسے لوگ اس کی بہادری اور شجاعت کے بڑے قدرداں تھے اور انگریزوں نے ان کے دور عروج میں بڑی بڑی جاگیر اور نقد نذرانہ کے عوض ان سے مصالحت کرنی چاہی لیکن وہ تیار نہیں ہوئے، انہوں نے انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش کی، جو کامیاب نہ ہو سکی، 1805 میں ان کے دوست جسونت رائے ہولکر نے انگریزوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا، اس کے بعد امیر خاں اکیلے رہ گئے، آخر دس سال کی مزید تگ ودو کے بعد ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ 1817 میں امیر خاں نے بھی انگریزوں سے صلح کر لی اور اس صلح کے نتیجہ میں ریاست ٹونک قائم ہوئی۔

20.6.3 ٹونک کے فرمانروا

ریاست ٹونک قائم تو ہو گئی لیکن اول دن سے ہی انگریزوں کی نظر اس کو ختم کرنے یا بے اثر کرنے پر تھی۔ ٹونک کے پہلے نواب امیر

خاں کی جنگی مہارت اور ٹونک کے نواب کا سید احمد شہید بریلویؒ سے تعلق خاص طور پر نشانے پر تھے۔اس لئے انگریزوں نے اس ریاست کو بے اثر کرنے کی پوری کوشش کی۔نواب امیر خاں کی وفات کے بعد ان کو اس کا پورا موقعہ بھی مل گیا،وزیرالدولہ نواب وزیر محمد خاں نے اپنے باپ کی پالیسیوں کو جاری رکھا ان کے بعد ان کا بیٹا عین الدولہ نواب محمد علی خاں حکمراں ہوا۔ان کے زمانے میں لاوا کے ٹھاکروں نے سرکشی کی اور ان میں سے چند مارے گئے۔انگریزوں نے اس کو بہانہ بنا کر نواب کو معزول کر دیا،انہوں نے اپنی معزولی قبول اپنے بڑے بیٹے حافظ محمد ابراہیم کو مسند پر بٹھایا اور خود انگریزوں کی حسب منشا بنارس چلے گئے،جہاں بقیہ پوری عمر گزار دی۔

نواب محمد علی خاں علم دوست اور علماء نواز شخصیت کے مالک تھے۔بنارس میں انہوں نے ایک کتب خانہ قائم کیا اور ساری عمر مطالعہ کتب اور علماء کی صحبت میں بسر کی۔خود بھی متعدد کتابیں لکھیں اور علماء کی ایک جماعت سے متعدد اہم کتابیں تصنیف کرائیں۔

نواب محمد ابراہیم خاں اور ان کے بعد نواب محمد سعادت خاں نے امن و عافیت کے ساتھ اپنی ریاست میں حکمرانی کی،ریاست کی فلاح وترقی کے لئے کوشاں رہے اور علم و ادبی کی سرپرستی کرتے رہے۔ان کے عہد میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا اور 1947 میں ان کی وفات ہوگئی ان کے بعد چند ماہ کے عرصہ میں کئی نواب ہوئے اور آخر ریاست مختلف مراحل سے گزر انڈین یونین کا حصہ بن گئی۔

20.6.4 ٹونک کی علمی وادبی روایت

ٹونک ایک دور افتادہ اور علم و ادب کے مراکز سے دور ایک سنگلاخ زمین ہے۔لیکن نوابین کی یہاں آمد کے نتیجہ میں علم وادب اور دین و دانش کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ٹونک بڑے بڑے مراکز کی ہمسری کرنے لگا۔

ٹونک کے اندر مختلف علوم وفنون کے متعدد ماہرین پیدا ہوئے۔فن طب میں حکیم برکات احمد اور ان کے خانوادے کو ید طولیٰ حاصل تھا اور بعد میں اس خاندان میں ہر طرح کے ماہرین فن اور علماء و حکماء پیدا ہوئے۔فن حدیث اور اسماء الرجال میں مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اپنے عہد کی نامور شخصیت تھے،لکھنؤ میں ایک عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں آپ کی متعدد کتابیں ہیں۔حدیث کے ایک اور بڑے عالم مولوی محمود حسن خاں تھے۔ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک مولوی سید نجف علی خاں جھجری بھی ایک طویل عرصہ تک ٹونک میں مقیم رہے،ان کو مختلف علوم اور متعدد زبانوں میں بڑی مہارت تھی اور نظم ونثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ان کی سو کے قریب تصنیفات کا تذکرہ ملتا ہے۔حافظ محمود شیرانی کا تعلق بھی ٹونک سے ہی تھا،وہ دور آخر کے سب سے بڑے فارسی کے ماہر تھے۔فارسی مخطوطات پر ان کی وسیع نظر تھی۔ان کے علاوہ شعراء میں بسمل خیر آبادی،مضطر خیر آبادی،اسد لکھنؤ،اختر شیرانی جیسے نامور شعراء ٹونک سے وابستہ رہے۔

نوابین ٹونک کا ذوق کتاب داری بھی قابل ذکر ہے۔انہوں نے بڑی تعداد میں مخطوطات جمع کئے اور جو دستیاب نہ ہو سکتے تھے ان کو نقل کرایا،اس طرح ایک بڑا کتب خانہ ترتیب دیا۔اس کتب خانے کو بعد میں حکومت ہند نے مزید ترقی دے کر ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنا دیا ہے۔یہ کتب خانہ اب ہندستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے اہم کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے۔

20.7 ریاست اودھ

اودھ ایک خطہ کا نام ہے۔ یہ نام اودھ کے علاقہ میں واقع ایک شہر ایودھیا کی مناسبت سے پڑا ہے، اس پورے خطے کو اسی لئے اودھ کہا جاتا ہے۔ اودھ کا ترجمہ ہوگا دارالامن یعنی جہاں جنگ نہ ہو۔ یہ بڑا زرخیز خطہ ہے اور اس سے وابستہ متعدد تاریخی اور افسانوی روایات مشہور ہیں۔ مسلم عہد حکومت میں یہ خطہ تاریخ کی روشنی میں رہا۔ لیکن اس کو اصل شہرت جب ملنی شروع ہوئی جب برہان الملک سعادت خاں اس کے صوبے دار بنے اس کے بعد یہ علاقہ بتدریج، ایک ریاست میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔

20.7.1 ریاست اودھ کے نوابین

اس ریاست میں حسب ذیل نواب ہوئے۔

1- سعادت خاں برہان الملک 1722-1739

2- صفدر جنگ 1739-1754

3- شجاع الدولہ 1753-1775

4- آصف الدولہ 1775-1797

5- آصف جاہ مرزا 1797-1798

6- یامین الدولہ (سعادت علی خاں) 1798-1814

7- رفاعت الدولہ (غازی الدین حیدر خاں) 1814-1827

8- ناصر الدین حیدر سلیمان جاہ 1827-1837

9- نجم الدولہ امجد علی شاہ 1842-1847

10- واجد علی شاہ 1847-1856

20.7.2 ریاست کا قیام

ریاست اودھ بنیادی طور پر مغل سلطنت کا ایک صوبہ تھا اور سعادت خاں برہان الملک کے عہد تک اس کی حیثیت صوبہ کی رہی۔ جب سعادت خاں اس صوبہ کا صوبہ دار ہوا تو چونکہ وہ خود ایک طاقتور سردار تھا اس لئے اس صوبہ کو بھی انفرادی تشخص ملنے لگا اور سعادت خاں کی طاقت کا احساس کرتے ہوئے مغل حکمراں نے بھی ان کی اہمیت تسلیم کر لی اور ان کو "نواب وزیر" کا خطاب دے کر ایک طرح کی خودمختاری عطا کر دی۔ سعادت خاں برہان الملک نے اپنے عہد میں شاندار حکومت کی اور مغلوں کے بھی قابل اعتماد رہے۔ لیکن ادھر مغلیہ سلطنت لگاتار کمزور ہوتی جارہی تھی اور برطانوی قوم نہایت باریک بینی سے اس تاک میں تھی کہ ان کو کب موقع ملے اور کب وہ مداخلت کر کے صورت حال کا

استحصال کریں ۔اس دوران بکسر کی لڑائی پیش آ گئی اور 1764 میں پہلی مرتبہ انھوں نے شمالی ہند کے حکمرانوں کو باقاعدہ ٹکر دی ۔اس جنگ میں اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ مغل حکمراں شاہ عالم کے ساتھ تھے ۔شکست کا اثر شجاع الدولہ پر بھی پڑا،ایک تو اس کو تاوان جنگ دینا پڑا ۔دوسرا اثر یہ ہوا کہ انگریزوں کو اودھ کے معاملات میں دخل اندازی کا موقع مل گیا اور وہ نہایت چالاکی سے ریاست کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے لگے ۔اس طرح یہ ریاست ابھی ٹھیک سے قائم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کو زوال شروع ہو گیا ۔

20.7.3 استحکام اور مکمل خودمختاری

شجاع الدولہ بڑا جری اور باہمت نواب تھا ۔اس نے بکسر کی جنگ میں انگریزوں سے شکست کھانے کے باوجود اپنی فوجی طاقت مستحکم رکھی اور اس سال کے بعد خود انگریزوں سے فوجی مدد لے کر روہیل کھنڈ کے حکمراں حافظ رحمت کو شکست دی اور روہیل کھنڈ کا علاقہ بھی اپنی ریاست میں شامل کرلیا،شجاع الدولہ کا عہد اودھ کی ریاست کے لئے سب سے زیادہ مستحکم تھا اور اسی عہد میں اس کی حدود سلطنت بھی سب سے زیادہ وسیع تھیں ۔

شجاع الدولہ کے بعد اگر چہ ریاست کے استحکام میں کمی آئی ،بعض علاقے بھی انگریزوں نے براہ راست اپنے قبضہ میں لے لئے لیکن 1814 میں غازی الدین حیدر خاں نے نواب وزیر کا لقب چھوڑ کر اپنے لئے بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا، گویا اودھ کو خودمختاری جب ملی جب وہ اپنے زوال کے راستہ پر پابہ رکاب ہو گیا تھا ۔

20.7.4 انگریزوں کی ریشہ دوانیاں

شجاع الدولہ کے بعد آصف الدولہ (1797-1775) حکمراں ہوا اس کے زمانے میں کمپنی نے نواب کا خراج دو لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار کردیا اور نئے نواب کو مجبور کیا کہ وہ بنارس ، جونپور اور غازی پور سے پوری طرح دستبردار ہو جائے ۔ 1781 میں لکھنؤ کی فوج میں تخفیف کردی گئی ۔اس کے بعد لارڈ ویلزلی نے 1801 میں آصف الدولہ کے سوتیلے بھائی سعادت علی خاں کو حکمراں بنایا اور اس سے روہیل کھنڈ اور دوآب کا علاقہ کمپنی کے لئے لے لیا ۔اس طرح لکھنؤ کے نواب انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے ۔

20.7.5 ریاست کا خاتمہ

لارڈ ڈلہوزی ہندستان آیا تو اس کی الحاق کی پالیسی نے لکھنؤ کو بھی متاثر کیا ۔اس دور میں لکھنؤ کے نواب پوری طرح انگریزوں کے ماتحت ہو چکے تھے ۔فوجی قوت برائے نام رہ گئی تھی آخری نواب واجد علی شاہ کو حکومت کے اختیارات مطلق نہیں تھے ۔انگریزوں نے اس نام کی ریاست کو بھی ختم کرنے کے لئے نواب واجد علی شاہ کو مجبور کیا کہ وہ ریاست کے جملہ حقوق سے دستبردار ہو کر پنشن لے کر ریاست سے دور چلے جائیں ۔نواب واجد علی شاہ کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا اس لئے انہوں نے پنشن قبول کرلی اور اودھ سے دور کلکتہ کے مٹیا برج علاقے میں رہنے لگے اس طرح 1856 میں یہ ریاست پوری طرح ختم ہو گئی ۔نواب واجد علی شاہ کا انتقال 1887 میں کلکتہ میں ہوا ۔انگریزوں نے ریاست کا انتظام پہلے ایک کمشنر کے سپرد کیا بعد میں آگرہ کے ساتھ اس کا الحاق کردیا ،اس کے سربراہ کو لیفٹیننٹ گورنر شمالی مغربی صوبہ جات کہا جاتا تھا ۔

20.7.6 علمی وادبی ترقی

سعادت خاں اور شجاع الدولہ کے عہد حکومت تک فیض آباد دارالحکومت تھا۔آصف الدولہ نے لکھنؤ کو ترقی دی اور اسے دارالحکومت بنایا۔لکھنؤ اپنے عہد کا نہایت خوبصورت قصبہ تھا،شاہی عمارتیں،شاندار محلات،خوبصورت باغ،حویلیاں اور بے مثال امام باڑوں نے اس شہر کو پائیدار عظمت بخشی،دہلی اور آگرہ کے بعد اتنی شاندار عمارتیں ہندستان کے کسی اور شہر میں موجود نہیں ہیں۔لکھنؤ کے نوابین شیعہ تھے۔انہوں نے معاشرہ میں بہت سی رسومات اور تقریبات کا اضافہ کیا،خود نواب بھی بڑے باذوق تھے۔واجد علی شاہ نے ایک خوبصورت پری خانہ اور چڑیا گھر تعمیر کرایا،لکھنؤ میں ہر شام علم وادب کی محفل آراستہ ہوتی تھی شعر و نغمہ کا دور شروع ہوتا تھا۔لکھنؤ کی شام ضرب المثل بن گئی تھی۔

جہاں تک علم وادب کی سرپرستی کا سوال ہے تو لکھنؤ کے نوابوں نے اپنے نامساعد حالات کے باوجود علم وادب کی بڑی سرپرستی کی، مرثیہ کا فن لکھنؤ میں ہی اپنے بام عروج کو پہنچا اور میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن کو اپنے اعلیٰ مقام تک پہنچایا۔

لکھنؤ کے دربار سے وابستہ دوسرے بڑے شعراء میں خاں آرزو،سودا،میر،مصحفی،جرأت،انشاء اور خواجہ حیدر علی آتش کے نام قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ بھی اردو کے متعدد شعراء کو ان درباروں سے فیض پہنچا۔دیا شنکر نسیم اور میر حسن نے اپنی بے مثال مثنویاں لکھنؤ میں رہ کر اور یہاں کے معاشرے کو سامنے رکھ کر لکھیں۔اسی طرح پنڈت رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کے نام ایک نثری کتاب لکھی جو اردو کے کلاسیکی ادب کا حصہ ہے،اور اس میں لکھنؤ کے زوال آمادہ معاشرہ کی تصویر کشی کی ہے۔لکھنؤ میں ہی مشہور نصاب تعلیم درس نظامی شروع ہوا اور لکھنؤ کے مضافات میں علم وادب کے متعدد مراکز اور متعدد عظیم شخصیات پیدا ہوئیں۔جنہوں نے علمی وادبی دنیا میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے اور نوابین اودھ کی قائم کردہ روایت ہنوز موجود ہے۔

20.8 رامپور

ریاست رامپور روہیلہ پٹھانوں کی طالع آزمائی کی داستان ہے۔ایک روہیلہ غلام داؤد خاں اپنے مالک کی وفات کے بعد افغانستان سے ہندستان آیا اور یہاں مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد اس کو 14 لاکھ کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا اور اس کے بعد اس نے لگاتار ترقی کی،کولری کے راجپوتوں کو ہرا کر اس نے اپنی فوجی عظمت کا بھی سکہ بٹھادیا،حتیٰ کہ آنولہ کا راجہ جو اس کا سرپرست تھا وہ بھی در پردہ اس کی مقبولیت سے ڈرنے لگا اور اس نے ایک مرتبہ موقعہ پا کر داؤد خاں کو قتل کرا دیا۔داؤد خاں کے متبنّیٰ علی محمد خاں نے راجہ پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیا اور خود نواب بن گیا۔اس میں داؤد خاں کے ایک قریبی حافظ رحمت خاں نے اس کی مدد کی،اس طرح روہیل کھنڈ کے علاقے میں ایک نئی طاقت کا ظہور ہوا۔

20.8.1 رامپور کے نواب

رامپور ریاست انگریزوں کی سرپرستی میں 1774 میں قائم ہوئی اور کم وبیش پونے دو سو سال تک قائم رہی۔اس ریاست میں بڑے دور آئے اور متعدد مرتبہ اس کا اختیار انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔تاہم اس میں درج ذیل نواب گزرے ہیں۔

1- نواب فیض اللہ خاں 1774-1793

2- محمد علی خاں بہادر 1793-1794

3- احمد علی خاں بہادر 1794-1840

4- محمد سعید خاں بہادر 1840-1855

5- یوسف علی خاں بہادر 1855-1865

6- کلب علی خاں بہادر 1865-1887

7- محمد مشتاق علی خاں بہادر 1887-1889

8- حامد علی خاں بہادر 1889-1930

9- رضا علی خاں بہادر 1930-1947 (وفات 1966)

20.8.2 ریاست کا قیام

ریاست رامپور روہیلہ قوت کی باقیات میں سے ہے۔ 1772 میں روہیل کھنڈ پر مراٹھوں نے حملہ کیا تھا۔ روہیلوں نے چالیس لاکھ روپیہ کے عوض نواب شجاع الدولہ سے مدد مانگی، لیکن بظاہر شجاع الدولہ نے وعدہ تو کیا لیکن مدد پوری طرح نہیں کی۔ اس سے ناراض ہو کر روہیلوں نے رقم دینے سے انکار کر دیا اور بعد میں بات اتنی بڑھی کہ 1774 میں جنگ کی نوبت آ گئی۔ نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں سے چالیس لاکھ روپیہ کے عوض مدد مانگی اور شاہ عالم کی اجازت سے روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔ چونکہ اس جنگ میں انگریز بھی شریک تھے اور انگریزوں کا طریق جنگ یہ رہا ہے کہ وہ جنگ سے پہلے ہی جنگ کا فیصلہ اپنے حق میں کرنے کے بعد جنگ میں شرکت کرتے تھے۔ پوری طرح سازشیں کی گئیں۔ روہیلہ سرداروں میں آپس میں نا اتفاقی پیدا کر دی۔ خود علی محمد خاں کو بھی جنگ سے الگ رہنے کے حالات پیدا کر دیے نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلے ہار گئے۔ حافظ رحمت خاں شہید ہو گئے اور روہیلوں کو اپنے وجود کی بقاء کے لئے شجاع الدولہ اور انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرنا پڑا، لال ڈانگ کے مقام پر معاہدہ ہوا جس کی رو سے روہیلوں کو بریلی جوان کا پایہ تخت تھا خالی کرنا پڑا اور ان کو رامپور کے مقام پر ریاست دی گئی اور یہ ریاست اودھ کے لئے کوئی خطرہ نہ بنے اس کے لئے یہ پابندی لگا دی کہ نواب رامپور پانچ ہزار سے زیادہ فوج رکھنے کا مجاز نہیں ہوگا اور رامپور کے نواب زادے لکھنؤ میں پرورش پائیں گے۔ اس طرح 31 اکتوبر 1774 کو ریاست رامپور وجود میں آئی اور نواب فیض اللہ خاں نے ایک پرانے گاؤں رامپور کے قریب، مصطفیٰ آباد کے نام سے ایک شہر بسایا اور وہاں سے حکومت کرنے لگے۔

20.8.3 ریاست رامپور کی تاریخ

ریاست رامپور انگریزوں اور شجاع الدولہ کے زیر سایہ قائم ہوئی۔ ایک طرف انگریزوں نے ریاست کی ہر سرگرمی پر نظر رکھی اور اسے معاہدات میں قید رکھا، دوسری اودھ کے نواب بھی طرح طرح سے ان کو پابند کرتے رہے، رامپور کے نوابزادوں کی پرورش لکھنؤ میں ہوتی تھی اس لئے یہ نوابین بتدریج سنی مذہب چھوڑ کر شیعہ مذہب میں شامل ہوتے گئے اور رامپور ایک شیعہ ریاست بن گئی۔ اس کے باوجود رامپور کے

نوابوں نے علمی، ادبی اور فنی ترقی کے لئے بہت کوشش کی۔ رامپور کے بیشتر نواب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انہوں نے عربی، فارسی اور اردو کا وسیع مطالعہ کیا تھا، خاص طور پر نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں نے شہر کی جامع مسجد تعمیر کروائی۔ نواب حامد علی خاں نے نہایت خوبصورت دربار ہال بنوایا اور قلعہ کے اندر ایک خوبصورت امام باڑہ بنوایا۔

1857 کی سعی انقلاب میں رامپور کے نوابوں نے برطانیہ کا ساتھ دیا اور متعدد جگہ محصور انگریزوں خاص طور پر خواتین اور بچوں کی بڑی مدد کی۔

20.8.4 علمی و ادبی ترقی

رامپور کا اصل کارنامہ رامپور کی علمی ادبی ترقی ہے۔ نواب فیض اللہ خاں نے اپنے دور میں ہی عربی، فارسی، ترکی اور مختلف زبانوں کے مخطوطات جمع کرنے شروع کر دیے تھے اور انہوں نے ایک شاندار لائبریری مرتب کی، رامپور کے تمام نوابین بتدریج ان کتابوں میں اضافہ کرتے رہے اور آخری نواب رضا علی خاں کے دور تک اس کتب خانے میں مخطوطات کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا کہ اس کے بعد جب یہ پبلک لائبریری بنی تو اس کا شمار دنیا کی چند لائبریریوں میں ہوتا ہے جہاں اتنی تعداد میں مخطوطات جمع ہیں۔

رامپور کی ادبی روایت بھی بہت شاندار رہی ہے۔ شروع سے ہی خود رامپور کے نوابوں کا ذوق ادبی تھا، ابتدائی دور کے نواب دہلی میں رہے وہاں کے ماحول میں اس کو اور جلا ملی، حکیم مومن خاں مومن اور مرزا غالب سے رشتۂ تلمذ بھی تھا۔ مرزا غالب کی امداد بھی کرتے تھے اور ان کو باضابطہ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر تھا، مرزا غالب اور نوابین رامپور کے مابین خطوط اردو ادب میں نثر کا عمدہ نمونہ ہیں۔

1857 میں دہلی دربار کے اجڑ جانے سے بہت سے شاعر، ادیب اور فنکار بے روز ہو گئے تھے۔ نواب رامپور نے بھی ان میں سے بہت لوگوں کو پناہ دی۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی، حیدر آباد جانے سے پہلے رامپور میں ہی رہے۔

رامپور اردو شاعری کا ایک باضابطہ دبستان ہے۔ اس کے نمائندہ شاعر نظام رامپوری ہیں۔ اس دبستان کو بوجوہ مطلوبہ شہرت نہ مل سکی لیکن اردو شاعری میں ایک نئے انداز کا رجحان پیدا کر گیا۔

رامپور میں مدرسہ عالیہ بھی ریاست کی شان تھی اور مدرسہ سے وابستہ بہت سے مشہور علماء تھے، خاص طور پر مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا عبدالسلام جیسے علماء وہاں سے وابستہ رہے اور مولانا محمد علی جوہر جیسے دریا یکتا کو رامپور کی خاک نے جنم دیا۔

20.9 خلاصہ

مغل سلطنت کی مرکزی قیادت میں کمزوری آئی تو ہندستان کے اندر مختلف مقامی اور خارجی قوتوں کا فروغ ہوا، مقامی قوتوں کے فروغ سے ملک میں طوائف الملو کی کی کیفیت پیدا ہوگئی اور اس کے نتیجہ میں متعدد ریاستیں وجود میں آئیں۔ ان میں چھ مسلم ریاستوں کا مطالعہ اور پیش کیا گیا۔ پہلی ریاست بھوپال تھی یہ ریاست مغل فوج کے ایک ملازم نواب یار محمد خاں کی ذاتی کاوشوں سے قائم ہوئی، وسط ہند کا علاقہ اس ریاست کا مرکز تھا۔ مراٹھوں سے طویل جنگوں کے بعد اس ریاست کے نوابوں نے انگریزوں سے مصالحت کر لی اور اس کے بعد انگریزوں کی سرپرستی میں یہ ریاست 1947 تک قائم رہی۔ اس ریاست میں کل 14 نواب ہوئے، جن میں چار خواتین نواب بھی شامل ہیں، اس ریاست کی

وجہ سے وسط ہند کے علاقوں میں بڑی ترقی ہوئی، نئے شہر بسائے گئے، خوبصورت عمارتوں کی تعمیر نے اس علاقے کو رونق بخشی، مدرسہ قائم ہوئے جن کے ذریعہ لوگوں کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا گیا۔اور یہاں کی خواتین نوابوں نے عورتوں کی تعلیم اور ترقی کے لئے خصوصی کام کیے۔

دوسری ریاست جس کا اوپر مطالعہ پیش کیا گیا وہ حیدرآباد ہے۔ یہ ریاست مغل دربار کے وزیر اعظم آصف جاہ اول نے قائم کی، مغل دربار کی سازشوں سے تنگ آ کر وہ حیدرآباد چلے گئے ابتداً صوبے دار تھے پھر خودمختار ہو گئے، ریاست حیدرآباد اپنے وقت میں جنوب ہند کی سب سے بڑی ریاست تھی آصف جاہ اول کے بعد اس ریاست میں جانشینی کو لے کر آپس میں جنگ ہوئی۔اس کی وجہ سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو اس میں مداخلت کا موقعہ مل گیا اور آخر انگریز غالب آئے اور انہوں نے ریاست حیدرآباد کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔حیدرآباد نے ٹیپو سلطان کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔اس طرح انگریزوں کے ساتھ دوستانہ روابط استوار کر کے اس ریاست نے اپنا وجود یقینی بنا لیا بعد میں انگریزوں کی مداخلت سے ہی جانشینی کے اختلافات بھی ختم ہو گئے۔

ریاست حیدرآباد کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں علمی اور ادبی ترقی بہت ہوئی۔متعدد بڑے علماء اور دانشور اس ریاست سے وابستہ رہے۔جامعہ عثمانیہ اور دائرۃ المعارف جیسے پائیدار اہمیت اور دوررس اثرات کے حامل ادارے قائم ہوئے اردو زبان کو بڑی ترقی ملی۔1948 میں یہ ریاست بھی انڈین یونین کا حصہ بن گئی۔

تیسری ریاست میسور ہے۔یہ ایک عام آدمی کی طالع آزمائی کی داستان ہے۔حیدرعلی ایک معمولی سپاہی سے ترقی کر کے نواب بنے اور انہوں نے اتنی طاقت ورفوج منظم کی کہ برطانوی افواج کو متعدد مرتبہ شکست دی اور یہ ثابت کر دیا کہ برطانوی اقتدار کا راز ان کی تکنیکی ترقی میں نہیں اور نہ ہی علوم وفنون میں برتری کی وجہ سے ہے ان چیزوں میں وہ برابر ہیں ان کے پاس اصل قوت کا سرچشمہ سازشیں ہیں اگر ان کی سازشوں سے بچا سکے تو ان کو شکست دینا مشکل نہیں۔حیدرعلی کے بعد ٹیپو سلطان نواب بنے تقریباً دس سال اسی شان سے حکومت کی، بعد میں مراٹھوں اور نظام حیدرآباد اور انگریزوں کی متحدہ قوت سے شکست کھائی اور پھر اپنوں کی سازش کا شکار ہو گئے۔ 1799 میں شہید ہو گئے۔ٹیپو سلطان نے سرنگاپٹم میں ہندستان کی پہلی یونیورسٹی جوامع العلوم کے نام سے قائم کی تھی۔انہوں نے انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کے ترجمہ کے لئے ایک مرکز بھی قائم کیا تھا اور خود بھی ایک بڑا کتب خانہ ترتیب دیا تھا۔

چوتھی ریاست ٹونک ہے۔یہ ریاست ایک کسان کے بیٹے کے عزم وحوصلہ کی داستان ہے۔یہ نوجوان بیس سال سے کم عمری میں طالع آزمائی کے لئے نکلا اور آخر ایک ریاست کا بانی بنا۔نواب محمد امیر خاں اس کے بانی ہیں۔انہوں نے شمالی ہندستان میں اپنی غیر معمولی جنگی مہارت کے جوہر دکھائے۔آخر انگریزوں نے ان سے معاہدہ کر کے ان کو ٹونک اور سرونج کا نواب تسلیم کر لیا۔ان کے اخلاف بڑے علم دوست اور علماء نواز تھے، انہوں نے علم ودانش کی بڑی خدمت کی، ایک بڑا کتب خانہ بنایا۔متعدد علماء کو ملازم رکھا۔شرعی احکام کے مطابق عدالتی فیصلے کرنے کا اہتمام کیا اور ایک دورافتادہ مقام ٹونک کو شہرت دے کر مشہور مقامات میں شامل کر دیا۔

پانچویں ریاست اودھ ہے۔یہ دراصل مغل عہد کی ریاست ہے۔ایک مغل سردار سعادت خاں برہان الملک نے اس کو قائم کیا۔بعد میں انگریزوں کو اس میں مداخلت میں موقعہ مل گیا اور ان کی ریشہ دوانیوں سے ریاست کی تعمیر وترقی بتدریج محدود ہوتی گئی، نوابوں کی حیثیت کٹھ پتلی رہ گئی اور لارڈ ڈلہوزی نے 1856 میں وہ حیثیت بھی ختم کر دی۔

ریاست اودھ نے دوشہر تعمیر کیے، فیض آباد اور لکھنؤ۔ان کے علاوہ کانپور کو بڑی ترقی دی اس کے علاوہ اس ریاست میں شعر و شاعری کو بڑی ترقی ملی ۔اردو میں متعدد نامور شعراء اس خاک سے وابستہ رہے اور اردو کی بعض اصناف کو اس ریاست میں ترقی کا بام عروج ملا۔

چھٹی ریاست رامپور ہے۔یہ داستان ہے ایک افغانی مہاجر داؤد خاں کی اس نے اپنی قابلیت سے روہیل کھنڈ میں بڑا مقام پیدا کیا اور اس کے جانشین نواب علی محمد نے باضابطہ ریاست قائم کر لی۔حافظ رحمت خاں جیسا بہادر اس کے محافظوں میں سے تھا۔بعد میں اودھ کے نواب شجاع الدولہ نے انگریزوں کی مدد سے روہیل کھنڈ پر حملہ کر دیا۔روہیلوں کو شکست ہوئی ،اس کے بعد معاہدہ کی رو سے ریاست رامپور قائم ہوئی ۔ریاست رامپور میں علمی و ادبی ترقی بہت ہوئی۔متعدد شعراء اور عالم اس ریاست سے وابستہ رہے۔مرزا غالب کی بھی سرپرستی کی گئی۔ایک عظیم الشان مدرسہ اور ایک بڑا کتب خانہ قائم کیا گیا۔1947 میں یہ ریاست بھی انڈین یونین میں ضم ہوگئی۔

20.10 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالوں کے جواب تیس سطروں میں دیجئے۔

1- ریاست اودھ کے قیام اور عروج و زوال پر نوٹ لکھئے۔

2- ریاست میسور کی مختصر تاریخ بیان کیجئے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجئے۔

1- ریاست حیدرآباد کی علمی و ادبی ترقی پر مضمون لکھئے۔

2- بیگمات بھوپال کی خدمات پر نوٹ لکھئے۔

3- ریاست رامپور کے قیام کا پس منظر بیان کیجئے۔

4- ریاست ٹونک پر ایک نوٹ لکھئے۔

20.11 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1. سلطنت خداداد — محمود خاں بنگلوری

2. تاریخ ریاست ٹونک — ہنومان سنگھ

3. اخبار الصنادید — نجم الغنی خاں رامپوری

4. دائرۃ المعارف الاسلامیہ — متعلقہ ابواب

اکائی 21 : جنگ آزادی اور مسلمانوں کا کردار

اکائی کے اجزاء

21.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلباء کو یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں نے جنگ آزادی میں کیا قربانیاں دیں اور یہ کہ مسلمان اول دن سے جنگ آزادی میں شریک رہے۔ انہوں نے ہر موقع پر برادران وطن کے شانہ بشانہ ملک کو غلامی سے آزاد کرانے کے لئے بے شمار قربانیاں دیں اور چند اہم مسلم مجاہدین آزادی کا تعارف بھی شامل ہے۔

21.2 تمہید

ہندوستان کی جنگ آزادی کسی ایک مذہب کے ماننے والوں یا کسی ایک جماعت کی جدوجہد نہیں تھی ۔ بلکہ اس جنگ میں بلالحاظ مذہب وملت ہندستان کے سبھی طبقات نے حصہ لیا تھا اور نہایت خلوص اور لگن کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوئے ۔ جنگ آزادی ہندستانیوں کے لئے ایک تربیت گاہ تھی ملک کو آزاد کرانے کی لگن نے یہاں کے لوگوں کی مخفی صلاحیتوں کو بیدار کیا اور ایسا لگتا ہے جیسے ہیروز کی ایک نرسری کھل گئی ہو۔ ہر مذہب میں اعلیٰ درجہ کے رہنما پیدا ہوئے ۔

21.3 1857 سے قبل

جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں بھی نا قابل فراموش ہیں ۔اول دن سے مسلمان اس جدوجہد میں شریک رہے بلکہ مسلمانوں نے اس کی قیادت کی ۔ اگر جنگ آزادی کا آغاز مانا جائے تو پلاسی کی جنگ سے ہوتا ہے جب انگریزوں نے بنگال کے نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کرلیا تھا ۔ پلاسی کے میدان میں شکست کے بعد عام ہندستانیوں نے بھی یہ محسوس کرلیا تھا کہ اب ہندستان غلامی کی طرف گامزن ہے، ان حالات کو دیکھتے ہوئے سب سے پہلے مداری صوفیہ نے جنگ آزادی کا اعلان کیا ۔ 1763 میں ڈھاکا سے اس تحریک کا آغاز ہوا اور بنگال کے بیشتر حصوں میں پھیل گئی ۔اس تحریک کی قیادت مجنوں شاہ مستانہ نے کی اور تقریباً بیس سال تک یہ لوگ لڑتے رہے، وارن ہسٹنگز نے اس تحریک کو سختی سے کچل دیا، مجنوں شاہ مستانہ اور ان کے کئی ساتھی مداری شاہ وغیرہ مارے گئے ۔

مداری صوفیہ کی تحریک کے ساتھ پہلے کسان بھی شامل ہوگئے تھے ۔اس لئے اس تحریک کو کسانی وِدروہ بھی کہا جاتا ہے اور سنیاسیوں کی بغاوت بھی کہا جاتا ہے ۔ تاریخی طور پر یہ پہلی جنگ آزادی تھی جس کی قیادت مسلمانوں نے کی تھی ۔

آزادی کی جنگ میں دوسرا بڑا نام سلطان حیدرعلی اور ٹیپوسلطان کا ہے ان دونوں باپ بیٹوں نے انگریزوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور کم وبیش بیس سال تک مقابلہ کرتے رہے ۔ آخر 1799 میں ٹیپوسلطان شہید ہوگئے ، انگریز کمانڈر نے ٹیپوسلطان کی نعش پر کھڑے ہوکر کہا تھا کہ آج سے ہندستان ہمارا ہے ۔

ٹیپوسلطان کی شہادت نے انگریزوں کے لئے ہندستان پر اقتدار کے دروازے کھول دیے تھے، لیکن ابھی ان کو کافی سخت مقابلہ کرنا باقی تھا ۔ میرٹھ چھاؤنی میں چربی کے کارتوسوں پر جو ہنگامے ہوئے ان میں بڑی تعداد میں مسلمان فوجیوں کو بھی سزا دی گئی اور بہت سوں کو قتل کردیا، 10 مئی کو وہاں ہنگامہ ہوجانے کے بعد ان لوگوں نے دہلی کا رخ کیا اور بہادر شاہ ظفر کو اپنا قائد مقرر کیا ۔ان کی قیادت میں آزادی کی پہلی جنگ لڑی گئی ۔اس جنگ میں سب سے اہم کردار مسلمانوں نے ہی ادا کیا تھا ۔بعض ہندو حضرات نے مختلف مقامات پر جنگ آزادی کی قیادت کی ۔ان کے ساتھ بھی بہت سے مسلمان شریک تھے ۔رانی لکشمی بائی کا توپ خانہ مسلمانوں کے پاس تھا اور ان کے ساتھ ان کی ایک خاص سہیلی بھی مسلمان تھیں جو ان کے ساتھ ہی ماری گئیں ۔

21.4 1857 کی سعی انقلاب

1857 کی سعی انقلاب میں مسلم علماء نے بھی اہم کردار ادا کیا۔خاص طور پر حضرت شاہ عبدالعزیز کے ایک فتویٰ نے جوانہوں نے اس سے قبل دیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد ضروری ہے اور اس دور میں بھی بعض علماء نے ایسے فتاویٰ دیے۔ان فتاویٰ نے اس تحریک کو عوامی بنا دیا تھا۔مسلم عوام اپنا مذہبی فریضہ سمجھ کر اس تحریک میں شریک ہوئے اور بڑی سرفروشی کے ساتھ خاک وطن کو آزاد کرانے میں اپنی جانوں کی قربانی دی۔دیگر علماء میں مولوی فضل حق خیر آبادی اور مولانا سرفراز کے فتاویٰ جہاد خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور ان کے خاص رفیق کار مولانا محمد قاسم نانوتوی،مولانا رشید احمد گنگوہی اور حافظ ضامن شہید نے تو باضابطہ انگریزوں کا مقابلہ کیا اور شاملی کے میدان میں باضابطہ جہاد کیا۔لکھنؤ میں بیگم حضرت محل نے اپنے بیٹے برجیس قدر کو تخت نشین کر کے لکھنؤ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا لیکن انگریزی فوج سے شکست کھائی اور مجبوراً نیپال میں پناہ لینی پڑی۔

ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں شریک ہونے والوں کے سامنے ایک دوسرے عظیم ہندستان کا خواب تھا جو ہندستان کو روایتی بادشاہت سے نکال کر عوامی حکمرانی کے دور میں داخل کرتا اور ملک غلامی کے کلنک سے بھی بچا رہتا۔بہادر شاہ ظفر نے مختلف ریاستوں کو جو خطوط لکھے تھے ان خطوط سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی بادشاہت کے لئے نہیں بلکہ ہندستان کی آزادی کے لئے جنگ آزادی کر رہے تھے۔ان کا ایک خط اس طرح ہے:

’’میری دلی خواہش ہے کہ ہر قیمت پر ہندستان سے فرنگیوں کو نکال باہر کیا جائے اور میری دلی خواہش یہی ہے کہ پورا ہندستان آزاد ہوجائے،لیکن یہ انقلابی جنگ جو اس مقصد سے لڑی جارہی ہے اس وقت تک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکتی جب تک کہ کوئی اہل شخص پوری تحریک کی قیادت نہ کرے اور قوم کے مختلف فرقوں کو اتحاد کی تسبیح میں نہ پرو دے۔میری خواہش ہندستان پر حکمرانی کرنے کی نہیں اور انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی میری کوئی تمنا ہندستان پر حکمراں رہنے کی نہیں ہے۔اگر آپ تمام دیسی راجہ دشمن کو نکال باہر کرنے کی غرض سے اپنی تلوار کو بے نیام کرلیں تو میں اپنے تمام شاہی اختیارات کو ان دیسی راجاؤں کو منتقل کرنے کے لئے تیار ہوں جنہیں حکمرانی کے لئے منتخب کیا جائے۔‘‘

بہادر شاہ ظفر کا یہ خواب ادھورا رہا اور ان کے ویژن کا ہندستان تعمیر نہ ہوسکا۔متعدد دیسی ریاستوں نے نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ نہیں دیا بلکہ ان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا اور دراصل مقامی راجاؤں نے ہی انگریزوں کی مدد کی تھی۔جس کے نتیجے انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔بہادر شاہ ظفر نے ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی اور وہاں سے گرفتار ہوگئے۔انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کو قتل نہیں کیا لیکن بڑی تعداد میں شہزادوں کو گولی ماردی اور بہادر شاہ پر مقدمہ دائر کر کے ان کو رنگون کی جلاوطنی کی سزادی۔

دہلی پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا،ہزاروں کی تعداد میں مسلمان قتل کئے گئے،پھانسیاں دی گئیں اور کالے پانی کی سزادی گئی۔مولانا فضل حق خیرآبادی،مفتی عنایت علی کاکوروی،مفتی مظہر کریم دریابادی،مولانا یحییٰ علی،مولانا احمداللہ اور

مولانا محمد جعفر تھانیسری کو کالے پانی کی سزا دی گئی، جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے نوابوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں۔ امام بخش صہبائی، میر پنجہ کش جیسے نامور علماء اور فن کاروں کو قتل کر دیا گیا۔ بقول مرزا غالب دہلی کے چوک مقتل یعنی قتل کرنے کی جگہ بن گئے تھے اور گھر قید خانے بن گئے تھے۔ انتقام کی یہ آگ دہلی کے باہر، کانپور، میرٹھ، مظفر نگر، مرادآباد، لکھنؤ، گڑگاؤں، میوات اور ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی جس میں ہزاروں لوگوں کو قتل کیا گیا۔

انگریزوں نے انسانوں کے قتل اور سزا دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کی املاک اور مذہبی مقامات کی بے حرمتی میں بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی، دہلی کی متعدد عمارتوں کو منہدم کر دیا گیا۔ دہلی کی شاہی جامع مسجد کو فوجی بارک بنا دیا۔ فتحپوری کی مسجد کو نیلام کر کے گودام بنا دیا۔ اکبرآبادی مسجد کو شہید کر کے اس کی جگہ پارک بنا دیا، زینت المساجد میں فوجی رہنے لگے، نواب حامد علی خاں کی مسجد میں جانور باندھنے لگے، انگریزوں کا یہ قہر دہلی کے باہر بھی مسلمانوں پر جاری رہا، پٹنہ میں علماء صادق پور کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں اور ان کے محلات کو مسمار کر کے ان کو کھیت بنا دیا، مرادآباد اور بجنور کے متعدد شرفاء کے خانوادوں کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں، بدایوں میں متعدد علماء کو پھانسی دی اور ان کی جائدادیں ضبط کر لیں۔

1857 کی ناکامی نے ہندستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، ان کی ہزار سالہ خدمات اور ملک کے لئے ان کی قربانیاں داؤں پر لگ گئیں، انگریزوں نے ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کے لئے مسلم عہد کے مظالم کی فرضی داستاں پھیلانی شروع کی اور ہندوؤں میں ایسے لوگوں کو فروغ دیا جو ہندو مسلم منافرت کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ ان مشکل حالات میں مسلمانوں کے لئے جنگ آزادی کو میدان جنگ میں باقی رکھنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے انہوں نے اپنی حکمت عملی تبدیل کی اور آزادی کی جنگ کے لئے دوسرے راستہ اختیار کئے۔

21.5 فرائضی تحریک

آزادی کی ایک نئی حکمت عملی کا آغاز بنگال میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ جہاں مولوی شریعت اللہ نے انگریزوں کے خلاف سماجی سطح پر محاذ کھول رکھا تھا، انہوں نے انگریزوں کا بائیکاٹ کیا۔ ان کی مصنوعات حتیٰ کہ ان کی عدالتوں کا بھی بائیکاٹ کیا اور فیصلوں کے لئے پنچایتوں کے نظام کو مضبوط کیا، تاکہ لوگوں کے باہمی مسائل کو گفت وشنید کے ذریعہ حل کیا جا سکے اور لوگوں کو فوری انصاف مل سکے، مولوی شریعت اللہ (1781-1840) بلا لحاظ مذہب ہندو مسلم سب کے لیڈر تھے۔ انہوں نے انگریزوں کو ٹیکس نہ دینے کی بھی تحریک چلائی۔ انہوں نے مقامی زمینداروں کو بھی منظم کیا۔ زمین کی اصلاحات کیں اور ناقابل کاشت زمینوں کو قابل کاشت بنایا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے دودومیاں تو تو میر نے اس تحریک کو جاری رکھا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اس تحریک کو طاقت کے ذریعہ کچلنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی رہے۔

21.6 دارالعلوم دیوبند

تحریک آزادی کے لئے نئے میدان تلاش کرنے کی جدوجہد شاملی کے مجاہدین کو مدارس کے قیام کی طرف لے گئی، مولانا محمد قاسم

نانوتوی نے دیوبند میں ایک دینی تعلیم کا مرکز قائم کیا جس کو حکومت کی ہر طرح کی مداخلت سے پاک رکھا۔ یہ مدرسہ مسلمانوں کے چندے سے چلتا تھا اور اس میں قوم پرست ہندوؤں کے عطیات بھی قبول کئے جاتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کم از کم مسلمانوں کا تعلیمی نظام استعماری قوتوں کی دست و برد سے بچا رہے تا کہ تحریک آزادی کو زندہ رکھنے کے لئے لوگ موجود رہیں۔ دارالعلوم دیوبند نے سماجی سطح پر مسلمانوں کے اندر بیداری پیدا کی اور آزادی کی شمع کو بھی جلائے رکھا۔ مولانا قاسم نانوتوی کے شاگردوں نے مختلف تحریکات کی شکل میں آزادی کی چنگاری کو باقی رکھا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام پوری طرح جنگ آزادی سے جڑا ہوا تھا۔ اس کا اقرار شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اپنے خطبہ صدارت میں کیا جو انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے وقت دیا تھا، ایک اور دانشور پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مسلمانوں کی مذہبی، سماجی اور سیاسی زندگی کو جائز طور پر ان اغراض و مقاصد کی روشنی میں واضح کیا جا سکتا ہے جو ایام جنگ میں دارالعلوم کے بانیوں کے ذہنوں میں تھے۔ دراصل شاملی اور دیوبند ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ البتہ فرق صرف ان کے اسلحہ جات میں ہے۔ اب تلوار اور بھالے کی جگہ قلم اور زبان نے لے لی تھی، شاملی میں مذہبی اور سیاسی آزادی کے تشدد کا سہارا لیا گیا تھا۔ لیکن دیوبند میں اس حصول کی خاطر پرامن ذرائع پر اصرار کیا گیا۔ شاملی میں مذہبی اور سیاسی آزادی کے حصول کی خاطر افراد کو استعمال کیا گیا تھا جبکہ دیوبند میں افراد تیار کرنے کے لئے مقصد کو فوقیت دی گئی۔''

مولانا کے ایک شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن نے ریشمی رومال تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے اندر علماء کی ایک بڑی تعداد انگریزوں کی مخالفت کرے اور بیرونی طور پر افغانستان اور ترکی کی مدد سے انگریزوں کا اقتدار ختم کر دیا جائے۔ یہ تحریک جب اپنے شباب پر پہنچی تو کسی عملی اقدام سے پہلے ہی اس کا راز طشت از بام ہو گیا اور اس کے متعدد رہنما گرفتار کر لئے گئے اور ان کو جلاوطن کر کے مالٹا میں قید کر دیا اور ہندوستان میں اس تحریک کو سختی سے کچل دیا گیا۔

دیوبند کے ہی ایک فرزند رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے الاحرار کے نام سے ایک جمعیت قائم کی اس کا مقصد بھی یہ تھا کہ ہندوستان انگریزوں سے اقتدار سے آزاد کرایا جائے۔ اس تحریک نے پنجاب میں خاص طور پر آزادی کا بگل بجایا۔

دیوبند کے ہی ایک اور فرزند مولانا عبیداللہ سندھی افغانستان گئے اور وہاں ہندستان کی عبوری حکومت قائم کی گئی جس کے صدر راجہ مہندر پرتاپ اور وزیر اعظم برکت اللہ بھوپالی اور وزیر داخلہ مولانا عبیداللہ سندھی کو بنایا گیا، یہ آزاد ہندستان کی جدو جہد میں پہلی خود مختار حکومت تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ بیرونی طاقتوں کی مدد سے ہندستان سے انگریزوں کا سامراج ختم کیا جائے۔ لیکن جنگ عظیم کے آغاز نے اس تحریک کو ختم کر دیا۔

1919 میں مولانا محمود حسن کو خرابی صحت کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔ مولانا ہندستان تشریف لائے 1921 میں تحریک عدم تعاون شروع ہوئی۔ اس موقعہ پر ایک قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا اور اس کا سنگ بنیاد شیخ الہند نے رکھا اور ایک نہایت فکر انگیز خطبہ بھی پیش کیا جس میں اپنے اکابر کی خدمات کی طرف توجہ دلائی اور دارالعلوم کا مقصد اساسی انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کو قرار دیا۔

21.7 کانگریس اور مسلمان

کانگریس میں شروع سے ہی مسلمان شریک رہے اور اول درجے کے رہنماؤں کے طور پر شریک رہے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں بھی متعدد بڑے مسلمان شریک تھے۔ ان میں مسلم تاجر، صافی اور وکیل شریک تھے۔ اس موقعہ پر دادا بھائی نوروجی کانگریس کے صدر جلسہ تھے۔ ان کی صدارت کی تائید نواب رضا علی خاں نے کی اور اپنی تائیدی تقریر میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور ان کوششوں کی مذمت کی جو اس اتحاد کو ختم کرنے کی بات کر رہے تھے۔

کانگریس کے ایک رہنما بدرالدین طیب جی نے تو کانگریس کی حمایت کو اپنا زندگی کا مقصد بنالیا اور وہ جگہ جگہ جا کر لوگوں کو کانگریس کی حمایت پر آمادہ کرتے تھے۔ 1896 میں کانگریس کے اجلاس کی صدارت رحمت اللہ سیانی نے کی۔ اس سے پہلے 1888 میں پنجاب کے علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ ملک کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے کانگریس کی مدد مذہبی فریضہ ہے، دیگر مختلف علاقوں کے علماء نے بھی اس کی تائید میں فتویٰ دیے اور ان تمام فتاویٰ کو بعد میں کتابی صورت میں شائع کر دیا۔ اس کا نام ''نصرۃ الابرار'' تھا۔ 1905 میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کیا۔ اس سے زیادہ فائدہ خود مسلمانوں کا تھا لیکن انہوں نے قومی مفاد کو سامنے رکھ کر اس کی شدید مخالفت کی، بیرسٹر عبدالرسول، لیاقت حسین، عبدالحلیم غزنوی یوسف اور چودھری محمد اسماعیل اس مخالفت میں سرفہرست تھے۔

بعد میں کانگریس کے بڑے رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد سامنے آئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا نصب العین متحدہ ہندستان کی آزادی کو قرار دیا۔ وہ متعدد مرتبہ کانگریس کے صدر بھی رہے، ان کے علاوہ مولانا فضل الحسن حسرت موہانی، ڈاکٹر رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر مختار انصاری، مولانا حسین احمد مدنی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید ملیح آبادی اور متعدد قومی اور علاقائی قائدین نے ملک کی آزادی کے لئے کانگریس کے پہلو بہ پہلو قربانیاں دیں۔

جمعیۃ علماء ہند نے اول دن سے کانگریس کی حمایت کی، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے اپنی جمعیت کے ساتھ کانگریس کی حمایت کی، حکیم اجمل خاں اپنے عہد کی عظیم شخصیت تھے، دہلی میں ان کا زبردست اثر تھا۔ ستیہ گرہ کا آغاز ہوا تو اس کی صدارت کے لئے حکیم اجمل خاں کا نام ہی سامنے آیا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔

21.8 جمعیۃ علماء ہند

مولانا حسین احمد مدنی اور اس وقت سے دیگر رہنماؤں نے جنگ آزادی کے لئے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے جمعیۃ علماء ہند قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو متحد کر کے جنگ آزادی میں شریک کیا جائے۔ اس کے لئے جمعیۃ نے کانگریس کی حمایت کی۔ جمعیۃ علماء ہند نے آزادی کی تحریک میں نمایاں کردار کیا۔ اس جمعیۃ کے اسٹیج سے متعدد بڑے قومی رہنما پیدا ہوئے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا احمد سعید دہلوی، مفتی کفایت اللہ، مولانا محمد ابراہیم الوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی اور دیگر علماء اس سے وابستہ رہے، اس کے ترجمان ''الجمعیۃ'' نے بھی ملک کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

21.9 تحریک خلافت

1920 میں ہی ترکی شکست کے بعد انگریزوں نے اسلامی خلافت کو ختم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ مسلمانوں کا ایک جذباتی مسئلہ تھا اس لئے ہندستان کے مسلمانوں نے بھی خلافت کی بقاء کے لئے آواز اٹھائی۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد اس سطح پر تھا کہ ہندوستان کے ہندو و مسلمان دونوں نے خلافت اسلامی کے بقاء کے جدو جہد کی اور مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں تحریک خلافت شروع ہوئی۔ یہ تحریک بھی دراصل انگریزوں کے خلاف تھی، اس تحریک میں مہاتما گاندھی نے بھی اور متعدد ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں میں حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار انصاری ڈاکٹر سیف الدین کچلو جیسے رہنماؤں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ تحریک خلافت کے دوران جس ہندو مسلم اتحاد کا مظاہرہ ہوا اس نے انگریز حکومت کے اوسان خطا کردیے اور وہ مزید شدت کے ساتھ اس کوشش میں لگ گئے کہ ہندو مسلم اتحاد ختم ہو جائے چونکہ ہندستان میں انگریز حکومت کے قیام کا انحصار اسی پر تھا۔

21.10 1920 کے بعد

دسمبر 1921 میں مولانا حسرت موہانی نے ہندستان کی مکمل آزادی کو کانگریس کا نصب العین قرار دیا۔ اگر چہ اس وقت مہاتما گاندھی کی مداخلت سے یہ قرارداد منظور نہ ہو سکی۔ لیکن اس نے کانگریس کے اندر اس تحریک کے حامی پیدا کردیے اور آخر 1927 میں ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں کانگریس نے اس قرارداد کو منظور کرلیا اور اس کے بعد کانگریس میں ملک کی مکمل آزادی کے لئے جدو جہد کرنے لگی۔

1930 میں 26 جنوری کو علامتی طور پر یوم آزادی منایا اور اس کے بعد ہر سال 26 جنوری کو اسی طرح علامتی طور پر یوم آزادی منایا جاتا رہا۔ بے شمار مسلمانوں نے اس میں اپنی جانوں کی قربانیاں دیں۔ سائمن کمیشن اور رولٹ ایکٹ آیا تو مسلمانوں نے ان کی مخالفت میں ہندو بھائیوں کے شانہ بشانہ قربانیاں دیں اور جب آزاد ہند فوج قائم ہوئی تو اس میں بھی بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے۔ اس فوج کے بڑے جرنلوں میں ایک جرنل شاہنواز بھی تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد شروع سے ہی ملک کی آزادی کے لئے جدو جہد کرتے رہے۔ الہلال کے ذریعہ انہوں نے قوم کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑ دیا اور بعد میں کانگریس میں شمولیت اختیار کر کے قومی سیاست میں سرگرم حصہ لیا۔ متعدد مرتبہ کانگریس کے صدر بھی رہے۔ کئی بار جیل گئے، انہوں نے اپنے قلم کی طاقت کو اور اپنی بہترین صلاحیتوں کو ملک کی آزادی کے لئے وقف کردیا۔ مولانا وہ واحد عظیم شخصیت تھے جن کے پاس متحدہ ہندستان کا عظیم وژن تھا اور ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علمبردار تھے۔ وہ ملک کی تقسیم کو ہندستان ہی نہیں دنیائے انسانیت کے لئے ایک عظیم خسارہ سمجھتے تھے۔ مولانا نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

''آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں میں سے اتر آئے اور دہلی کی قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے کہ سوراج چوبیس گھنٹوں کے اندر مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جاؤ تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہوگا اور اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہوگا۔''

مسلم رہنماؤں نے اس مثبت فکر، ہندو مسلم اتحاد اور مادر وطن کی محبت میں جنگ آزادی کے اندر حصہ لیا تھا۔نواب سراج الدولہ کے عہد سے لے کر ملک کی آزادی تک لاکھوں لوگوں نے بے انتہا قربانی دی،قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں،جلاوطنی کی سزا بھی اٹھائی اور ایک بڑی تعداد کو پھانسی دی گئی ان بے شمار قربانیوں کا نتیجہ تھا کہ ملک آزاد ہوا، پورے جنگ آزادی میں مسلمان ہندوؤں کے شانہ بشانہ رہے بلکہ تحریک آزادی کے اصل قائد اور محرک مسلمان ہی تھے۔مسلمانوں نے تمام ہندو لیڈروں کے ساتھ بھی جنگ آزادی میں شرکت کی اور انفرادی طور پر مسلم رہنماؤں نے بھی تحریکات چلائی۔ملک کی مکمل آزادی کا مطالبہ سب سے پہلے مسلمانوں نے کیا۔مولانا محمد علی جوہر نے تو لندن میں یہ اعلان کیا کہ میں غلام ہندستان میں واپس نہیں جاؤں گا یا تو مجھے آزادی دو یا پھر دو گز زمین دو اور آخر اس مرد مجاہد کو غلام ہندستان میں واپس آنا نصیب نہیں ہوا،لندن ہی میں ان کی وفات ہوگئی وار قبلہ اول کے جوار میں مدفون کیے گئے۔

21.11 جنگ آزادی کے نامور مسلم رہنما

بہادر شاہ ظفر

بہادر شاہ ظفر آخری مغل حکمراں تھے، ذاتی طور پر نہایت متقی اور پرہیز گار تھے،بہترین خطاط تھے،اچھے شاعر تھے،اپنے والد اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد بادشاہ بنے۔1857 کی جنگ آزادی ان کی قیادت میں لڑی گئی تھی۔جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہمایوں کے مقبرہ سے گرفتار کیے گئے۔انگریزوں نے ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ اور اہانت آمیز سلوک کیا۔کئی وقت کے فاقے کے بعد ان کے سامنے ان کے بیٹوں کے سر دسترخواں سے ڈھک کر پیش کیے گئے تھے۔ان کے اوپر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا اور ان کو رنگون جلاوطن کر دیا جہاں وہ انتہائی کسمپرسی کے عالم میں فوت ہو گئے۔

بیگم حضرت محل

واجد علی شاہ کی اہلیہ تھیں،اصل وطن فیض آباد تھا، 1857 کی سعی انقلاب میں اپنے بیٹے برجیس قدر کو اودھ میں تخت نشین کرایا اور جنگ آزادی میں شریک ہوگئیں۔ایک سال تک لکھنؤ میں انگریزوں کا مقابلہ کیا اس کے بعد سات سال تک نیپال کو مرکز بنا کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔آخر کار ان کو شکست ہوئی اور 1879 میں نیپال میں ان کی وفات ہوگئی۔نہایت بہادر اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔

مولوی احمد اللہ شاہ

مولوی احمد اللہ شاہ بڑے عالم فاضل اور درویش صفت انسان تھے انہوں نے انگلستان اور دوسرے ممالک کا سفر بھی کیا تھا۔انہوں نے انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روکنے کے لئے جمعیۃ العلماء کے نام سے ایک جمعیۃ بنائی تھی اور 1857 سے قبل آگرہ،لکھنؤ اور فیض آباد میں لوگوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ کے لئے آمادہ کرتے رہے۔آخر گرفتار ہو گئے اور ان کو موت کی سزا سنائی گئی۔اسی درمیان جنگ آزادی شروع ہوگئی۔مجاہدین نے جیل پر حملہ کر کے ان کو رہا کرالیا اور ان کی قیادت میں جنگ جاری رکھی۔ایک سال تک انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے بعد 1858 میں شاہ جہاں پور میں انگریز فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔

بی اماں

علی برادران کی والدہ، اصل نام آبادی بیگم تھا، اپنے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ آزادی کا زبردست جذبہ تھا، خلافت تحریک میں جان و مال اور خاندان کے ساتھ شریک ہوئیں۔ مسز اینی بیسینٹ کی رہائی کے لئے چندہ جمع کیا۔ 1917 کے کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں زبردست تقریر کی۔ انہوں نے ملک کے طول وعرض میں متعدد مقامات پر تقریریں کیں لوگوں کو آزادی کا سبق سکھایا اور قومی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق سے رہنے کی تلقین کی۔ 1924 میں وفات پائی۔

مولانا عبیداللہ سندھی

سیالکوٹ کے ایک سکھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کسی عالم کی تلقین سے اسلام قبول کیا، دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور اپنے استاد مولانا محمود حسن کے ساتھ تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔ تحریک ریشمی رومال کے اہم رکن تھے، ریشمی رومال لے کر کابل گئے تھے۔ ریشمی رومال کی تحریک کے ختم ہوجانے کے بعد افغانستان میں مقیم ہوگئے اور وہاں ہندستان کی پہلی جلاوطن کے قیام میں شریک رہے۔ کئی ملکوں کا دورہ کیا اور ہندستان کی آزادی کے لئے رائے عامہ ہموار کی، آزادی سے کچھ قبل جامعہ ملیہ اسلامیہ آگئے اور تعلیم و تعلم سے وابستہ ہوگئے۔ 1974 میں وفات پائی۔

مولانا حسین احمد مدنی

دارالعلوم دیوبند سے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد عرب چلے گئے وہاں درس حدیث دیتے رہے۔ ریشمی رومال کی تحریک میں شریک تھے۔ اسی جرم میں گرفتار کر کے مالٹا بھیجے گئے۔ جب شیخ الہند وہاں سے رہا ہوکر آئے تو ان کے ساتھ ان کو بھی رہا کر دیا گیا۔ ہندستان آنے کے بعد کانگریس میں شمولیت اختیار کی اور مسلمانوں کو منظم کرنے کے لئے جمعیۃ علماء ہند قائم کی۔ ملک کے بڑے رہنماؤں کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لئے اور ہندستان کی سالمیت کے لئے بے انتہا قربانیاں دیں۔ ساتھ ہی ساتھ دارالعلوم دیوبند میں درس حدیث بھی دیتے رہے۔ 1958 میں وفات ہوئی۔

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی

حسرت موہانی جنگ آزادی کے بہت نامور سپاہی ہیں۔ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی اس کے بعد ''اردوئے معلی'' کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ حکومت مخالفت سرگرمیوں کی پاداش میں متعدد مرتبہ جیل گئے۔ تاریخ ہند میں مولانا حسرت موہانی کا نام اس لئے بھی یاد رکھا جائے گا کہ سب سے پہلے انہوں نے کانگریس کے اجلاس میں یہ اعلان کیا تھا کہ کانگریس کا نصب العین انگریزوں سے مکمل آزادی حاصل کرنا ہوگا۔ اگر چہ اس وقت یہ قرارداد منظوری نہ ہوسکی لیکن بعد میں کانگریس نے اس کو قبول کیا۔

مولانا حسرت سودیسی کے زبردست حامی تھے اور اپنی بیگم نشاۃ النساء بیگم کے ساتھ مل کر انہوں نے عوام میں ملکی مصنوعات کے استعمال اور غیر ملکی مصنوعات کے بائیکاٹ کی تحریک چلائی۔ تقسیم ہند کے زبردست مخالف تھے۔ آزادی کے بعد آئین ساز اسمبلی کے رکن منتخب

ہوئے 1951 میں انتقال ہوا۔

حکیم اجمل خاں

مسیح الملک حکیم اجمل کا تعلق دلی کے ایک قدیم طبی گھرانے سے، دہلی میں انہوں نے اپنا دواخانہ قائم کیا۔اعلیٰ درجہ کے طبیب تھے، جنگ آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ہندو مسلمان دونوں قوموں میں یکساں مقبول تھے۔مسلم لیگ، کانگریس، ہندو مہاسبھا اور تحریک خلافت میں نمایاں حصہ لیا تحریک عدم تعاون میں بھی شریک رہے۔حکومت برطانیہ کے دیے ہوئے اعزازات واپس کردیے اور سودیسی تحریک میں شامل ہوگئے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانیوں میں سے تھے۔اس ادارے کی بڑی خدمت کی،فرقہ وارانہ اتحاد کے پر جوش حامی تھے۔

مولانا محمد علی جوہر

تحریک خلافت کے بانی تھے۔علی گڑھ اور لندن میں تعلیم حاصل کی،دوران تعلیم ہی آزادی کی جدوجہد سے وابستہ ہوگئے۔کامریڈ کے نام سے انگریزی میں اور ہمدرد کے نام سے اردو میں اخبار نکالتے تھے۔پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار کئے گئے۔رہا ہونے کے بعد خلافت کمیٹی قائم کی اور تحریک عدم تعاون میں بھی سرگرم حصہ لیا۔جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی تھے۔لندن میں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے ہوئے تھے،وہیں انتقال ہوگیا۔

ڈاکٹر مختار انصاری

ڈاکٹر مختار انصاری کا تعلق یوپی کے ایک شہر غازی پور سے تھا۔برطانیہ میں ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی۔واپس آکر پریکٹس شروع کی، 1912 میں ترکی گئے۔1918 میں ہوم رول کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔کانگریس اور خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے۔تحریک عدم تعاون میں بھرپور حصہ لیا،جامعہ ملیہ اسلامیہ کے چانسلر بھی رہے۔ملک کے سیاسی خدوخال کو متعین کرنے کا اہم کردار ہے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو

امرتسر کے رہنے والے تھے۔برطانیہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کی۔ستیہ گرہ تحریک میں حصہ لیا۔جلیانوالہ باغ کے حادثہ کے بعد ان کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔دراصل جلیانوالہ باغ کا جلسہ سیف الدین کچلو کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کے طور پر ہی ہوا تھا۔بعد میں ان کو رہا کردیا گیا۔انہوں نے اپنی وکالت چھوڑ کر مکمل طور پر تحریک آزادی میں شریک ہوگئے۔کراچی کیس کے مشہور مقدمہ میں ان کو جیل کی سزا ہوئی۔ انہوں نے مجموعی طور پر 14 سال جیل میں گزارے۔انہوں نے ''آل انڈیا پیس کونسل'' قائم کی تھی۔اس کے علاوہ تمام تحریکات میں مکمل شریک رہے۔جنگ آزادی کے ایک سپاہی کی طرح ملک کو آزاد کرانے کے لئے لڑتے رہے۔

محمد برکت اللہ

تحریک آزادی کے صف اول کے رہنما تھے۔برطانیہ میں انہوں نے قوم پرستوں کو جمع کر کے آزادی کی تحریک چلائی واپس آنے کے بعد سودیسی تحریک سے وابستہ ہوگئے۔1909 میں جاپان گئے۔وہاں سے ایک اخبار نکالا۔1914 میں امریکہ گئے اور غدر پارٹی میں شامل

ہوگئے، پہلی جنگ عظیم شروع ہونے پر یوروپ چلے گئے۔ جرمنی اور ترکی میں ہندستان کی آزادی کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، پھر افغانستان گئے وہاں راجہ مہندر پرتاپ کے ساتھ مل کر ملک کی پہلی جلاوطن حکومت قائم کی۔ وہاں سے پھر جرمنی گئے اور ہندستانی جنگی قیدیوں کو آزادی کا درس دیتے رہے۔ یہاں بھی انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ 1921 میں روس گئے اور لینن سے ملاقات کی پھر واپس جرمنی آگئے۔ اسی جلاوطن میں ان کی وفات ہوگئی۔

مفتی کفایت اللہ

دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور اسی دوران تحریک آزادی سے وابستہ ہوگئے۔ دہلی آکر انجمن ہدایت الاسلام کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن رہے، سول نافرمانی کی تحریک کے دوران نگراں مقرر کئے گئے، نمک ستیہ گرہ میں خود شریک ہوئے۔ مدرسہ امینیہ میں استاد تھے۔ انگریزوں نے اس مدرسہ کو تعاون دینے کی پیشکش کی۔ لیکن مولانا نے جواب دیا کہ ہمارا مقصد وطن کی آزادی ہے اور یہ ہمارا دینی فریضہ ہے۔ ہم انگریزوں کی مدد لینے کے مقابلے میں اس مدرسہ کو بند کرنا زیادہ پسند کریں گے۔

مفتی صاحب ملک کے آزاد ہونے تک سیاست میں سرگرم رہے۔ لیکن آزادی حاصل ہوجانے کے بعد سیاست چھوڑ دی اور یکسوئی سے درس وتدریس میں مشغول ہوگئے۔ 1952 میں ان کا انتقال ہوگیا۔

اوپر مذکور چند ناموں کے علاوہ مسلم رہنماؤں کے علاوہ مسلم رہنماؤں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جنہوں نے وطن کو آزاد کرانے کے لئے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور اس راستہ میں بے شمار قربانیاں دیں۔

21.12 اردو صحافت

ملک کی آزادی کے سلسلے میں اردو صحافت نے جو کردار ادا کیا ہے وہ بھی اس جنگ کا اہم پہلو ہے۔ اردو اخبارات اول دن سے ہی آزادی کی جنگ میں شمولیت اختیار کی غالباً اس لئے اردو احتجاج کی زبان بن گئی، اردو کے اول اخبار نویسوں میں مولانا محمد باقر کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے 1857 میں آزادی کا بگل بجایا تھا اور اس انقلاب کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے ان کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ ایک دوسرے اخبار ''پیام آزادی'' کو بھی باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے الزام میں بند کردیا اور اس کے ایڈیٹر بیدار بخت کو سولی پر لٹکا دیا۔

جنگ آزادی میں صحافت کے کردار کو دیکھتے ہوئے انگریزوں نے صحافت پر قدغن عائد کرنی شروع کی اور رفتہ رفتہ پرانے بیشتر اخبار بند کردیے۔ 1857 کے بعد اردو صحافت ایک نئی کروٹ کے شروع ہوئی۔ اس میں اجمیر سے شائع ہونے والا اخبار ''تاریخ بغاوت ہند'' اور لکھنؤ سے شائع ہونے والا اخبار اودھ پنچ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان اخبارات نے مثبت طور پر ہندستانی ذہن کو آزادی کی اہمیت سمجھائی۔ سرسید احمد خاں کے اخبار انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔

20ویں صدی میں اردو صحافت دوبارہ باغیانہ تیور کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی، مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلی اور ظفر علی

خاں نے زمیندار، مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ، مولانا محمد علی جوہر نے ہمدرد اور ان کے علاوہ، الجمعیۃ، مدینہ بجنور، ریاست، وندے ماترم، صبح وطن، قومی آواز، پرتاپ، ملاپ اور اس طرح کے تقریباً 2 ہزار سات سو پچاس اردو اخبارات تھے جنھوں نے ملک کی آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ہندستانی کی جنگ آزادی کی تاریخ ایک خونچکاں داستان ہے اور اس داستان کا سب سے معتبر ماخذ اور تاریخی ریکارڈ اردو اخبارات ہیں۔

21.13 خلاصہ

ہندستان کی تحریک آزادی میں مسلمان ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہیں۔ 1757 میں پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کی شکست کے بعد بعض مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا۔ اور 1763 میں مجنون شاہ مستانہ کی قیادت میں تحریک آزادی شروع کر دی۔ تقریباً 20 سال تک مداری صوفیہ جنگ کرتے رہے۔ لیکن مجنون شاہ کی وفات کے بعد یہ تحریک کمزور پڑ گئی۔ اسی دوران ٹیپو سلطان سامنے آئے اور انھوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنی جان قربانی کر دی۔ اس کے بعد حاجی شریعت اللہ نے بنگال میں اور شمالی ہندستان میں سید احمد شہید بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلوی نے تحریک کو سنبھالا یہ دونوں بزرگ بالاکوٹ کے میدان میں شہید ہو گئے۔

1857 میں تحریک آزادی کی جنگ بڑے پیانے پر شروع ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر اس کے قائد تھے اور عوام کے ہر طبقے نے اس میں شرکت کی، لیکن مختلف اسباب کی وجہ سے یہ تحریک ناکام ہو گئی۔ اس کی ناکامی کے بعد ہندستانیوں نے بالعموم اور مسلمانوں نے بالخصوص جنگ آزادی کے لئے نئے میدان تلاش کئے۔ مسلم جدوجہد بھی جاری رہی اس کے ساتھ مدارس کا قیام، مختلف تحریکات کا قیام اور اخبارات ورسائل کے ذریعہ اس تحریک کو نئے میدان فراہم کئے۔ انگریزوں نے ہر جگہ ظلم وجبر اور طاقت سے ان تحریکات کو کچلنے کی کوشش کی، ان میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگ جیل گئے، پھانسیاں ہوئیں، کالے پانی کی سزائیں دی گئیں۔ کانگریس کے قیام کے بعد مسلمانوں نے اس میں بھی پورے جوش وخروش سے شرکت کی، تحریک ریشمی رومال چلائی۔ خلافت تحریک، جمعیۃ علماء ہند اور الاحرار جیسی متعدد تنظیمیں قائم کیں، سول نافرمانی، سودیسی تحریک، تحریک عدم تعاون اور نمک ستیہ گرہ میں بھی مسلمان برابر سے شریک رہے اور ایک طویل جدوجہد کے بعد آخر ملک انگریزی اقتدار سے آزاد ہو گیا۔

21.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں دیجئے۔

1- جنگ آزادی میں بہادر شاہ ظفر کے کردار پر روشنی ڈالئے۔

2- جنگ آزادی میں اردو صحافت کی خدمات بیان کیجئے۔

درج ذیل کے جوابات پندرہ سطروں میں لکھیے۔

1- جنگ آزادی میں دارالعلوم دیوبند کا کردار بیان کیجیے۔

2- کانگریس اور مسلمان کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔

3- آزادی کی تحریک میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خدمات بیان کیجیے۔

21.15 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1- آزادی ہند کی جدوجہد میں مسلمانوں کا حصہ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالمنعم القمر

2- ہندستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، ڈاکٹر محمد مظفرالدین فاروقی

3- تاریخ تحریک آزادی ہند، تاراچند

اکائی 22 : تحریکات اورادارے

اکائی کے اجزاء

22.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ جدید ہندوستان میں ابھرنے والی مسلم تحریکات اور اداوں سے نہ صرف واقف ہوسکیں بلکہ ان کا بخوبی تعارف حاصل کرلیں۔ ساتھ ہی وہ ان کے قیام، پس منظر اور اغراض ومقاصد سے بھی آگہ ہوسکیں اور کسی قدر ان کی خدمات اور کارناموں سے بھی متعارف ہوجائیں۔ اسی طرح اس اکائی کا مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ ان تحریکات اور اداروں کے باہمی فرق وامتیاز کو جاننے اور سمجھنے کے بھی اہل ہوسکیں۔

22.2 تمہید

اس اکائی میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندہ تحریکوں، تنظیموں، اداروں اور جماعتوں کا ایسا تعارف پیش کیا جائے جو ان کے قیام اور پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے اغراض ومقاصد، نصب العین، طریقہ کار، کاگزاریوں اور خدمات پر مشتمل ہو۔ مختلف تحریکوں اور اداروں کا تعاف پیش کرتے ہوئے اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ان کے سماجی و معاشرتی اثرات پر بھی روشنی پڑے اور ان کے تعارف میں معروضی طریقہ کار کو اختیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

22.3 تحریک مجاہدین

22.3.1 پس منظر اور قیام

اس تحریک کے محرک اور بانی سید احمد شہید بریلوی تھے جنھوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول میں اس تحریک کا آغاز کیا تھا۔ اس کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ معاشرہ سے جاہلانہ رسم ورواج، قبر پرستی، تعویذ گنڈے، شرک جلی اور خفی غیر اللہ سے توکل اور امیدیں، شفاعت کا غلط تصور، تنظیم وآداب کے جاہلی رسوم، نسل پرستی، کھیتی باڑی اور کاروبار میں جاہلانہ رسوم، نجومیوں اور ساحروں کا زور اور اس طرح کی دیگر خرابیاں کہ جس میں مسلمان معاشرہ اور حکومتیں گھری ہوتی تھیں کو ختم کر کے انھیں کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کے قریب لایا جائے اور مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کرنا مقصود تھا۔ علاوہ ازیں جہاد فی سبیل اللہ جیسے عظیم کام کا احیاء بھی مقصود تھا کہ جس کے ترک کرنے سے ملت ذلیل ورسوا ہورہی تھی اور مسلم حکومتیں اور ریاستیں، نواب اور امرا کی جاگیروں پر غیروں کا قبضہ ہورہا تھا چنانچہ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے تحریک دعوت وجہاد برپا کر کے نہ صرف مسلمانوں کی عظمت رفتہ بحال کرنے کی کوشش کی بلکہ انھیں اسلام کے صحیح راستہ پر عمل کرنے پر بھی اکسایا اور باعمل مسلمان بنانے کی کوشش کی۔ اٹھارہویں صدی کے ابتداء میں جس تحریک کو شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے نے شروع کیا تھا اور تحریر وتقریر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو اس میں عملی شرکت کی دعوت دی تھی یہ تحریک اسی کا عملی اور حرکی نمونہ کہی جاسکتی ہے۔

اس تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ یہ برصغیر کی پہلی اسلامی تحریک ہے جو دعوت وجہاد کے شکل میں منظر عام پر آئی اور ملت کی زبوں حالی کو دور کرنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ نے تحریر وتقریر کے ساتھ احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کے ذریعہ ملت اسلامیہ کے بقا وقیام کی کوشش کی تھی تو

سید صاحب اور ان کے رفقاء نے بذات خود عملی کوشش کر کے اس عظیم فریضہ کو انجام دیا جس میں ملت کی بقا کا راز پوشیدہ تھا۔

22.3.2 تحریک مجاہدین کے اغراض و مقاصد

اس تحریک کے اغراض و مقاصد میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ مسلم معاشرہ سے بدعات وغیر اسلامی رسومات کو ختم کیا جائے۔ انگریزی حکومت کے قیام کو روکا جائے۔ مسلمانوں کے اخلاق و کردار کی اصلاح کی جائے۔ توحید خالص کی طرف انھیں راغب کیا جائے۔ ملت کی بقا اور مسلم حکومتوں کے تحفظ کے لئے اقدامات کئے جائیں اور تحریک دعوت و جہاد کی طرف حکمرانوں، امراء، نوابوں اور جاگیرداروں کو متوجہ کر کے انھیں اس میں شامل ہونے کی تحریک پیدا کی جائے اور تحریک دعوت و اصلاح کے لئے مسلمان علماء اور صوفیاء کو متوجہ کیا جائے نیز خالص اسلامی معاشرہ کے قیام اور اسلامی حکومتوں کی بقاء کے لئے ہر طرح کے عملی اقدامات کئے جائیں وغیرہ۔ چنانچہ انھیں اغراض و مقاصد کے تحت سید صاحب اور ان کے رفقاء نے اکناف ملک میں دعوتی و جہادی دورہ کیا، وعظ و ارشاد کی محفلیں قائم کیں، حلقے اور زاویے بنائے۔ شہر شہر، قریہ قریہ اور قصبوں کا اصلاحی دورہ کیا۔ حکمرانوں، امراء و نوابوں سے ملاقات کر کے انھیں تحریک دعوت و اصلاح اور جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ انھیں اعلائے کلمۃ اللہ اور اقامت دین کے کاموں کے لیے ابھارا۔

22.3.3 تحریک مجاہدین کا عملی میدان اور معرکۂ بالاکوٹ

سید صاحب اور ان کے رفقاء نے تحریک دعوت و اصلاح و جہاد کا آغاز شمالی اور وسط ہند میں کیا تھا اور یہاں کے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی نیز یہاں کے حکمرانوں، امراء و نوابوں کے ساتھ عام مسلمانوں کا دعوتی و جہادی مزاج بنایا تھا مگر دعوت جہاد کا عملی دائرہ کار صوبہ سرحد کو بنایا جہاں اس تحریک کے اثرات نمایاں نہیں تھے اور نہ ہی یہاں کے مسلمان اور قبائلی سردار اس کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ ابتدائی چند سال میں یہاں پر انہوں نے مثالی حکومت قائم کر کے علاقہ و اطراف میں کامیاب فوجی کامیابی حاصل کی۔ پشاور پر قبضہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ باوجود اس کے کہ ان افراد اور جماعت کا مقصد بہت عظیم تھا لیکن معرکۂ بالاکوٹ میں سکھوں کے خلاف قبائلی سرداروں کی عدم موافقت اور عین حالت جنگ میں مسلمانان ہند کی حمایت سے دست بردار ہونے کی وجہ سے ان کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا اور جماعت کے دونوں بڑے ذمہ دار جو اس تحریک کے روح رواں تھے یعنی سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی شہادت عمل میں آئی۔ گو کہ ان کی شہادت کے بعد بھی یہ تحریک جاری و ساری رہی مگر اس میں پہلے جیسا جوش و جذبہ قائم نہ رہ سکا۔

22.3.4 تحریک مجاہدین اور اس کی کارکردگی کا جائزہ

یہ تحریک برصغیر کی پہلی باقاعدہ اسلامی تحریک تھی جس کا آغاز آخر مغلیہ دور میں ہوا۔ اس وقت اپنے عہد کی عظیم حکومت مرض الموت میں مبتلا تھی۔ حکومت شاہ عالم از دلی تا پالم کے مصداق اس کے اثر و رسوخ صوبہ جات پر ختم ہو گئے تھے اور مغل جنرل اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر الگ سے ریاستیں بنا کر مختار کل تھے۔ حکومت دہلی سے واجبی اور کاغذی لگاؤ کے علاوہ کسی قسم کا تعلق نہیں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت چھوڑ کر حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حکمرانی کے عمل میں آ چکی تھی اور ملک کے مشرقی حصوں پر اس نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ حکومت دہلی کے بھی جملہ امور بعض خفیہ معاہدوں کے تحت انھیں کے قبضے میں تھے۔ فوج، عدلیہ، میونسپلٹی اور تجارت کے تو وہ مختار کل تھے۔ مسلمانوں اور مسلم معاشرہ کی

صورت حال جیسا کہ اوپر کی سطروں میں لکھا جاچکا ہے بہت خراب تھی۔ ایسی ہی فضا، حالات اور ماحول میں دہلی کے درویش صفت علماء نے احیاء وتجدید دین و جہاد کی تحریک کا آغاز کیا۔ دہلی سے شروع ہونے والی یہ تحریک آہستہ آہستہ وسط اور شمالی ہند میں کافی مقبول ہوئی ۔علماء، صوفیاء، دعاۃ ومبلغین اور عوام الناس نے اس کا ساتھ دیا اور سید صاحب اور ان کے رفقاء کے نہ صرف ہم نوا ہوئے بلکہ ان کی تحریک دعوت و جہاد کے لئے جینے ومرنے کی قسمیں بھی کھانے لگے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ منجمد معاشرہ میں تحریک پیدا کرنا اور عوام الناس کو روایتوں سے ہٹا کر دین اسلام کی طرف لانا، امراء وحکمرانوں کو اس تحریک کا ہمنوا بنانا غیر معمولی کام تھا اس کے لئے تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کیں ۔اپنوں اور غیروں کی غداریوں کا سامنا کیا۔قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں مگر مقصد سے غافل نہیں ہوئے۔آج کل مسلم معاشرہ میں تجدید احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کا جو مزاج دکھائی دیتا ہے، وہ اسی تحریک کی برکتوں کا نتیجہ ہے۔ یہ تحریک معرکۂ بالاکوٹ میں آخری سانس لے کر ختم ہوگئی مگر اس کے مقاصد جلیلہ ختم نہیں ہوئے امت نے مجاہدین اور شہیدوں کے خون کو دیگر اسلامی تحریکوں کی شکل میں باقی اور جاری و ساری رکھا۔ 1857 کے بعد جتنی بھی اسلامی تحریکیں وجود میں آئیں سبھی کی کڑی اس تحریک سے ملتی ہے۔

22.4 تحریک دارالعلوم دیوبند

22.4.1 تحریک دیوبند کا پس منظر

تحریک دیوبند کا قیام بھی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت ہوا۔ 1857 میں جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا چراغ انگریزوں کے ذریعہ گل ہوا تو مسلمانان ہند یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ عظمت رفتہ کے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ جس کی بنا پر ہندوستان سے مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ دور حکومت یک لخت ختم ہوگئی ۔اس سوال کا جواب دینے اور مسئلے کا حل نکالنے کے لئے مسلمانوں میں دو مختلف جماعتوں کا وجود ہوا۔ ایک سرسید کی جماعت ۔دوسری علماء ہند کی جماعت ۔دونوں جماعتوں نے ملت اسلامیہ ہند کے مسائل کے مختلف حل تجویز کئے۔ لیکن دونوں جماعتوں کے افراد ایک بات میں اشتراک رکھتے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کے زوال کا سبب مسلمانوں کی تعلیم سے دوری ہے۔ سرسید اور ان کے رفقاء کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمان جدید اور سائنسی تعلیم سے محروم ہیں اور دنیا میں ہورہی سائنسی ایجادات اور اس کے انقلابات سے واقف نہیں ہیں اس لئے وہ جدید اور سائنسی تعلیم سے آراستہ اور جدید ٹیکنالوجی سے لیس پر عزم قوم کا سامنا نہیں کرسکے جس کی وجہ سے انھیں ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ علماء ہند کی جماعت ملت کے مسائل کے حل کے لئے اس سے بالکل مختلف نظریہ رکھتی تھی۔ اس جماعت کا خیال تھا کہ چونکہ مسلمان دینی اور دنیاوی دونوں علوم سے بے بہرہ ہوگئے تھے اور شعائر اسلام اور دین حنیف سے وابستگی بہت کم کردی تھی۔ رسوم ورواج، میلے ٹھیلے، دکھاوے اور لہو لعب میں مشغول ہوکر اخلاقی اقدار کی نچلی سطح پر چلے گئے تھے جس کی بنا پر ان کے ہاتھوں سے زمام حکومت چھین لی گئی اور وہ ذلیل ورسوا ہوگئے۔ دونوں جماعتوں نے اپنے نظریات اور لائحہ عمل کے مطابق ملت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی اور مسلمانوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ علماء ہند کا خیال یہ تھا کہ جب تک مسلمان اسلام اور اسلامی شعائر سے وابستہ نہیں ہوں گے۔ اسلام سے محبت اور عمل میں عزم وحوصلہ صحابہ کرام کی روش، غیر اسلامی شعائر اور رسوم ورواج سے دوری اور بلند اخلاق کا مظاہرہ نہیں کریں گے اس وقت تک ہندوستان میں ان کی عظمت رفتہ بحال نہیں ہوسکتی ۔اسی فکر و خیال کے تحت علماء کی جماعت نے تحریک دیوبند کی داغ بیل ڈالی اور اس کے دوام کی کوششیں کیں ۔مدارس و مکاتب اور جامعات قائم کئے۔ ان کی نیک نیتی اور کوششوں میں اللہ نے اتنی

برکت دی کہ آج برصغیر اور عالم اسلام میں سیکڑوں ہزاروں مدرسوں کا جال پھیل گیا، جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کی بنیادیں مستحکم ہو سکیں۔

تحریک دیوبند کا قیام 15 محرم الحرام 1283ھ مطابق 30 مئی 1866 میں بروز جمعرات سہارن پور کے قصبہ دیوبند کی مسجد چھتہ کے صحن میں انار کے چھوٹے سے درخت کے سائے میں نہایت سادگی کے ساتھ بغیر کسی رسمی تقریب یا نمائش کے عمل میں آیا۔ اس درسگاہ کا آغاز ایک استاد اور ایک شاگرد کے ذریعہ ہوا۔ مسجد سے شروع ہونے والی اس درسگاہ نے بعد میں ترقی کرتے ہوئے ایشیا کی بڑی درسگاہوں میں اپنا مقام بنالیا، جسے آج دارالعلوم دیوبند کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسے علمی حلقوں میں ازہر ہند بھی کہا جاتا ہے۔ یہ بانیان دارالعلوم دیوبند کے خلوص نیت ہی کا ثمرہ تھا کہ ایک استاد اور ایک شاگرد کے ذریعہ شروع ہونے والی درسگاہ برصغیر ہند میں تحریک قیام مدارس کی محرک بن گئی۔ اس کے فارغین اور ذمہ داران و ہمدردان نہ صرف برصغیر پاک و ہند میں بلکہ ایشیا و افریقہ نیز یوروپی ملکوں میں بھی مدارس اسلامیہ کے قیام کا محرک بنے اور دینی درسگاہوں کو قائم کیا۔ اسلام کی نشر و اشاعت، مسلمانوں کی دینی و دنیاوی رہنمائی، مسلم مآثر و معابد کی حفاظت اور اسلامی اقدار اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور ملک و ملت کے دفاع میں اس کے فارغین نے جس طرح نمایاں خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ دارالعلوم دیوبند اور اس کے فارغ علما و اکابرین نے ملک کی آزادی میں جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور انگریزوں کے خلاف پر جوش عوامی تحریک چلائی ملک و ملت کو غلامی سے نجات دلانے کو یہاں کے علماء نے مذہبی فریضہ قرار دیا۔ غرض بانیان دارالعلوم دیوبند نے اس کے قیام کے وقت جس خواب اور غرض و غایت کے تحت اس ادارے کو قائم کیا تھا۔ اس ادارے کے فارغین نے ان کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا۔ اس ضمن میں اسیر مالٹا مولانا محمود حسن کی سیرت و شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

تحریک دیوبند کسی ایک شخص کی انفرادی کوشش کا نام نہیں ہے بلکہ چند افراد کی اجتماعی کوششوں اور عزم و حوصلہ کا نام ہے تاہم کسی بھی جماعت، ادارہ اور قوم کو ایک ذمہ دار قائد کی ضرورت ہوتی ہے جس کی قیادت میں کل پرزے حرکت کرتے ہیں۔ تحریک دارالعلوم دیوبند کے بانیان نے بھی مولانا قاسم نانوتوی کی قیادت و رہنمائی میں اپنے خواب و خیال اور پلان کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اس تحریک کے محرک مولانا قاسم نانوتوی ہی تھے۔ جیسا کہ لکھا ہے:

> ''ان دینی مدارس میں سب سے اہم اور مرکزی اہمیت کا حامل دینی مدرسہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ گو اس دارالعلوم کے قیام کا داعیہ کئی نیک نفس حضرات کے دلوں میں پیدا ہوا اور سب نے فرداً فرداً اس کا اظہار بھی کیا کہ اس ملک میں اب اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ و بقا کی واحد صورت ایک دینی مدرسہ کا قیام ہے لیکن ان سب حضرات میں پیش پیش مولانا محمد قاسم نانوتوی ہی تھے۔''

مولانا قاسم نانوتوی کے علاوہ جن لوگوں نے اس تحریک کے قیام و بقا میں سرگرم کردار ادا کیا ان کے نام یہ ہیں۔ سید عابد حسین دیوبندی، مولانا ذوالفقار علی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانی، مولانا یعقوب نانوتوی، مولانا رفیع الدین دیوبندی، مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہم۔

22.4.2 تحریک دیوبند کے اغراض و مقاصد

تحریک دارالعلوم دیوبند کے اغراض و مقاصد میں مسلمانوں اور ان کے بچوں کو قرآن مجید، تفسیر، حدیث و عقائد، کلام اور ان علوم سے متعلق ضروری اور معاون علوم و فنون کی تعلیم دینا شامل تھا، کہ ملت کو خیر القرون سے قریب تر کیا جا سکے۔ مسلمانوں کے اعمال و اخلاق کی تربیت

کرنا اور مسلم بچوں اور طالب علموں میں اسلامی روح پھونکنا۔ ایسے افراد تیار کرنا جو بذریعہ تحریر وتقریر تبلیغ اسلام اور اشاعت دین کے فرائض انجام دے سکیں۔ مسلمانوں کے اندر علم وفکر کی آزادی برقرار رکھتے ہوئے تعلیمی اداروں کو حکومت کے اثر سے محفوظ رکھنا۔ دین اسلام کی اشاعت کے لئے مدارس عربیہ کو قائم کرنا اور ان کا دارالعلوم سے الحاق کرنا وغیرہ اس تحریک کا بنیادی مقصد تھا۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام ایک عوامی تحریک کے طور پر عمل میں آیا۔ لہذا اس کے ذمہ داروں نے اسے حکومت اور جاگیرداروں کی اعانت سے دور رکھا اور عوامی چندے کے ذریعے اس ادارے کو چلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی تحریک کے روح رواں مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اصول ہشتگانہ (آٹھ بنیادی اصول) کے نام سے اس کا دستورالعمل مرتب کیا جس پر عمل پیرا ہو کر دارالعلوم دیوبند نے بے مثال ترقی کی۔ مولانا نانوتوی کے مرتب کردہ اصول ہشتگانہ درج ذیل ہیں:

1۔ اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے۔ آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

2۔ ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشان مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

3۔ مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو۔

4۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق مشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے لیے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

5۔ خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور اندازے و مشورے سے تجویز ہو تو پوری ہو جایا کرے۔ ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

6۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاءاللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا وار مدادغیبی موتوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

7۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

8۔ تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو۔ بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے۔

22.4.3 دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم

ابتداء میں دارالعلوم دیوبند کا نصاب تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق تھا مگر بعد میں اس کے ذمہ داروں نے حالات اور وقت کے تقاضے کے تحت نصاب میں حذف واضافہ کیا اور علوم کی درجہ بندی کر دی۔ ابتداً علوم عالیہ کے تحت، قرآن، تفسیر، حدیث، اصول حدیث، فقہ،

اصول فقہ، علم وعقائد، کلام، علم الاحسان (تصوف) اور علم الفرائض کی تدریس ہوتی تھی، علوم آلیہ کے تحت صرف ونحو معانی و بیان، ادب عربی، منطق، فلسفہ، عروض وقوافی، مناظرہ، ہیئت و ہندسہ، حساب، طب، تجوید وقرأت وغیرہ۔ ان علوم کو علوم عالیہ کے مدومعاون کی وجہ سے پڑھایا جاتا تھا۔ بعد میں جب علوم کی درجہ بندی کردی گئی تو ان علوم کو ابتدائی، متوسط، اعلیٰ اور تکمیل کے زمرے میں تقسیم کیا گیا اور درس نظامی کے دینی علوم کے ساتھ کچھ جدید علوم کو شامل کر کے تعلیم دی جانے لگی۔ البتہ زیادہ زور دینی علوم کی تدریس پر رہا جو اس کا بنیادی مقصد تھا۔ اس ادارے کے ذمہ داروں نے عوامی مسائل کے حل کے لیے ابتداء ہی سے افتاء کا شعبہ بھی قائم کیا تھا۔ یہاں طلبہ کو اس کی بھی تربیت دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں پر ایک زمانے تک طب کی تعلیم بھی دی جاتی تھی، صنعت وحرفت اور کتابت کے شعبے بھی قائم تھے۔ اب ان کی جگہ کمپیوٹر کی تعلیم نے لے لی ہے۔

22.4.4 دارالعلوم دیوبند کے مختلف شعبہ جات

رفقاء دارالعلوم دیوبند نے ابتداء ہی سے مختلف کاموں کو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر رکھا ہے تا کہ اس کے انتظام وانصرام اور دیکھ ریکھ میں آسانی ہو۔ آزادیٔ ہند کے بعد ان شعبوں نے مزید ترقی کی۔ وہ شعبے یہ ہیں:

1- شعبۂ تعلیم — 2- شعبۂ دارالافتا
3- شعبۂ طب — 4- شعبۂ تبلیغ
5- شعبۂ کتابت — 6- شعبۂ صنعت وحرفت
7- شعبۂ نشریات — 8- شعبۂ تنظیم وترقی
9- شعبہ اوقاف — 10- کتب خانہ

شعبۂ کتابت کی جگہ اب کمپیوٹر نے لے لی ہے۔ ان تمام شعبہ جات کے مختلف ذمہ دار منتخب کئے جاتے ہیں جو ادارہ کے ناظم اعلیٰ کو جوابدہ ہوتے ہیں۔

22.4.5 دارالعلوم دیوبند کا مقام ومرتبہ

برصغیر پاک وہند میں اسلامی مدارس کے قیام اور اس کے بقا وتحفظ کے لئے مسلمان ہمہ تن مشغول رہے ہیں۔ حکومت کے علاوہ اپنی جیب خاص سے ادارے قائم کرنا۔ جائیدادوں کو وقف کرنا علوم دینیہ کی تحصیل کے لئے آنے والے طلبہ کی خبر گیری کرنا مسلم معاشرہ کا جزء لاینفک تھا مگر یہ اس وقت کی بات ہے جب برصغیر پاک وہند میں مسلم حکمراں تھے۔ وہ امراء، نواب اور جاگیردار ہوا کرتے تھے۔ تجارت میں ان کی نمائندگی مسلم آبادی کے اعتبار سے زیادہ تھی۔ پھر بھی کوئی ادارہ تحریک کی صورت میں تبدیل نہ ہوسکا۔ قیام دارالعلوم کے وقت حالات یکسر مختلف ہونے کے باوجود یہ ادارہ برصغیر میں ایک تحریک بن کر ابھرا۔ اس تحریک کے ثمرات اتنے بارآور ہوئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے بے سروسامانی کے عالم میں سیکڑوں اور ہزاروں مدارس اسلامیہ قائم ہوگئے اور اس کے فارغین اور حسب توفیق مستفید ہونے والے طلبہ دنیا بھر کے گوشوں میں پھیل کر اس تحریک کو پروان چڑھانے میں معاون ومددگار رہے۔

اس تحریک کے پس منظر، قیام اور مقاصد کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک دینی تعلیمی تحریک نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے اندر مذہبی تعلیم کے فروغ، ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح اور ان کے اندر حریت و آزادی کی جلا اور نمو کی ایک تحریک تھی جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف میدانوں میں قابل رشک حد تک رہنمائی کی اور اب بھی اپنے مشن کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔

22.5 علی گڑھ تحریک

22.5.1 علی گڑھ تحریک کا قیام اور پس منظر:

یہ تحریک بھی وقت اور حالات کے تقاضے کے تحت شروع ہوئی تھی۔ ہندوستان کے سیاسی حالات اور 1857 میں مسلم حکومت کا زوال اس کے قیام کا محرک بنے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اس کو قائم کیا تھا۔

1857 کی ناکام جنگ آزادی نے ہندوستان سے مسلمانوں کی سیاسی قیادت کو ختم کر دیا تھا۔ انگریز دہلی پر قابض ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کے مآثر و معابد اور عظمت رفتہ کی دیگر یادگاریں حکومتی سرپرستی میں ختم کی جا رہی تھیں۔ جامع مسجد بند کر دی گئی تھی۔ علماء سے لے کر امراء و زعماء تک سبھی کے جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ پھانسیاں روزمرہ کا معمول تھیں۔ اسلامی تہذیب و اقتدار کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ دہلوی تہذیب کے پروردہ اور اس کی حفاظت کرنے والے لوگ عزت و آبرو کی حفاظت میں ملک سے ہجرت کر رہے تھے اور عالم یہ تھا کہ بقول غالب یہ جیتا جاگتا شہر نہیں بھائیں بھائیں کرتا ایک ویرانہ ہو گیا تھا۔ مسلمان محکوم و معتوب ہو چکے تھے اور ان کے ہاتھ سے ہر طرح کی ذمہ داری چھین لی گئی تھی۔ اس عہد میں مسلمان ہونا اور باغی ہونا مترادف سمجھا جانے لگا تھا۔ اس طرح کے ماحول میں دہلی ہی کے کچھ ارباب حل و عقد ملت اسلامیہ کی رہنمائی اور قیادت کے لئے اٹھے اور مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور و خوض کر کے اس نتیجہ پر پہنچے کہ مسلمان جدید اور سائنسی علوم سے نہ صرف بے بہرہ ہیں بلکہ سائنسی انقلابات اور اس کی برکتوں سے ناواقف بھی ہیں چنانچہ ان لوگوں نے مسلمانوں کو سائنس اور جدید انقلابات سے فائدہ اٹھانے نیز روایتی تعلیم کے نصاب میں اصلاح کی کوشش کے لئے تحریک چلانے کی مہم شروع کی۔ اس تحریک کے روح رواں سرسید اور ان کے رفقاء تھے۔

سرسید احمد خاں نے اس تحریک کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا اور اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے 24 مئی 1875ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کے نام سے ایک جدید تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی جسے دو سال بعد یعنی 1877ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ایم اے او کالج) کا نام دیا گیا، اس ادارے نے 1920ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔ اس طرح یہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا میں قائم ہونے والے جدید تعلیم کا پہلا ادارہ تھا۔ کیمبرج کی طرز پر اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ بچوں کی تعلیم تربیت کے لئے انگریز اتالیق مقرر کیے گئے۔ غرض تعلیم سے لے کر تربیت تک سبھی معاملوں میں انگریزی معاشرت کو اختیار کیا گیا۔ انگریزی وضع قطع کی پذیرائی کی گئی۔ انگریزی زبان کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ ایسا اس لئے کیا گیا تا کہ مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کے بچے بدلتے ماحول میں نئے ابھرتے اعلیٰ طبقے میں شامل ہو سکیں اور خود کو اجنبی محسوس نہ کریں۔ لیکن اس کے ساتھ اسلامیات اور اسلامی تہذیب و روایات اور اقدار کو بھی باقی رکھنے کی کوشش کی گئی۔ نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ تفسیر و احادیث کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ عربی زبان و ادب کی تعلیم کے لئے الگ سے استاد کا تقرر کیا

گیا تھا۔علامہ شبلی نعمانی تقریباً سولہ سال تک یہاں عربی زبان وادب کی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔انھیں اس بات پر فخر تھا کہ یہاں کے بچوں میں اسلامی شعور اور دین سے رغبت پیدا کرنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔سرسید اس بات کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ ان کے طلبہ وضع قطع میں تو انگریزی معاشرت کا حصہ ہوں لیکن عملی زندگی میں وہ دینی اور اسلامی اقدار کے حامل ہوں۔اسی لئے ان کے عہد میں بچوں کو نماز کی پابندی کرائی جاتی تھی۔ایک دفعہ نماز میں طلبہ کی کم تعداد دیکھ کر علامہ شبلی سے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ طلبہ نماز کی طرف سے غافل ہو رہے ہیں۔سرسید نے عصری تعلیم کے ساتھ دینی علوم کی تدریس پر اظہار خیال کرتے ہوئے پنجاب کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان عصری تعلیم کی تحصیل کے ساتھ دینی علوم میں بھی ماہر ہوں۔ان کے ایک ہاتھ میں قرآن ہو اور دوسرے میں سائنس وٹیکنالوجی کا علم۔غرض سرسید اور ان کے رفقاء نے جدید عصری تعلیم کے ساتھ دینی علوم کی تدریس سے بے اعتنائی نہیں برتی۔آج بھی جب کہ یہ ادارہ یونیورسٹی بن چکا ہے یہاں اسلامیات کی تعلیم لازمی مضمون کے طور پر دی جاتی ہے علاوہ ازیں شعبۂ دینیات کا الگ سے شعبہ بھی قائم ہے۔ سرسید احمد خاں نے جس ادارے کی بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا اس کے استحکام اور ترقی میں ان کے نامور رفقاء محسن الملک، وقار الملک اور مولانا الطاف حسین حالی نے نمایاں اور اہم خدمات انجام دیں۔

22.5.2 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے اغراض ومقاصد:

اس ادارہ کے قیام اور اس کے اغراض ومقاصد میں یہ تھا کہ مسلمانوں کو جدید عصری تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کے بدلتے سیاسی حالات میں مسلم سماج سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے اس لئے ان کے وقار اور عزت وآبرو اور گزری عظمت رفتہ کی بحالی وقت کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت حکومت وقت سے قربت اور جدید عصری تعلیم کی تحصیل کے بغیر ممکن نہیں۔اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سرسید اور ان کے رفقا حکومت سے ٹکراؤ کی پالیسی کے مخالف تھے۔وہ چاہتے تھے کہ مسلمان حکومت مخالف نہ ہو کر موافقت کی پالیسی پر گامزن ہوں اور جدید تعلیم اور تہذیب کی برکتوں سے فائدہ اٹھائیں انھوں نے ٹکراؤ کی پالیسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی بربادی، اسلامی اقدار واقتدار اور مسلمانوں کے مآثر ومعابد کی تباہی کا بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان مزید تباہی وبربادی کا شکار ہوں، لہٰذا انھوں نے اپنے کالج اور اس کے انگریز اساتذہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کو حکومت سے قریب لانے کی عملی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئے۔

22.5.3 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جات اور اس کے امتیازات

سرسید اور ان کے رفقاء نے ایم اے او کالج کے نام سے جس ادارے کی بنیاد رکھی تھی، ابتداً اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے تھا۔اس کے بعد 1885ء میں اسے الٰہ آباد یونیورسٹی سے ملحق کر دیا گیا اور ترقی کرتے کرتے اس ادارے نے 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل کرلیا۔اس میں میں آج کل اکیس فیکلٹیوں کے تحت دو سو پچاس سے زائد کورسز کی تعلیم ہوتی ہے۔علاوہ ازیں خالص مطالعات (centers) کی شعبے الگ ہیں۔اس کا یہ امتیاز بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں گریجویشن کی سطح پر مخلوط تعلیم نہیں دی جاتی۔لڑکیوں کی تعلیم کے لئے علاحدہ کالج کی عمارت اور کیمپس ہے جو عبداللہ گرلس کالج کے نام سے معروف ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ بھی امتیاز ہے کہ یہاں نرسری تا پی ایچ ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے۔یہ ادارہ ہندوستان کی پہلی رہائشی یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے۔ابتدا ہی سے اس ادارے کے بانیان نے اپنے آپ کو اور ادارے کو مسلکی

اختلافات سے الگ رکھا۔ یہاں شعبۂ دینیات سنی کے ساتھ ساتھ شعبۂ دینیات شیعہ بھی قائم ہے۔ آج کل اس ادارے میں تقریباً ایک لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ بیرون ملک کے طلبہ بھی بڑی تعداد میں یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس ادارے میں ملک کے تمام شہری داخلہ لے سکتے ہیں۔ قیام کے اول روز سے ہی اس ادارے نے ملک کے تمام شہریوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھے۔ اس کے پہلے گریجویٹ ایک غیر مسلم ایشوری پرشاد تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ امتیاز بھی اہمیت کا حامل ہے کہ برصغیر میں سب سے پہلے قدیم وجدید کی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی اور یہ پہلی یونیورسٹی ہے جس نے دینی مدارس کے فارغین کے لئے بھی اپنے دروازے کھولے اور کچھ پابندیوں کے ساتھ مختلف کورسیز میں داخلے دیے۔ یہ ہندوستان میں مسلم اقلیتی کردار کی حامل یونیورسٹی ہے جہاں مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بہترین مواقع حاصل ہیں۔

22.6 ندوۃ العلماء

22.6.1 پس منظر اور قیام

انیسویں صدی کو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے فکری اور سیاسی تبدیلی کی صدی شمار کیا جاتا ہے۔ اسی صدی میں مسلمانوں کے اندر بہت سے قائدین پیدا ہوئے جنھوں نے ملت کی نیا پار لگانے کے لئے مختلف کام کئے۔ نہ صرف انہوں نے اسکول و کالج، مدارس و جامعات اور تکنیکی اداروں کی بنا ڈالی بلکہ، اقتصادی، معاشی اصلاحات، سماجی تبدیلیوں اور اصلاح معاشرہ کے لیے غیر سرکاری ادارے قائم کیے اور تحریکوں کی بنیاد ڈالی۔ اسی عہد میں مسلم قائدین اور علماء نے ملت کی رہنمائی اور ان کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے فکری کاوشیں کیں تحریک ندوۃ العلماء کا قیام بھی اسی فکری کاوش کی ایک کڑی ہے۔ دارالعلوم دیوبند اور ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام کے بعد مسلمان زعماء و قائدین اس بات کو شدت سے محسوس کرنے لگے تھے کہ دین و دنیا کی خلیج مزید وسعت اختیار کررہی ہے اور دونوں اداروں کے فارغین ایک دوسرے کے لئے اجنبی اور نامانوس ہوتے جارہے ہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ان اداروں کے فارغین ایک دوسرے کے لئے رقیب کی صورت میں سامنے آرہے ہیں۔ لہٰذا اس خلیج کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلم قائدین کا خیال تھا کہ اس خلیج کو پاٹنے کے لئے الگ سے ایک نئے ادارے کی ضرورت ہے جس میں ایک ایسے نصاب تعلیم کو رواج دیا جائے جس سے دین و دنیا کی خلیج اگر ختم نہ ہو سکے تو بہت حد تک کم ہو جائے۔ خوش قسمتی سے اس تحریک کا محرک اول علماء ہی بنے۔ مولانا محمد علی مونگیری اس تحریک کے بانی اور روح رواں تھے۔ انھیں کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے مسلم قائدین اور ارباب حل وعقد نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام و بنا میں تعاون کیا اس طرح اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔

ندوۃ العلماء کے قیام اور اس کی ضرورت و اہمیت کو نئے انداز میں مولانا محمد علی مونگیری نے پیش کیا تھا اور یہی اس کے محرک اول تھے لہٰذا انھوں نے ہی 1892 میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علماء کی ایک ایسی انجمن یا تحریک کی تجویز پیش کی جو قدیم وجدید کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو کم کرنے اور عصری تقاضوں کے مطابق مدارس اسلامیہ کا نصاب تیار کرنے میں معاون ہو۔ ان کی اس تجویز کو ارباب حل وعقد نے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور تعاون کی پیش کش کی۔ اپریل 1894 میں کانپور کے اسی مدرسے کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر مولانا مونگیری کے تخیل نے عملی شکل اختیار کی اور ندوۃ العلماء نام کی ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس تھا جس میں علماء دین اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ساتھ امراء و رؤسا اور ماہرین تعلیم نے بلا تفریق مسلک شرکت کی۔ اس انجمن کے لوگوں نے

مدارس کے نصاب میں اصلاح کی سفارش کی اور علماء کو جدید نصاب تعلیم کی اہمیت وافادیت سے علماء کو آگاہ کیا مگر علماء نصاب میں تبدیلی کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ انجمن کے کارکنان نے محسوس کیا کہ جب تک علماء کے سامنے کوئی متبادل پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک کامیابی کی امید نہیں کی جاسکتی لہٰذا مولانا مونگیری کی قیادت میں 12 محرم الحرام 1313ھ میں ایک اجلاس منعقد کیا گیا ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز پیش کی گئی جو سبھی کے دل کی آواز تھی لہٰذا یہ تجویز منظور ہوئی۔ اس کے بعد اس کا مسودہ تیار کر کے ملک کے ممتاز علماء اور ماہرین تعلیم کو بھیجا گیا اور ان سے رائیں طلب کی گئیں۔ اس تجویز کو علماء کے ایک بڑے طبقے نے انقلابی قدم قرار دیا۔ اب بانیان ندوۃ العلماء کے سامنے سوال یہ تھا کہ اس ادارے کو کہاں قائم کیا جائے چنانچہ میرٹھ میں منعقد ہونے والے ندوۃ العلماء کے چوتھے اجلاس شوال 1314ھ میں اس پر اظہار خیال کیا گیا جس میں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں میں سے کسی ایک جگہ پر ادارے کو قائم کرنے کی بات کہی گئی مگر 26 ستمبر 1898ء میں محلّہ گولہ گنج میں واقع خاتون منزل نامی عمارت میں آخری فیصلہ لکھنؤ کے حق میں ہوا اور ابتدائی درجات شروع کئے گئے۔ 4 اکتوبر کو بانیان ندوۃ العلماء نے عظیم الشان جلسہ کی شکل میں اس کی افتتاحی تقریب منعقد کی جس میں ممتاز اہل علم اور سربرآوردہ حضرات نے شرکت کی۔ اس طرح سے اس ادارے کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن یا تحریک ندوۃ العلماء کے سامنے جو عظیم تعلیمی منصوبہ تھا وہ ایک عمارت سے پورا ہوتا نہیں دکھائی دے رہا تھا چنانچہ الگ اور باقاعدہ بڑی عمارت کے لئے سرمایہ جمع کیا گیا اور اس کے ذمہ داروں نے حکومت سے گومتی ندی کے کنارے لکھنؤ یونیورسٹی سے ملحق زمین حاصل کی اور 1908 میں گورنر یوپی کے ہاتھوں افتتاحی رسم کے ذریعہ ایک نئے کیمپس کا آغاز کیا گیا۔ جب سے آج تک یہ ادارہ وہیں قائم ہے۔

22.6.2 ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد

اس ادارے اور تحریک کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے جدید علوم کو بھی نصاب کا حصہ بنایا ہے۔ تاریخ ندوۃ العلماء کے مصنف نے اس کے چار بنیادی مقاصد بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

1- علوم دینیہ کے نصاب میں دوررس اور بنیادی اصلاحات اور نئے نصاب کی تیاری۔

2- ایسے علماء پیدا کرنا جو رفع نزاع اور اتحاد ملی اور اخوت اسلامی کے جذبات کو فروغ دیں۔

3- علماء کو کتاب وسنت کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے واقف کرانا اور انھیں نبض شناس بنانا۔

4- اسلامی تعلیمات کی اشاعت اور برادران وطن کو اس کی خوبیوں سے روشناس کرانا۔

اس ادارے کی خاص بات یہ رہی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو مسلکی اختلافات سے الگ رکھا ہے۔ یہاں تمام مکتب فکر کے حامل طلبہ کو داخلہ کی اجازت ہے۔ ساتھ ہی یہاں پر اس طرح کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس میں ہر مکتب فکر اور مسلک سے تعلق رکھنے والے طلبہ اپنی استعداد کے مطابق دینی وعصری علوم حاصل کرسکیں۔ اس ادارہ کے منتظمین نے اصلاح نصاب کی طرف خصوصی توجہ دی ہے جو اس ادارے کے قیام کا ایک بنیادی مقصد تھا۔ قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کو بھی شامل نصاب کیا ہے۔ عربی ادب پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس موضوع پر بعض اہم کتابیں نیز انگریزی، سیاسیات، معاشیات اور تاریخ وجغرافیہ حسب ضرورت یہاں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس طرح دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے بنیادی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے قدیم وجدید کا ایک ایسا نصاب تیار کرنے کی کوشش کی جس سے ایسے علماء تیار کیے جاسکیں جو دینی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ جدید ضروریات سے بھی واقفیت رکھتے ہوں۔ مولانا شبلی نعمانی نے اس کی وضاحت ان لفظوں

میں کی ہے:

1۔ علماء کے اندر ایثار نفس پیدا کرنا۔

2۔ انگریزی داں علماء پیدا کرنا۔

3۔ مذاق حال کے موافق علماء کے گروہ میں مقررین اور ارباب قلم پیدا کرنا۔

4۔ ایسے علماء پیدا کرنا جو غیر مما لک میں اسلام کی اشاعت کرسکیں۔

22.6.3 دارالعلوم ندوۃ العلماء کا نصاب تعلیم:

ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیم کو جدید درجہ بندی کر کے اسے تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 1- درجہ ادنیٰ یا ابتدائی۔ اس کی تعلیمی مدت تین سال کی ہوتی ہے۔ 2- درجہ متوسط۔ اس کی تعلیمی مدت پانچ سالوں پر محیط ہے۔ 3- درجہ اعلیٰ- اس کی مدت تعلیم دو سال کی ہے۔ کل مدت تعلیم دس سالوں پر مشتمل ہے۔ انھیں دس سالوں میں قرآن، حدیث، فقہ، عقائد اور کلام کے ساتھ ساتھ انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات و معاشیات کی بھی تعلیم دے دی جاتی ہے تا کہ اس کے فارغین معاشرے میں اجنبیت محسوس نہ کریں۔ اس ادارے کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے ذمہ داران بوقت ضرورت حالات کے تقاضے کے تحت اصلاح پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔

22.6.4 دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مقام و مرتبہ:

ہندوستان کی دینی درسگاہوں میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مقام و مرتبہ کے تعین اور اس کے امتیازات کو بیان کرنے کے لئے یہی کافی ہے کہ اس ادارے میں دیگر جامعات کے مقابلے مختلف قسم کا نصاب تعلیم رائج ہے جو وقت اور حالات کے تقاضے کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ ادارہ اپنے قیام کے اول روز سے اصلاح نصاب کے لئے کوشاں ہے۔ اس کے فارغین نے برصغیر پاک و ہند میں اس مقصد کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس ادارے کی یہ خوبی بھی قابل ذکر ہے کہ اس پر مسلک کا لیبل نہیں لگایا جاسکا۔ اس کے دروازے سبھی مکتب فکر کے حامل طالب علموں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ اساتذہ کے تقرر میں مسلک سد راہ نہیں ہے۔

اس ادارے کے فارغین نے عصری جامعات کا رخ کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ان کے اندر مقابلے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ فارغین ندوۃ العلماء آج عصری جامعات میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں اور اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کر رہے ہیں جو بانیان دارالعلوم نے دیکھا تھا۔ ڈاکٹر سید احتشام نے بہت ہی واضح انداز میں ندوہ کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''ندوہ نے سب سے پہلے نصاب تعلیم بدلا۔ جدید علوم اسلامیہ کی نئی کتابوں کو درس میں شامل کیا اور ان فرسودہ کتابوں کو جو منطق اور فلسفۂ قدیم سے متعلق تھیں نصاب سے خارج کر دیا۔ انگریزی زبان معاشیات اور سیاسیات کے مضامین نصاب میں داخل کئے گئے اس طرح ندوہ نے روشن خیال علماء کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا جس نے آگے چل کر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے تعمیری مقصد کا اسلامی لٹریچر فراہم کیا۔''

22.7 جامعہ ملیہ اسلامیہ

22.7.1 پس منظر اور قیام

یہ ادارہ بھی وقت اور حالات نیز انگریز حکومت مخالف تحریک کے نتیجہ میں قائم ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہندوستان میں تحریک آزادی شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی اور ملک کے عوام حکومتی ظلم و جور کے خلاف متحد ہو چکے تھے۔ موہن داس کرم چند گاندھی جی کی قیادت میں تحریک عدم تعاون شروع ہو چکی تھی۔ اس تحریک کی بنیادی تعلیم یہ تھی کہ ملک کے عوام حکومت سے عدم تعاون کا برتاؤ کریں۔ سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کریں، ملازمت ترک کریں غرض ہر سطح پر حکومت مخالف رویہ اپنا کر یہ دباؤ بنائیں حکومت برطانیہ انھیں آزادی دے دے۔ علاوہ ازیں خلافت تحریک نے بھی عوامی تحریک چلا کر ملک کے عوام بالخصوص مسلم مزاج کو حکومت مخالف بنانے کی مہم شروع کر رکھی تھی تا کہ حکومت پر دباؤ بنا سکے کہ وہ خلافت ختم نہ کرے یا اس عمل کی معاون نہ ہو۔ اس ادارہ کے قیام کے محرک وہ طلبہ ہوئے جو خلافت کانفرنس اور تحریک عدم تعاون سے اتفاق رکھتے تھے۔ اس ادارے کے قیام میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو اس وقت تک کالج کا درجہ رکھتی تھی کی فضا کا بہت عمل دخل رہا تھا۔ یہاں کے طلبہ یونین ہال میں جلسہ کر کے تحریک آزادی، خلافت کانفرنس اور تحریک عدم تعاون سے اتفاق کر کے کالج کے ذمہ داروں پر یہ دباؤ بنانے لگے کہ اس ادارے کو بھی سرکاری سرپرستی سے آزاد کیا جائے۔ چنانچہ ان کی آواز اور تحریک کا اثر اور کالج کے ذمہ داران پر تو نہیں ہوا البتہ طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے اس کی حمایت کی اور ادارہ کو خیرباد کہہ دیا۔ ایسے ہی طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں چوٹی کے سرکردہ رہنماؤں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی تھی۔

اس ادارہ کا قیام 29 اکتوبر 1920 کو علی گڑھ میں کھلے آسمان کے نیچے قومی ادارہ کی شکل میں عمل میں آیا تھا، شیخ الہند واسیر مالٹا مولانا محمود حسن صاحب نے شدید علالت کے باوجود بذات خود علی گڑھ تشریف لا کر اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ جب کہ ان کا لکھا ہوا افتتاحی خطبہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا۔

یہ ادارہ پانچ سال تک علی گڑھ میں قائم رہا۔ خیموں میں اس کی تعلیم شروع ہوئی۔ شہر کے عوام اور قائدین و رہنماؤں نے اس کے اخراجات اور طعام کی ذمہ داری اٹھائی اور قومی رہنماؤں نے اس کی سرپرستی فرمائی۔ قومی رہنماؤں کے قید و بند ہونے اور دہلی سے دور ہونے کی وجہ سے اس کے انتظام اور دیکھ ریکھ میں دقتیں آنے لگی تھیں لہٰذا حکیم اجمل خاں حاذق الملک کے مشورے پر پانچ سال بعد 7 جولائی 1925 کو اس ادارے کو قرول باغ میں کرائے کی عمارتوں میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح سے یہ ادارہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوا۔ چھ سال تک یہ ادارہ کرائے کی عمارتوں میں چلتا رہا۔ 1931 میں اس کی پہلی عمارت اوکھلا گاؤں میں تعمیر ہوئی اور 1936 میں یہ ادارہ اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہوا۔ یہ عمارتیں آج کل جامعہ اسکول کے ہاسٹل کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔

1962ء میں جامعہ ملیہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی طرف سے ڈیمڈ یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور بالآخر آزادی کے بعد 1988 میں ہندوستانی پارلیامنٹ نے ایک ایکٹ کے ذریعہ اس کو مرکزی یونیورسٹی کا درجہ دیا۔ اس ادارے کے قیام میں جن قومی رہنماؤں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمود حسن شیخ الہند، موہن داس کرم چند گاندھی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا

ابوالکلام آزاد وغیرہم ۔ دہلی میں اس ادارہ کو زندگی نو دینے والوں میں ویسے تو بہت سے نام ہیں لیکن سرفہرست ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالمجید خواجہ، پروفیسر محمد مجیب، سید عابد حسین اور ان کے رفقاء کا کردار اہم رہا ہے ۔ اسی لئے ان لوگوں کا نام بھی بانیان جامعہ میں شمار کیا جاتا ہے ۔

22.7.2 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے اغراض ومقاصد

بانیان جامعہ نے اپنی پہلی مجلس تاسیسی کے وقت اس کے اغراض ومقاصد اور اس کی تعلیمی پالیسی بنائی تھی جس کی خاص باتیں یہ تھیں کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں سبھی مذاہب ومسالک کے طلبہ کو داخلہ دیا جائے گا ۔ ہر طالب علم کو اس کے اپنے مذہب کی تعلیم دی جائے گی ۔ مسلمان طلبہ کو عربی اور ہندو طلبہ کو سنسکرت سکھائی جائے گی ۔ ذریعہ تعلیم اردو ہوگا اور انگریزی کی تعلیم ثانوی زبان کی حیثیت سے دی جائے گی ۔ پیشہ ورانہ تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے گا ۔ دیگر صوبوں کے اسکولوں اور کالجوں کے الحاق کی کوشش بھی کی جائے گی وغیرہ ۔ جامعہ آج بھی بہت سی تبدیلیوں کے ساتھ اپنی ابتدائی پالیسی پر گامزن ہے ۔ یہاں جدید اور عصری تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کو لازمی مضمون کے طور پر پڑھایا جاتا ہے ۔ اس کے لئے تین مخصوص مضامین ہیں ۔ 1 ۔ انڈین ریلیجن اینڈ کلچر (IRC) 2 ۔ اسلامیات 3 ۔ ہندو ریلیجس اسٹڈیز (HRS) ان مضامین میں سے کوئی ایک مضمون طلبہ کو پڑھنا لازمی ہے ۔ اس ادارہ کا دوسرا انقلابی قدم ذریعہ تعلیم کا اردو ہونا ہے ۔ یہاں طلبہ کو اختیار ہے کہ وہ اپنا امتحان اردو، ہندی یا انگریزی میں سے کسی بھی زبان میں دے سکتے ہیں ۔ صنعت وحرفت کی تعلیم کے لئے تو اب باقاعدہ شعبہ قائم ہو چکا ہے جہاں طلبا اپنے ذوق کے مطابق صنعت وحرفت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں ۔ اس طرح سے یہ ادارہ ایک طرح تعلیمی جامعہ نہ ہوکر ماڈل ادارہ کی صورت میں ہم سب کے سامنے ہے ۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مکمل قومی تعلیمی ادارہ ہے ۔

22.7.3 جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ جات:

اس ادارہ میں کل آٹھ فیکلٹیاں ہیں جن میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے مثلاً قانون، تعلیم، سائنس، سوشل سائنس، انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز آرکیٹکچر اور ڈینٹسٹری ۔ ان فیکلٹیز کے مختلف شعبوں میں گریجویشن سے لے کر پی ایچ ڈی تک کی تعلیم ہوتی ہے ۔ علاوہ ازیں بیس سے زائد تعداد میں مطالعات کے مراکز (سینٹرس) قائم ہیں ۔ ان میں ماس کمیونی کیشن سینٹر، ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی آف انٹرنیشنل اسٹڈیز، ارجن سنگھ سینٹر فار ڈسٹینس اینڈ اوپن لرننگ، سینٹر فار کمپریٹو ریلیجس اینڈ سویلائزیشنز اور سنٹر فار یوروپین اینڈ لیٹن امیریکن اسٹڈیز خاص شہرت کے حامل ہیں ۔ اس کے علاوہ جامعہ کا خاص امتیاز یہ ہے کہ یہاں نرسری وابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ تحقیق تک کی تعلیم وتدریس کا انتظام ہے ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا یہ امتیاز بھی قابل ذکر ہے کہ یہ ادارہ اپنے قیام سے لے کر تا حال قومی دھارے میں شامل رہا اور اپنی جمہوری اور سیکولر روایات کو نہ صرف برقرار رکھنے میں بلکہ اس کی نشر واشاعت میں معاون بھی ہوا ۔ بانیان جامعہ نے جس خواب وخیال کے تحت اس ادارہ کو قائم کیا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمام طرح کی ابتلاء ومصیبت کو برداشت کرتے ہوئے اس کو عملی جامہ کا روپ دینے میں لگا ہوا ہے ۔ یہ ادارہ قومی رہنماؤں کی تحریک آزادی کا بین ثبوت ہے ۔

22.8 سنی بریلوی جماعت

22.8.1 قیام اور پس منظر

سنی بریلوی جماعت کا قیام بھی آزادی سے قبل عمل میں آیا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی (1856-1921) اس مکتب فکری کی تشکیل میں معاون و مددگار رہوئے اور آگے چل یہ جماعت ان کے نام اور شہر سے منسوب ہو کر بریلوی کہلائی۔ دیگر جماعتوں اور ان کے معاونین و ہمدردان کی طرح اس جماعت کے افکار کے حاملین کی تعداد برصغیر میں پہلے سے موجود تھی، انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے اس کی فکری و عملی تشکیل کر کے اسے الگ جماعت اور تحریک کا روپ دے دیا۔

اس کے قیام کا پس منظر بھی ہندوستان کے بدلے ہوئے سیاسی حالات ہیں۔ دیگر جماعتوں اور تحریکوں کے ارباب حل وعقد کی طرح اس جماعت اور فکر و خیال کے حامل علماء نے بھی ملت کی زبوں حالی دور کرنے اور مسلم عوام کو دین سے قریب کرنے نیز انھیں سیاسی وحدت میں پرونے کے لئے الگ جماعت کے قیام کو ضروری سمجھا اور اس کی تشکیل کی عملی کوشش کی۔ اس تحریک پر خاص فکر و رنگ کے غلبے کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے اس کی مخالفت کی لیکن علماء ہند کی یہ جماعت انگریز موافق پالیسی کے ضمن میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کے فکر و خیال سے بہت قریب تھی۔ چنانچہ دیگر جماعتوں نے اس پر مسلم مخالفت اور انگریز نواز ہونے کا الزام لگایا۔ باوجود اس کے کہ یہ جماعت بھی فقہ میں امام اعظم کی پیروکار رہے۔

بریلوی علماء کی جانب سے گرچہ یہ بات کہی جاتی ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا تک تمام ہندوستان میں اسی مکتب فکر کے پیروکار تھے اور 1825ء کے بعد مختلف مکاتب فکر اور مسالک نے جنم لینا شروع کیا۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ سنی بریلوی جماعت یا مکتب فکر کی تشکیل میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا رول سب سے اہم اور نمایاں ہے اور ایک مکتب فکر کے طور پر اسے متعارف کرانے والے وہی ہیں۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سنی بریلوی جماعت کی فکری و عملی تشکیل انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں عمل میں آئی۔

22.8.2 اغراض و مقاصد

اس جماعت کے اغراض و مقاصد میں وہی ہیں جو دیگر اسلامی جماعتوں کے ہیں یعنی مسلمانوں کو دین کی طرف راغب کرنا، غیر اسلامی رسوم و رواج سے انھیں روکنا۔ ملت کو ایک وحدت میں پرونا اور اسلام کو اس کے صحیح تناظر میں پیش کرنا اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی کے لئے کوشش کرنا وغیرہ۔ اس جماعت کے علماء بھی مسلمانوں کے زوال کے انھیں اسباب تک پہنچے جن کی نشان دہی دوسری جماعتوں نے کی تھی۔ چنانچہ اس کے حل کے لئے انھوں نے مختلف شناخت کے ساتھ عملی کوششیں شروع کیں۔ اس جماعت کے حاملین نے عشق رسول کو محور بنایا اور اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہوئے۔ باوجود دیگر مسلم جماعتوں کی مخالفت کے اس کے حاملین نے اپنے اغراض و مقاصد کو پیش نظر رکھا اور اس سے انحراف نہیں کیا۔

پروفیسر مسعود احمد نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے بعض امتیازات تحریر کیے ہیں جو آگے چل کر سنی بریلوی جماعت کے امتیازات

قرار پائے۔وہ لکھتے ہیں: محدث بریلوی اس بات کے قائل تھے کہ نبی آخر الزماں محمدؐ کے جو محامد و محاسن قرآن وحدیث میں بیان کئے گئے ہیں انہیں من وعن بیان کیا جائے۔وہ مجالس عید میلاد النبی کو جائز و مستحسن سمجھتے تھے اور محافل میلاد النبی میں قیام کو مستحب گردانتے تھے اور ان کے نزدیک فاتحہ خوانی جائز تھی بشرطیکہ اس میں کوئی خلاف شرع بات نہ ہو۔اس جماعت کے حاملین نے قیام کے اول روز سے تا حال اپنی اس خصوصیت کو بحال رکھا۔

22.8.3 سنی بریلوی جماعت کے عقائد

اس جماعت کے متبعین کا کہنا ہے کہ ان کے وہی عقائد ہیں جو صحابہ و تابعین کے تھے اور جس کو اللہ کے رسولؐ نے انھیں سکھلایا تھا۔ یٰسین اختر مصباحی نے لکھا ہے کہ عہد رسالت اور صحابہ و تابعین سے منقول و معمول جو عقائد و اعمال قدیم کتب تفسیر وحدیث وفقہ تصوف وسیرت و تاریخ میں موجود ہیں اہل سنت والجماعت (سنی بریلوی جماعت) کے وہی عقائد ہیں۔علما فرنگی محل لکھنؤ، خیر آباد، بدایوں و بریلی نے تحریر و تقریر کے ذریعہ ان ہی کی دعوت دی۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی تعلیمات و نظریات کے صحیح داعی و ترجمان بھی یہی ہیں۔یہ جماعت کسی جدید نظریے اور غیر اسلامی خیال کو ایک لمحہ بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے۔اپنی قدیم وراثت کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں اور اسے ہی اپنے اور دیگر مسلمانان عالم کا سرمایہ سعادت و ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔

الغرض اس جماعت کے متبعین اپنے فکر وخیال کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مشغول ہیں۔

22.8.4 سنی بریلوی جماعت کی کارکردگی

سنی بریلوی جماعت نے اپنے عقائد اور عملی کارکردگی کی نشر و اشاعت نہ صرف اپنے حلقوں میں بلکہ مسلمانوں کے دیگر مکتب فکر کے حلقوں میں بھی کی اور انھیں اپنی جماعت اور عقائد کا حصہ بنانے کے لئے ان لوگوں نے مدارس و مکاتیب اور دینی جامعات کے ساتھ عصری علوم کے ادارے اور تحقیقی مراکز قائم کئے۔مسجدوں کی تعمیرات میں حصہ لیا، جہاں سے وہ اپنے افکار کی اشاعت کا کام لیتے ہیں۔کتب خانوں اور اشاعتی اداروں کو قائم کیا۔مختلف زبانوں میں رسائل و جرائد کو شائع کیا اور کر رہے ہیں۔علاوہ ازیں دینی مدارس کے فارغ طلبہ کی تحصیل کے لئے عصری تقاضوں کے مطابق تربیتی اداروں کا قیام بھی اس جماعت کا خاصہ ہیں۔اس کے علاوہ اس جماعت کے فکر کے حاملین رفاہی و سماجی کاموں میں بھی لگے ہوئے ہیں۔ملت کی بقاو تحفظ کے لئے بھی اس جماعت کے افراد حتی المقدور کوشش میں لگے دکھائی دیتے ہیں۔دیگر جماعتوں کی طرح اس جماعت میں بھی شدت پسند اور معتدل افراد کی معتدبہ تعداد پائی جاتی ہے۔اس جماعت کے مدارس میں جامعہ ملیہ مصباح العلوم اشرفیہ مبارک پور قابل ذکر ہے۔علماء بریلوی نے کبھی بھی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی حمایت نہیں کی اور نہ ہی ایسے لوگوں سے اشتراک عمل کیا۔

22.9 جمعیۃ العلماء

22.9.1 جمعیۃ العلماء کا قیام اور پس منظر

بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے واقعات اس جماعت کے قیام کا اہم سبب ہیں۔یہ وہ وقت تھا جب مسلمان متحدہ ہندوستان میں

نہ صرف تحریک آزادی ہند میں شامل ہو کر قربانیاں پیش کر رہے تھے اور انگریزوں کے ظلم و جور کے خلاف کلمۂ حق بلند کر رہے تھے بلکہ خلافت عثمانیہ کی بقا کے لئے خلافت موومنٹ کی شکل میں ایک تحریک بھی چلا رہے تھے اور برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ حکومت اس بات کو یقینی بنائے کہ ترکی میں خلافت کو ختم نہ کیا جائے گا۔ خلافت کے خاتمہ کے لئے برطانوی حکومت نے جو پالیسی اپنائی تھی وہ بہت ہی دلخراش تھی۔ اسی نے عرب و حجاز اور افریقہ کے خطوں میں بغاوت کروائی تو یوروپ کے علاقوں میں اتحادی فوجوں نے خود قبضہ کر لیا اور پہلی جنگ عظیم میں ایک وقت ایسا آیا کہ خود ترکی مرکز خلافت بھی دشمنوں کے قبضے میں آ گیا۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے حالات بھی کوئی بہت بہتر نہیں تھے۔ انگریزوں کی چکی میں برادران وطن کے ساتھ مسلمان بھی مشق ستم بنے ہوئے تھے اور سونے پہ سہاگا کہ اس حکومت نے ہندو مسلم مسئلہ بھی پیدا کر دیا تھا جس کے تحت فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ہندوستان سے لے کر ترکی تک اور کاشغر سے لے کر اسپین کے ساحلوں تک تمام عالم اسلام دشمنوں کے مکر کی زد میں آ گیا اور یہ حالت ہو گئی کہ مسلمانوں کی نہ تو جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ تھی اور نہ ہی اسلامی آثار و اقدار۔ ایسے ہی ماحول اور حالات میں ہندوستان کے علماء نے صرف علماء کی الگ جماعت کے قیام کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس کو قائم کیا تا کہ برصغیر میں مسلمانوں کے جان و مال، آثار و اقدار کی حفاظت کے ساتھ دین و شریعت کا احیا کیا جا سکے۔

اس جماعت کا قیام 1919ء میں دہلی میں ہوا۔ 22/نومبر 1919ء کو خلافت کانفرس دہلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والے 25 چوٹی کے علماء اس جماعت کے قیام کا محرک بنے۔ اس کے قائم کرنے کی تجویز مولانا ثناء اللہ امرتسری نے پیش کی اور دیگر علماء نے اس تجویز کی حمایت کی۔ چنانچہ اس طرح علماء کی ایک جماعت قائم ہوئی جس کے عارضی صدر مفتی کفایت اللہ صاحب ناظم مولانا احمد سعید دہلوی صاحب ہوئے۔ ایک سال بعد نومبر 1920ء امرتسر میں میں جمعیۃ العلماء کا باقاعدہ اجلاس ہوا جس کا انتظام مولانا ثناء اللہ امرتسری صاحب نے کیا تھا۔ اس اجلاس میں ذمہ داران کا باقاعدہ انتخاب ہوا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب صدر، مفتی کفایت اللہ صاحب نائب صدر اور مولانا احمد سعید دہلوی صاحب ناظم منتخب کئے گئے۔ لیکن شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے جلد ہی انتقال کے بعد مفتی کفایت اللہ نے قائم مقام صدر کی حیثیت سے ایک سال کام کیا اور پھر 21/ستمبر 1921 مجلس منتظمہ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ کے موقع پر وہ مستقل صدر منتخب کئے گئے اور اندازاً بیس سال تک عہدۂ صدارت کی ذمہ داری نبھائی۔ مفتی صاحب کے بعد مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید فخر الدین احمد اور مولانا سید اسعد مدنی، جمعیۃ العلماء کے صدر منتخب ہوئے۔

22.9.2 جمعیۃ العلماء کے اغراض و مقاصد

کسی بھی تنظیم اور جماعت کا ایک دستور ہوتا ہے جو اس تنظیم کے اغراض و مقاصد اور طریقۂ کار کا تعین کرتا ہے۔ اس جماعت کا بھی دستور ہے جس کی دفعہ 3 کے مطابق اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:

1- اسلام اور شعائر اسلام اور مسلمانوں کے مآثر و معابد کی حفاظت
2۔ مسلمانوں کے مذہبی، تعلیمی، تمدنی اور شہری حقوق کی تحصیل و حفاظت۔
3- مسلمانوں کی مذہبی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح
4- ایسے اداروں کا قیام جو مسلمانوں کی تعلیمی، تہذیبی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی کی ترقی و استحکام کا ذریعہ ہوں۔

5- اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انڈین یونین کے مختلف فرقوں کے درمیان میل جول پیدا کرنا اور اس کو مضبوط کرنا۔

6- علوم عربیہ کا احیا اور زمانہ حال کے مقتضیات کے مطابق نظام تعلیم کا اجرا۔

7- تعلیمات اسلامی کی نشر و اشاعت

8- اسلامی اوقاف کی تنظیم و حفاظت

انھیں اغراض و مقاصد کے تحت اس کے ذمہ داران نے لائحہ عمل متعین کیا اور مختلف شعبہ جات قائم کئے جو درج ذیل ہیں:

1- دینی تعلیم کا شعبہ

2- دنیاوی تعلیم کا شعبہ

3- دینی حلقے

4- سماجی خدمات

5- اقتصادی حلقے

6- دار المطالعہ وغیرہ

یہ چند شعبے ہیں جن کے تحت اس جماعت کے افراد نے کام کرنا شروع کیا تھا لیکن حالات و تقاضے کے تحت مزید اس میں وسعت دی گئی ہے جس کی گنجائش بہر حال دستور میں موجود ہے۔

22.9.3 جمعیۃ العلماء کا نظام

کوئی بھی جماعت یا تنظیم ایک نظام ترکیبی کے تحت چلتی ہے جو اس کے نصب العین کو بروئے کار لانے میں معاون و مددگار ہوتی ہے۔ اس جماعت کا بھی ایک نظام ترکیبی ہے۔ وہ یہ ہے:

1- ہر مسلمان بالغ (مرد و عورت) اس کا ممبر بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اس جماعت کے مقاصد سے پوری طرح اتفاق رکھتا ہو۔

2- اس جماعت کی بھی ممبر فیس ہوگی (وقت اور حالات کے تحت اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے)

3- اس جماعت کی ہر یونٹ کا ٹرم اس تاریخ سے شروع ہوگا جب انتخاب کے بعد نیا صدر چارج لے گا۔ یہ ٹرم دو سال کا ہوگا۔ ممبر سازی ہر ٹرم کے بعد شروع ہوا کرے گی جس کی مدت مجلس عاملہ طے کرے گی۔

اس نظام ترکیبی میں مختلف یونٹیں اہمیت کی حامل ہیں، وہ یہ ہیں:

1- مقامی جمعیۃ

2- شہری جمعیۃ

3- ضلعی جمعیۃ

4- علاقائی جمعیۃ

5- ریاستی جمعیۃ

تمام جماعتوں یا یونٹوں کا انتخاب دو سالہ ہوتا ہے، یہ مقامی جماعتیں ریونٹیں حسب ذیل طریقہ سے کام کرنے کی مجاز ہیں۔

صدر، نائب صدر، خازن، ناظم عمومی، علاوہ ازیں مجلس عاملہ اپنی ضرورت کے مطابق نظماء کی تعداد میں اضافہ کرنے کی مجاز ہے۔تمام ذمہ دار انتخاب کے ذریعہ منتخب کئے جاتے ہیں۔ذمہ داران کا انتخاب مجلس منتظمہ میں سے ہی کیا جاتا ہے۔مقامی جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ عہدیداران کے علاوہ چھ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے اور اگر ابتدائی ممبران کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے تو مجلس عاملہ آٹھ ارکان پر مشتمل ہوگی۔

22.9.4 جمعیۃ العلماء کی کارکردگی

ایسے تو جمعیۃ العلماء ہند علماء دین کی ایک جماعت کا نام ہے جنھوں نے اپنا دائرہ کار تعلیم و تعلم، دین کی نشر و اشاعت، اسلامی اقدار اور معابد و مآثر کی حفاظت نیز خدمت خلق کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا ہے لیکن یہ جماعت اور اس کے ارکان اور ہمدردان نے اپنے قیام کے اول دن سے سیاسی امور اور ملک و ملت کے دیگر معاملات سے دست کشی نہیں کی اور آگے بڑھ کر اس میں حصہ لیا۔اس جماعت کے سیاسی اغراض و مقاصد نہیں تھے لیکن حالات کے تقاضے کے تحت سیاست میں قدم رکھا اور برادران وطن کے ساتھ نہ صرف ملک کی خدمت کی بلکہ ملت کے دفاع کے فرائض بھی انجام دیے۔اس جماعت کے ذمہ داروں نے ترک موالات تحریک کی حمایت کی، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا۔نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔آزادیٔ ہند کے لئے کانگریس کا ساتھ دیا۔تقسیم کی مخالفت، ملکی دستور کو سیکولر بنانے کی حمایت کی۔اردو زبان کے مسئلہ کو زور و شور سے اٹھایا، فرقہ وارانہ فسادات اور ان کی روک تھام، فسادات متاثرین کی مدد اور ان کی باز آباد کاری کے لئے کام کیا۔مسلم پرسنل لاء کا دفاع اور دینی تعلیم کے فروغ کے لئے ادارے قائم کئے۔مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے لئے کوششیں کیں۔تعلیم و تبلیغ کے لئے اداروں کو قائم کرنا۔نظام امارت شرعیہ کی تشکیل کرنا وغیرہ ایسے کام ہیں جس کو اس جماعت نے بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔آج کل یہ جماعت دہشت گردی کے فرضی مقدمات کا سامنا کرنے والے مسلم نوجوانوں کو قانونی امداد مہیا کر رہی ہے۔علاوہ ازیں دہلی اور اس کے نواح میں بند پڑی مساجد کی تحویل کی بھی ایک عوامی تحریک چلا رہی ہے۔جدید تعلیم کی طرف بھی اس جماعت نے خصوصی توجہ دی ہے اور کئی ایک ادارے قائم کئے ہیں۔اس کے علاوہ دیگر ملی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے۔اس جماعت نے نہ صرف ہندی مسلمانوں کے مسائل پر توجہ دی بلکہ عالم اسلام کے مسائل کو بھی سرفہرست رکھا اور جو کچھ بن پڑا اس کے حل کرنے میں معاون ہوئی۔یہ بھی ایک بڑا کام ہے کہ عالم اسلام کے مسائل کو اپنے آرگن کے ذریعہ ہندی مسلمانوں تک پہنچایا۔

22.9.5 جمعیۃ العلماء کی انفرادیت

- اس جماعت کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ صرف علماء کی جماعت ہے۔
- دیگر مسلک کے علماء کے لئے بھی اس کے دروازے کھلے ہیں۔
- خالص دینی اور ملی جماعت ہونے کے باوجود اس جماعت نے ملت کی بقا، اس کے مآثر و معابد کی حفاظت اور دین کی نشر و اشاعت کے لئے قومی سیاسی جماعتوں سے بھی ربط و ضبط رکھا۔
- یہ ہندی مسلمانوں کی واحد جماعت ہے جس نے آزادیٔ ہند کے لئے قومی جماعتوں کے ہم قدم فرائض انجام دیے۔

- یہ واحد جماعت ہے جس نے تقسیم ہند کی کھلی مخالفت کی۔
- اس جماعت نے دوقومی نظریہ کی سخت مخالف تھی۔
- اس جماعت نے متحدہ قومیت کی حمایت کی۔

جمعیۃ العلماء ہند اپنے قیام کے اول دور سے آج تک اپنے فرائض انجام دے رہی ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کے فکر و منہج میں مسلک کا پہلو غالب ہو چکا ہے۔ جہاں تک قومیت اور متحدہ قومیت کا مسئلہ ہے تو اس پر بہت کچھ لکھا اور بہت نقد و تجزیہ ہو چکا ہے، باوجود اس کے یہ جماعت آج بھی اپنے موقف پر قائم ہے۔ دیگر مسلم جماعتوں کی طرح علماء ہند کی یہ جماعت قومی خدمت سے منحرف نہیں ہوئی اس وقت یہ جماعت اس وقت دو حصوں میں منقسم ہے۔

22.10 تبلیغی جماعت

22.10.1 تبلیغی جماعت کا قیام و پس منظر

تبلیغی جماعت اپنے آغاز سے لے کر اب تک آب و تاب کے ساتھ رواں دواں ہے۔ اس جماعت کے مشن میں نہ ہی کمی آتی ہے اور نہ ہی اجتماعی ولولہ کم ہوا ہے۔ بانی جماعت نے جس خلوص نیت سے تبلیغ دین کا کام شروع کیا تھا اللہ نے اس میں بہت برکت دی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر سے بستی حضرت نظام الدین سے جو کام شروع کیا گیا تھا وہ آج تمام دنیا میں مشن کی حیثیت سے مسلمانوں نے اختیار کر لیا ہے، جس میں خود کفالتی مدد کے ساتھ لوگ شامل ہیں۔ آج اس جماعت کی مختلف انفرادی پہچان ہے۔ لوگ اس پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ نصاب کے حصہ کے طور پر اس کو پڑھا رہے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے وقت کی سب سے بڑی جماعت صرف ایک امیر کے ماتحت کیسے رواں دواں ہے۔ جس کا نہ تو کوئی باقاعدہ دفتر ہے اور نہ کوئی ممبر اور ممبر بننے کی فیس۔ پھر بھی اس جماعت کی مقبولیت میں کوئی کمی نہیں آئی۔

تبلیغی جماعت کے قیام کا حتمی تعین مشکل ہے کب اور کس تاریخ کو اور کہاں اس کا قیام ہوا تاریخ میں اس کی وضاحت نہیں ملتی اور نہ ہی جماعت کے ہمدردوں نے اس کی طرف توجہ کی۔ یہ جماعت ایک خاص وقت اور مخصوص علاقے کے حالات کے تحت شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ پوری دنیا میں پھیل گئی۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی دہے میں بستی حضرت نظام الدین میں کسی وقت اس جماعت کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب تھے جو شمالی ہند کے مشہور اور تاریخی مدرسہ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں انھوں نے بحیثیت مدرس کچھ دنوں تک معلّمی کے فرائض بھی انجام دیے تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کو تبلیغی جماعت کے قیام کا خیال اس وقت آیا جب وہ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسہ، جو بستی حضرت نظام الدین میں تھا، کے ذمہ دار ہوئے۔ اس کے ابتدائی محرک وہ لوگ بنے جو میواتی قوم کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ بقول مولانا وحید الدین خان صاحب:

> ''بستی نظام الدین عین میوات کے دہانے پر واقع تھی اور یہاں کے مدرسے میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے اس کے ساتھ مولانا محمد الیاس صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند ہو گئے تھے وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی افسوس ناک حالت دیکھی تو ان کے اندر

اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ فطری طور پر آپ کا ذہن ابتداً اس طرف گیا کہ ان کی اصلاح کا حقیقی ذریعہ دینی تعلیم کا حصول ہے (اس سبب سے) آپ نے خود میوات کے اپنے علاقے میں دینی مکاتب و مدارس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔''

دینی مکاتب و مدارس بھی قائم کیے گئے جانباز مگر جاہل اور سرکش میو قوم میں دینی تبدیلی کے آثار نہ دیکھ کر ایک عوامی دینی تحریک کی ابتدا کی جو میو قوم کے لئے غیر مانوس تھی مگر مولانا الیاس کی محنت لگن اور خلوص نیت نے میواتیوں کی قسمت بدل دی اور ان کے اندر دین کا ایسا جذبہ بھر دیا کہ لوگ تبلیغ دین میں جانباز اور سرکش قوم کی تقلید کرنے لگے۔

جس زمانے میں مولانا الیاس صاحب نے تبلیغی مشن تحریک کی صورت میں شروع کیا تھا اس وقت علاقہ میوات اور قوم میو، جو کہ مسلمان تھے، کی صورتحال بہت ابتر تھی۔ ان کے اندر نہ تو دینی تعلیم اور شعور تھا نہ ہی دنیاوی علم کے حصول کا جذبہ۔ وہ صرف نام کے مسلمان تھے اور سارے کے سارے کام ہندوانہ کرتے تھے۔ ان کو نماز روزہ سے غایت تھی اور نہ ہی کلمہ یاد تھا۔ چوری، ڈکیتی، رہزنی ان کے یہاں عام تھی۔ مسجدیں خال خال نظر آتی تھیں مگر پوجا کی رسم با قاعدگی سے ادا کرتے تھے۔ بقول میجر پاولٹ:

> ''میو اپنے عقائد میں آدھے ہندو ہیں ان کے گاؤں میں شاذ و نادر ہی مسجد ہوتی ہے۔ تحصیل تجارہ میں میوؤں کے باون گاؤں ہیں جن میں صرف آٹھ مسجدیں ہیں البتہ مندروں کو چھوڑ کر میوؤں کی عبادت کی ویسی ہی جگہیں بنی ہوتی ہیں جیسی ان کے ہمسایہ ہندوؤں کے یہاں ہوتی ہیں۔ مثلاً پانچ پھیرا۔ بھینسا چاہنڈ اور چاہنڈ یا کھیڑا دیو مہادیوی کے نام سے ہوتا ہے۔ جس میں قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ شب برات میں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا بھی ہر گاؤں میں پوجا جاتا ہے۔''

تعجب خیز بات یہ ہے کہ دہلی تعلیم و تربیت کا مرکز ہونے کے باوجود بھی اس کا نواحی علاقہ اور خطہ تعلیم اور دین اسلام کی منور شعاعوں سے محروم ہو گیا تھا۔ اس سے اس زمانے کے علماء و صلحاء کی تبلیغی کاوشوں اور ان کی بے حسی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایسے علاقہ و خطہ کے درمیان مولانا الیاس صاحب نے اپنے تبلیغی مشن کو تن تنہا شروع کیا تھا جو آگے چل تناور درخت کی شکل اختیار کر گیا۔

اپنے کام کی ابتدا میں مولانا محمد الیاس نے مسلمانوں کے اندر دینی تعلیم کے فروغ کے ذریعے ان کے اصلاح کی کوشش کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے دہلی میں واقع اپنے مدرسے کے علاوہ میوات کے علاقے میں بہت سے دینی مکتب قائم کیے لیکن وہ جس طرح کی ہمہ گیر تبدیلی اور اصلاح کے خواہاں تھے وہ ان مکاتب سے پوری نہ ہوتی تھی۔ لہذا انہوں نے عام لوگوں کو ان کے اپنے ماحول اور گھروں سے دور لے جا کر خالص دینی ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت کا بیڑہ اٹھایا۔ قصبہ نوح اور اطراف کے علاقے میں جمعہ کو اجتماع کر کے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں گشت اور دین کی تعلیم کے لیے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں پہنچنے لگے۔ مولانا کی یہ تدبیر بہت کامیاب رہی اور بہت جلد تبلیغ کا کام میوات کے علاقے سے نکل کر باہر بھی پھیلنے لگا۔ دہلی میں واقع مولانا الیاس کا مدرسہ اس تحریک کا مرکز بن گیا اور آج صورت حال یہ ہے کہ مدرسہ کے بجائے بنگلہ والی مسجد تبلیغی مرکز کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا الیاس کے بعد ان کے بیٹے مولانا محمد یوسف صاحب تبلیغی جماعت کے امیر ہوئے۔ انہیں کے زمانے میں تبلیغی جماعت کو ملک گیر بلکہ عالم گیر حیثیت حاصل ہوئی۔ تبلیغی جماعت کے تیسرے امیر مولانا انعام الحسن کاندھلوی ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد کسی ایک فرد کو تبلیغی جماعت کا امیر بنانے کے بجائے اس

کے کام کو تین افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا اور اب یہی کمیٹی تمام تر تبلیغی سرگرمیوں کی نگرانی اور سرپرستی کرتی ہے۔

22.10.2 تبلیغی جماعت کے اغراض و مقاصد

تبلیغی جماعت کے اغراض و مقاصد میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اندر صحیح دینی شعور اور جذبہ پیدا کیا جائے اور انھیں مکمل اسلامی نظام حیات کے تحت زندگی گزارنے والا مسلمان بنایا جائے۔اس جماعت نے جن خطوط پر کام کیا وہ یہ تھا کہ مسلمان خواہشات نفسانی سے اجتناب کریں۔اپنے مزاج کو اسلام کے مطابق بنائیں۔اپنے اندرون میں تبدیلی لائیں۔ایک امت کی طرح ہم آہنگی کے ساتھ رہیں، ذات اور شخصیت کے بجائے اعمال و اخلاق کو بنیاد بنائیں۔زندگی کے پورے نظام میں تبدیلی لائیں۔کلمہ اسلام کو دلوں میں بٹھائیں۔نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کریں۔دین کا علم سیکھیں اور سکھلائیں وغیرہ۔

اپنے ان بیان کردہ مقاصد کے حصول کے لیے تبلیغی جماعت کے رہنماؤں نے چھ بنیادی اصول مقرر کیے ہیں، جن پر گامزن رہ کر دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی مل سکتی ہے۔

1۔ کلمہ کی تصحیح و تلقین یعنی سب سے پہلے کلمہ کے الفاظ درست کیے جائیں اور ایمان باللہ والرسول کی حقیقت بتائی جائے۔

2۔ نماز کی تصحیح و ترقی یعنی نماز کو اللہ کے رسول اور صحابہ کرام جیسی نماز بنانے کی کوشش کی جائے اور اس کا خصوصی اہتمام کیا جائے۔

3۔ علم کی تحصیل اور ذکر یعنی یہ معلوم کیا جائے کہ اللہ ہم سے کیا چاہتا ہے اور پھر خود کو اس عمل میں لگا دیا جائے۔

4۔ اکرام مسلم یعنی اللہ کے رسولﷺ کا امتی ہونے کے ناطے ہر مسلمان ہمارے حسن سلوک کا مستحق ہے۔

5۔ اخلاص نیت یعنی ہر عمل کے پیش نظر اللہ کی رضا جوئی ہے۔

6۔ وقت کی تفریغ یعنی مذکورہ چیزیں دوسرے مسلمانوں کی بھی درست کی جائیں۔اس کے لیے اپنا وقت نکالا جائے۔

22.10.3 جماعت کی انفرادیت

تبلیغی جماعت اپنے آغاز سے لے کر تا حال اپنے مقصد سے غافل نہیں ہوئی اور نہ ہی اس جماعت نے دنیاوی دستور کے اعتبار سے کاغذی اور دفتری کاموں میں اپنے آپ کو مشغول کیا۔اس کی انفرادیت یہ ہے کہ اس کا کوئی دستور نہیں ہے۔اس جماعت کے لوگ قرآن و شریعت کو دستور مانتے ہیں۔جماعت میں شامل افراد وقت کے ساتھ خود خرچ کرتے ہیں، جماعت اس کام میں ان کی ذمہ دار نہیں ہوتی۔اس کی کوئی باقاعدہ ہیڈ آفس نہیں ہے۔وہی بنگلہ والی مسجد جو حضرت نظام الدین میں واقع ہے ہیڈ آفس کہلاتا ہے۔تبلیغی مشن منظم طور پر دنیا بھر میں جاری ہے اور وہ دہلی آفس اور امیر جماعت کے احکامات کا پابند ہے۔پوری جماعت ایک امیر کے ماتحت کام کرتی ہے،اہم بات یہ ہے کہ تبلیغی مشن صرف دین و شریعت اور عبادات تک محدود ہے۔جماعت کے اکابر فقہ میں حنفی مسلک کی پیروی کرنے کے باوجود بھی مسلکی تشدد سے دور ہیں۔اس کے دروازے تمام مسلمانوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔یہی انفرادیت اس کو دیگر جماعتوں سے ممتاز کرتی ہے۔

22.10.4 تبلیغی جماعت کی کارکردگی

تبلیغی جماعت کے افراد نے دعوت دین کے لئے مختلف طریقوں کو اپنایا ہے۔ان لوگوں نے مسجدوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ گشت اور اجتماعات کا اہتمام کیا۔چلّے کے لئے خود کو وقف کیا۔خواتین میں تبلیغی کام کیا،طلبہ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی۔اجتماعات منعقد کئے، بیرون ممالک خاص کر حجاز اور اس کے نواح میں تبلیغی وفود بھیجے۔اس طرح سے اس جماعت میں شامل افراد نے دین کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا اور کر رہے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے کام اور مشن کا غائر جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر فرد اور جماعت میں کچھ خوبیاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں۔یہی بات تبلیغی جماعت کے سلسلے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس جماعت کے افراد خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ اپنی نیتوں میں خالص ہیں۔یہ ان کی خالص اور بے لوث نیت کا ہی ثمرہ ہے کہ اس کی آواز پر ہزاروں افراد تن من دھن سے اس کے مشن سے جڑ جاتے ہیں۔اگر مابعد آنے والی کمزوریوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس جماعت کی کارکردگی قابل ستائش ہے۔ اس جماعت کی سب سے بڑی کامیابی یہ کہ اس میں مختلف رنگ و نسل کے لوگ جن کی بولیاں، لباس سبھی مختلف ہیں اور بوڑھے جوان، علماء صلحا، فضلا سبھی شامل ہیں،اس کے مشن اور کام سے اتفاق رکھتے ہیں۔

22.11 جماعت اسلامی

22.11.1 جماعت اسلامی کا قیام اور پس منظر

جماعت اسلامی کا قیام 25 اگست 1941 کو لاہور میں ہوا۔اس جماعت یا تحریک کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔جس عہد میں اس جماعت کا قیام عمل میں آیا وہ ہندوستان کا پر آشوب عہد تھا۔انگریز یہاں کے حکمراں تھے۔ہندوستانیوں نے آزادی کی تحریک شروع کر رکھی تھی جس میں ہندو مسلم سبھی شامل تھے۔دوسری عالمی جنگ بھی اپنے عروج پر تھی جس میں یہاں کی عوام کی مرضی کے خلاف ہندوستان بھی شامل تھا۔مغل حکومت کا خاتمہ قصہ پارینہ بن چلا تھا مگر ریاستوں کی شکل میں اس کے باقیات ابھی باقی تھے جس میں نہ کوئی دم خم تھا اور نہ ہی حکومتی شعور۔یہ ریاستیں انگریزوں کے رحم و کرم پر باقی تھیں۔جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ان کی پستی اور زبوں حالی کا عالم یہ تھا کہ ان میں نہ تو دینی شعور باقی تھا اور نہ ہی دنیاوی جاہ و عظمت کے حصول کا عزم۔یہ قوم بس زندگی جیسی تیسی گزار رہی تھی۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزوں کے ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کے بعد بھی مختلف مسلم ریاستوں نے کوئی قابل ذکر ایسا ادارہ نہیں قائم کیا جس کے فارغین کسی میدان میں ناموری پیدا کر سکتے جب کہ انگریز اسکول و کالج اور جامعات کو قائم کرنے میں پیش پیش تھے۔مسلمانوں کی طرف سے صرف چند انفرادی کوششیں کی گئی تھیں جن کے بار آور ہونے میں ابھی وقت درکار تھا۔مذہبی تعلیم کا معاملہ بھی روایتوں میں لپٹا ہوا تھا اور ان اداروں کے علماء اور اساتذہ جدید تبدیلیوں سے اس قدر بے خبر اور وحشت زدہ تھے کہ وہ اس بات کا تجزیہ نہیں کر سکتے تھے کہ کون سی شئے قومی مفاد کے لئے بہتر ہے اور کس میں خرابی ہے۔اس کے اثرات آج بھی ان تعلیمی اداروں میں باقی ہیں۔ایسی ہی فضا میں اس جماعت کو قائم کیا گیا تھا۔

1941ء میں جماعت اسلامی کے قیام اور اس سے پہلے حالات کا اگر ہم جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہندوستان ہی نہیں دنیا

کے بیش تر علاقے انگریزوں کی سیاسی غلامی اور حکومت میں تھے۔علمی اور فکری میدانوں پر بھی انہیں کی بالادستی قائم تھی،مسلم دنیا کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔1924ء میں خلافت کا ادارہ بھی ختم ہو گیا تھا،مسلمان نہ صرف انتشار اور پریشان حالی سے دوچار تھے بلکہ وہ بھی پورے طور پر انگریزوں کی سیاسی وفکری غلامی کا حصہ بن چکے تھے۔ان حالات میں ملت اسلامیہ کو جن لوگوں نے زوال سے نکالنے اور اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش کی ان میں ایک اہم نام مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی ہے۔انہوں نے اپنی تحریک کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام 1932ء میں اپنے رسالے ترجمان القرآن کے ذریعہ شروع کیا اور ترجمان القرآن میں شائع ہونے والی تحریریں ہی آگے چل کر جماعت اسلامی کے قیام کی بنیاد بنیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یکم شعبان 1360 مطابق 25 اگست 1941 کو لاہور میں مختلف حلقوں کے نمائندوں کو جمع کیا اور انھیں جماعت اسلامی کے اغراض ومقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے ایک سنجیدہ جماعت کی تشکیل پر زور دیا۔اس اجلاس میں نمائندوں کی کل تعداد پچھتر تھی۔ان نمائندوں نے مولانا کے خیال سے اتفاق کیا اور جماعت اسلامی کی تشکیل کی اور انھیں کو امیر جماعت منتخب کیا اور ساتھ ہی ایک تحریری دستور بھی اتفاق رائے سے منظور کیا۔اس طرح سے جماعت اسلامی کی تشکیل عمل میں آئی۔پہلے اجلاس میں جماعت کی تشکیل کے سلسلے انھوں نے جو خطاب کیا وہ یہ تھا:

> ''میرا کام آپ کو جماعت بنا دینے کے بعد پورا ہو جاتا ہے میں صرف ایک داعی تھا۔بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری تمام مساعی کی غایت یہ تھی کہ ایک نظام جماعت بن جائے۔جماعت بن جانے کے بعد میں آپ میں کا ایک فرد ہوں اب یہ جماعت کا کام ہے کہ وہ اپنے میں سے کسی اہل تر آدمی کو اپنا امیر منتخب کرے اور پھر یہ اس کا کام ہے کہ آئندہ تحریک کو چلانے کے لئے اپنے صواب دید کے مطابق ایک پروگرام بنائے اور اسے عمل میں لائے۔''

> امیر جماعت منتخب ہونے کے بعد انھوں نے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''میں آپ کے درمیان نہ تو سب سے زیادہ علم رکھنے والا تھا،نہ سب سے زیادہ متقی،نہ کسی اور خصوصیت میں مجھے فضیلت حاصل تھی۔بہرحال آپ نے مجھ پر اعتماد کر کے اس کار عظیم کا بار میرے اوپر رکھ دیا ہے تو میں اب اللہ سے دعا کرتا ہوں اور آپ لوگ بھی دعا کریں کہ مجھے اس بار کو سنبھالنے کی قوت عطا فرمائے اور آپ کے اعتماد کو مایوسی میں تبدیل نہ ہونے دے۔''

پچھتر افراد کی یہ نفری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں امت کی رہنمائی کے لئے بے سروسامانی کے عالم میں کمربستہ ہوئی اور اپنے مشن پر رواں دواں ہوگئی۔اللہ نے ان کی نیت میں اتنی برکت دی کہ یہ جماعت برصغیر کی مسلم جماعتوں میں سے ایک بڑی جماعت شمار ہونے لگی جس کے اثرات نہ صرف برصغیر کے مسلمانوں پر پڑے بلکہ پوری دنیا اس سے متاثر ہوئی۔

جماعت اسلامی جب قائم ہوئی تو اس کا دائرہ کار(یعنی جن لوگوں کے درمیان یہ کام کرے گی)پوری دنیا کو قرار دیا گیا۔البتہ بہت جلد اس کے رہنماؤں کو یہ احساس ہو گیا کہ یہ چیزیں موجودہ حالات میں کسی بھی تنظیم کے لیے قابل عمل نہیں ہیں۔چنانچہ 1947ء میں ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ہی جماعت اسلامی بھی دو تنظیمی ڈھانچوں میں تقسیم ہوگئی۔پاکستان کا حصہ جماعت اسلامی پاکستان کہلایا اور مولانا مودودی اس

کے امیر رہے۔ ہندوستان میں رہ جانے والی جماعت اسلامی کے ارکان اپریل 1948ء میں اتر پردیش کے شہر الہ آباد میں یکجا ہوئے۔ انہوں نے اپنے تنظیمی ڈھانچہ کا نام جماعت اسلامی ہند رکھا اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کو اپنا امیر منتخب کیا۔ کچھ دنوں تک الہ آباد میں، پھر ملیح آباد میں اور بعد ازاں رامپور میں جماعت کے مرکزی دفاتر رہے۔ فی الحال جماعت اسلامی ہند کے مرکزی دفاتر ملک کی راج دھانی نئی دہلی میں ہیں۔ اور مولانا سید جلال الدین عمری اس کے امیر ہیں۔ ان سے پہلے مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کے علاوہ مولانا محمد یوسف صاحب، مولانا سراج الحسن صاحب اور ڈاکٹر عبدالحق انصاری جماعت اسلامی ہند کے امیر رہ چکے ہیں۔

22.11.2 جماعت اسلامی نصب العین اور طریق کار

جماعت اسلامی ہند کے دستور کی دفعہ 3 کے مطابق اسکا بنیادی عقیدہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ یعنی الہ صرف اللہ ہی ہے اس کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد (رسول اللہ صلی علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔

دستور جماعت اسلامی ہند کی دفعہ 4 کے مطابق:

'جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے، جس کا حقیقی محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول ہے۔ دستور جماعت اسلامی ہند کی دفعہ 5 کے مطابق اس کا طریق کار یہ ہے۔

اپنے نصب العین کے حصول کے لیے جماعت اسلامی ہند کا طریق کار حسب ذیل ہوگا:

1۔ قرآن وسنت جماعت کی اساس کار ہوں گی۔ دوسری ساری چیزیں ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھی جائیں گی جس حد تک قرآن وسنت کی رو سے ان کی گنجائش ہو۔

2۔ جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔

3۔ جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیر اور پرامن طریقے اختیار کرے گی۔ یعنی وہ تبلیغ وتلقین اور اشاعت افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی۔ اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔

22.11.3 جماعت اسلامی کے شعبہ جات

مذکورہ بالا اپنے مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لیے جماعت اسلامی نے اپنا ایک طریقہ کار ترتیب دیا تا کہ نہ صرف مسلم نوجوانوں کی تربیت اسلامی خطوط پر کی جاسکے بلکہ ان کے اندر اسلامی فکر کو پروان بھی چڑھایا جاسکے۔ اس کے لیے انہوں نے مختلف شعبہ جات قائم کیے جو حسب ذیل ہیں:

1- شعبۂ علمی و تعلیمی:

اس شعبہ کے تحت اسلام کے نظام فکر اور نظام حیات کا فلسفیانہ علمی و تاریخی پہلو سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔دوسرے نظام فکر و عمل پر تنقیدی و تحقیقی نگاہ ڈالی جاتی ہے اور اس کے نتیجہ میں ایسا اسلامی لٹریچر تیار کیا جاتا ہے جو اسلامی اصول پر ذہنی و فکری انقلاب برپا کرنے والا ہو۔اس شعبہ کے تحت اسکول و کالج کا قیام بھی ہے۔

2- شعبۂ نشر و اشاعت:

اس شعبہ کے تحت علمی و تعلیمی لٹریچر کو پھیلانے کا کام کیا جاتا ہے اور یہ شعبہ امیر جماعت کی نگرانی میں کام کرتا ہے۔

3- شعبۂ تنظیم جماعت:

اس کے تحت کارکنوں کی رہنمائی کرنا۔مقامی جماعتوں کی نگرانی کرنا۔ذیلی مقامی جماعت قائم کرنا اور ہم خیال جماعتوں اور افراد سے ربط پیدا کرنا شامل ہے۔

4- شعبۂ مالیات:

اس کے تحت مرکزی بیت المال کا قیام ہے نیز مقامی جماعتوں کے ذریعہ بھی بیت المال کے نظام کو قائم اور رواج دینا ہے۔

5- شعبۂ دعوت و تبلیغ:

اس شعبہ کے ذریعہ مختلف میدانوں میں دعوت و تبلیغ دین کرنا ہے یہ جماعت کا سب سے اہم شعبہ تسلیم کیا گیا ہے۔اس شعبہ کے دائرہ کار کے تحت آٹھ حلقوں کا تعین کیا گیا ہے۔

1- کالجوں اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا حلقہ

2- علما اور مدارس عربیہ کا حلقہ

3- صوفیا اور مشائخ طریقت کا حلقہ

4- سیاسی جماعتوں کا حلقہ

5- شہری عوام کا حلقہ

6- دیہاتی عوام کا حلقہ

7- عورتوں کا حلقہ

8- غیر مسلموں کا حلقہ

یہ شعبہ جات جماعت اسلامی کی بنیاد ہیں۔انھیں شعبوں کے ذریعہ سے مولانا مودودی اور ان کے رفقاء نے فکری انقلاب کا خواب دیکھا تھا۔

22.11.4 جماعت اسلامی کی کارکردگی

اپنے قیام کے وقت سے ہی جماعت اسلامی مذہبی و سماجی خدمات کے کاموں سے جڑی رہی ہے۔وآزادی کے وقت اور آزادی کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا، اسمیں جماعت اسلامی نے متاثرین کی امداد اور باز آبا کاری کے لیے بڑے پیانے پر کام کیا۔اسی طرح قدرتی آفات جیسے کہ سیلاب، طوفان وار زلزلہ سے متاثر ہونے والوں کے لیے بھی جماعت اسلامی امدادی کام کرتی

ہے۔جماعت اسلامی نے خدمت خلق کے شعبے کے تحت اپنی مقامی یونٹوں کے توسط سے بہت سارے رفاہی اور عاومی فلاح و بہبود کے کام بھی انجام دیے ہیں ۔ان میں اسکولوں، اسپتالوں اور غیر سودی امدادی قرضوں کا نظام قابل ذکر ہے۔

مذہبی خدمات کے حوالے سے جماعت اسلامی ہند نے ہندوستانی مسلمانوں کو ان کے مذہب اور ثقافت سے جوڑے رکھنے، ان میں صحیح اسلامی شعور بیدار کرنے اور مختلف قومی و ملی مسائل کو اسلامی تناظر میں دیکھنے کے لیے بڑے پیمانے پر خدمات انجام دی ہیں ۔مرکزی اور علاقائی سطح پر جماعت اسلامی نے متعدد اشاعتی ادارے قائم کیے ہیں اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں کے ساتھ ساتھ مختلف علاقائی زبانوں میں بھی اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام کرتے ہیں ۔اس سلسلے میں جماعت اسلامی کا سب سے بڑا کارنامہ ملک میں مختلف علاقائی زبانوں میں قرآن مجید کے ترجموں کی اشاعت ہے ۔قرآن مجید کے ترجموں کے علاوہ حدیث اور دیگر اسلامی ادب کے ترجمے بھی علاقائی زبانوں میں شائع ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے اندر ملکی اور عالمی مسائل کا شعور بیدار کرنے، اپنے دعوتی کاموں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لئے جماعت اسلامی ہند ملک کی مختلف زبانوں میں اخبارات و رسائل کی اشاعت کا کام بھی کرتی ہے ۔جماعت اسلامی ہند کے تحت ملک کے مختلف شہروں سے تقریباً بیس سے زائد اخبارات و رسائل مختلف زبانوں میں شائع ہوتے ہیں ۔ان کے علاوہ بھی جماعت اسلامی ہند مختلف قسم کے ملکی و ملی خدمات کے کاموں میں تنہا یا دیگر رفاہی و مذہبی تنظیموں کے ساتھ مل کر حصہ لیتی ہے۔

جماعت اسلامی نے ہندوستان میں اسلامی فکر کی احیاء میں جس طرح کی پالیسی اپنائی اس میں انفرادی ربط و ملاقات، اجتماعات اور خطاب عام، دارالمطالعے کا قیام، اسلامی لٹریچر کی اشاعت، مکتب و مدارس کا قیام، خواتین کی تربیت و اصلاح، غیر مسلموں میں دعوت اسلامی کا فروغ، مقامی قائدین سے ربط و تعلق رکھنا، رفاہی کام کرنا یعنی خدمت خلق، کالج و جامعات کا قیام اور طلبہ کی تنظیموں کا احیا وغیرہ اہم ہیں۔ جماعت اسلامی ہند نے تقسیم ہند کے بعد خود کو سیاست سے علیحدہ کرلیا تھا اور اپنے آپ کو خالص دینی و ملی کاموں کے لئے وقف کردیا تھا مگر حالات اور وقت کے تقاضے کے تحت انھوں نے اس پالیسی پر نظر ثانی کی اور دوبارہ سیاسی سرگرمیوں میں شامل ہونے لگی اور علیحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کی جو ابھی ابتدائی مرحلہ میں ہے ۔ان تمام ذیلی شعبہ جات کے تحت بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز کام کئے گئے جن کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر نمایاں دکھائی دیتے ہیں بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمان اس فکر کی حمایت کرتے ہیں۔

جماعت اسلامی اپنے فکری منہج کے اعتبار سے مسلمانوں میں جس طرح کا کام کرنا چاہتی تھی اس میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتی ہے ۔مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی جماعت کے ذریعہ اس حیثیت سے منفرد نظر آتے ہیں کہ انھوں نے نہ صرف اپنے اردگرد بلکہ برصغیر کے دور دراز علاقوں میں بھی ایسے لوگوں اور دانشوروں کو اکٹھا کرلیا تھا جن کی فکر میں نشو ونما کی صلاحیت باقی تھی اور جو ہر شے کو تنقید کی کسوٹی پر کستے تھے ۔اس ضمن میں مولانا مودودی کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے دین اسلام کو جدید دنیا کے سامنے نمونہ حیات بنا کر پیش کیا ۔ان کی اس فکر کو تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔

جماعت اسلامی کی فکر اور اس کی کارکردگی کے اعتبار سے اگر مولانا مودودی کا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا محض ایک شخص نہیں بلکہ ایک عہد ایک تاریخ ساز تھے اور برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے معمار اول ۔کیوں کہ ان سے پہلے جن لوگوں نے اس سلسلے کی کوششیں

کی تھیں وہ انفرادی تھیں۔ جماعت اسلامی نے ان کی فکر کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ مستقل اپنے مشن میں رواں دواں ہے۔

22.12 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند

22.12.1 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کا قیام و پس منظر

یہ جماعت بیسویں صدی کے پہلے دہے میں قائم ہوئی۔ اس کے قیام کے محرکات میں جہاں مسلک اہل حدیث کے متبعین کی شیرازہ بندی مقصود تھی وہیں امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ ہند کے درمیان غیر اسلامی رسوم و رواج، بدعات اور مشرکانہ رسموں پر بند باندھنے اور انھیں ختم کرنے کا عزم بھی شامل تھا۔ تاریخ اہل حدیث ہند کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس فکر کے حاملین کی معتد بہ تعداد ہمیشہ سے ہندوستان میں رہی ہے ملک کے جنوبی حصوں میں علماء اہل حدیث نے دین کی نشر و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ شمالی ہند میں بھی اہل حدیث علماء نے کافی دینی خدمات انجام دی ہیں مگر انھیں حکومت کی سرپرستی نصیب نہیں ہوئی اس لئے اس فکر کے حاملین کی کارکردگی دکھائی نہیں دیتی۔ اس فکر کے حاملین علماء نے بکھرے شہ پاروں کو ایک پلیٹ فارم دینے اور انھیں نئے آب و تاب کے ساتھ میدان عمل میں آنے کا موقع فراہم کرنے کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس طرح ایک خاص فکر کے تحت اس جماعت کو قائم کیا۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں بیان کیا جا چکا ہے کہ فکری سطح پر حاملین اہل الحدیث کی معتد بہ تعداد برصغیر میں پائی جاتی تھی مگر شیرازہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بکھرے ہوئے تھے اور اپنی سطح پر ملت کی دینی و دنیاوی رہنمائی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں جب بھی مکتب فکر کے علما نے اپنی اپنی جماعتیں اور پہچان بنائی تو اہل حدیث علماء نے بھی الگ جماعت کے قیام کو وقت کی ضرورت سمجھا اور اس کے قیام کی جدوجہد شروع کی۔ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے قیام کے محرک اول مولانا ثناء اللہ امرتسری تھے جنھوں نے 5 اکتوبر 1906 میں اپنے ہفت روزہ اخبار اہل حدیث میں اس کے قیام پر روز دیتے ہوئے اس کو وقت کی اہم ضرورت بتایا اور علماء اہل حدیث سے مؤدبانہ اپیل کی کہ اگر ان کی یہ آواز اور تحریک صحیح ہے تو آپ تمام لوگ اپنی آرا سے مطلع فرمائیں۔ چنانچہ اکابرین اہل حدیث علماء نے جو خود بھی اس ضرورت کو محسوس کر رہے تھے مولانا کی آواز پر لبیک کہا اور حمایت کا اعلان کیا چنانچہ دسمبر 1906 میں مدرسہ احمدیہ آرہ صوبہ بہار کے سالانہ جلسہ کے موقع پر اہل حدیث کانفرنس نام کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تاسیس عمل میں آئی۔ اس اجلاس میں ذمہ داران کا انتخاب بھی عمل میں آیا اور محدث عبداللہ غازی پوری اس کے صدر منتخب کئے گئے اور نظامت کی ذمہ داری تحریک کے محرک اول مولانا ثناءاللہ امرتسری کو دی گئی۔ اس طرح جمعیۃ اہل حدیث کا قیام عمل میں آیا۔ یہ جماعت اسی نام سے تقسیم ہند کے بعد بھی کام کرتی رہی۔ تقسیم ملک سے جب جماعتیں اور ادارے بھی تقسیم ہوگئے تو شناخت کے مسئلے نے سر ابھارا چنانچہ اکابرین جماعت نے 1977 میں دہلی اجلاس کے موقع پر اس کے نام کی تبدیلی کی تجویز پاس کی اور اس کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کا نام دیا۔ چنانچہ اس وقت سے تا حال اس نام سے یہ جماعت عملی میدان میں سرگرداں ہے۔

22.12.2 جمعیۃ اہل حدیث کے اغراض و مقاصد

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے اغراض و مقاصد ملت کی صحیح اسلامی خطوط پر دینی و دنیاوی رہنمائی مرکزی نقطہ کی حامل ہے۔ لیکن ان کے

یہاں توحید خالص پر زور دوسری جماعتوں سے انھیں ممتاز کرتا ہے۔جمعیۃ کے دستور اساسی کو بیان کرتے ہوئے دفعہ نمبر 5 کے تحت اس کے اغراض و مقاصد کو بیان کیا گیا ہے جو درج ذیل ہیں: 1-مسلمانوں کو توحید خالص کا شیدائی بنانے کے لئے تمام ممکنہ طریقہ اختیار کرنا۔ 2-بدعات اور رسوم قبیحہ کو حکمت کے ساتھ مٹانے اور سنتوں کو رائج کرنے اور باطل تحریکوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کرنا۔3-غیر مسلموں کے سامنے صحیح اسلامی تعلیمات پیش کرنا۔4-افراد اور ارکان جماعت کی صحیح اسلامی تربیت کرنا۔5-مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق قائم کرنا۔6-قانونی دائرہ میں رہتے ہوئے شرعی عدالتوں کا قیام۔7-مسلمانوں کے عائلی مسائل کے حل کے لئے دارالافتا کا قیام۔8-کتاب و سنت کی تعلیمات پر مبنی کتب و رسائل جاری کرنا۔9-کتاب و سنت اور مسلک اہل حدیث کے خلاف لکھی جانے والوں کتابوں اور تحریروں کا جائزہ لینا اور اس کی تردید کرنا اور اس مقصد کے لئے جماعت کے افراد کی تربیت کرنا۔10-جمعیۃ کے اغراض و مقاصد کے تعارف اور اس کے نصب العین کی تکمیل کے لئے اخبار و رسائل جاری کرنا اور جدید ذرائع ابلاغ کا استعمال کرنا۔11-ہر سطح پر جماعتی مدارس قائم کرنا اور ان کی ترقی و اصلاح کی سعی کرنا۔12-مسلم طلبہ و طالبات کی تعلیمی رہنمائی کرنا اور بوقت ضرورت تعاون دینا۔13-جماعتی مدارس و مکاتب کے لئے اسلامی نظریہ تعلیم پر مبنی معیاری نصاب تیار کرنا جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔14-نظام بیت المال کو فروغ دینا اور اس کے ذریعہ سے غریب اور مستحق افراد کی اعانت و امداد کرنا۔15-آمدنی کے وسائل کو بڑھانے کے لئے جدو جہد کرنا وغیرہ۔

22.12.3 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کا طریقہ کار

یہ جماعت اپنے اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے ایک مخصوص لائحہ عمل بھی رکھتی ہے اور اس سے سر مو انحراف کو بھی جائز و درست نہیں سمجھتی۔توحید خالص اور کتاب و سنت کے احکامات کے سلسلے میں اس کا موقف بہت سخت ہے۔مرکزی جمعیت اہل حدیث کے دستور اساسی کے دفعہ چھ کے تحت جمعیت کا طریقہ کار یہ ہے۔

1- ہر فیصلہ کتاب و سنت کی روشنی میں کیا جائے گا اور اس کی افہام و تفہیم کے لئے طریقہ سلف اور ان کے مفاہیم کو مقدم رکھا جائے۔

2- ملکی و ملی مسائل میں اپنے اعتصام بالکتاب والسنہ کے امتیاز کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی حکمت عملی، پالیسی اور طریقہ کار متعین کرنا یا معاصر مسلم تنظیموں کے ساتھ تعاون کرنا۔

3- جمعیت اپنے نصب العین اور اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے جو بھی ذرائع اور تدابیر اختیار کرے وہ کتاب و سنت کی روشنی میں ہوں۔

علاوہ ازیں جماعت کا ایک تنظیمی ڈھانچہ بھی ہے، جس کے مختلف مدارج ہیں۔ان میں سے ایک مرحلہ رکنیت کا بھی ہے۔اس کی رکنیت کے لئے شرط یہ ہے کہ کوئی بھی ہندوستانی شہری جو عاقل بالغ اور مسلمان ہو اور جمعیۃ اہل حدیث کے عقیدے اور نصب العین سے اتفاق رکھتا ہو اس کا رکن بن سکتا ہے۔رکن بننے کے بعد اس پر کئی طرح کی تنظیمی پابندیاں عائد ہوتی ہیں جس پر عمل درآمد اس شخص کے لئے ضروری ہے۔تنظیمی امور کو چلانے کے لئے اس جماعت کے افراد نے شورائی نظام کو اخذ کیا ہے باہمی مشورے سے تمام امور انجام دئے جاتے ہیں۔ذمہ داران جماعت صوبائی، ضلعی اور مقامی جماعتوں کے ساتھ طلبہ، خواتین اور نوجوانوں کی بھی ذیلی یونٹیں قائم کی ہیں تا کہ اغراض و مقاصد کی تکمیل میں سہولت ہو۔تمام ذیلی جماعتیں مرکزی امیر اور ناظم عمومی کے ماتحت کام کرتی ہیں۔

22.12.4 مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کی کارکردگی

مرکزی جماعت اہل حدیث اپنے قیام کے اول روز سے ملت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں لگی ہوئی ہے چنانچہ جماعتی سطح سے لے کر انفرادی سطح تک خدمت خلق کا کام انجام دیا جارہا ہے۔مثلاً دینی علوم کی ترویج واشاعت کے لئے مدارس اور جامعات قائم کرنا، اپنے فکرو منہج کی ترویج کے لئے اخبار و رسائل جاری کرنا۔رفاہی کاموں میں اسپتال اور ذیلی ڈسپنسریاں قائم کرنا۔قدرتی آفات اور فرقہ وارانہ فسادات میں ریلیف کے کاموں میں جوش و جذبہ کے تحت حصہ لینا۔نظام بیت المال قائم کر کے مستحقین کی مدد کرنا اور مسلم معاشرہ سے مشرکانہ رسوم و رواج کو ختم کرنے کے لئے اخبار و رسائل جاری کرنے کے ساتھ انفرادی اصلاح کی کوشش کرنا۔کتاب وسنت کی روشنی میں مسلم فکر کو پروان چڑھانا اور دیگر ملی مسائل میں دوسری جماعتوں سے اشتراک عمل کرنا اور اس کے لئے سرمایہ صرف کرنا اس جماعت کا امتیاز رہا ہے۔

22.13 امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

22.13.1 امارت شرعیہ کا قیام و پس منظر

یہ تحریک بھی ماقبل آزادی کے اسی ماحول اور فضا میں وجود میں آئی جس میں دیگر مسلم جماعتیں اور ملی اداروں کا قیام عمل میں آیا تھا اور اس تحریک کے پیش نظر بھی وہی مقاصد پوشیدہ تھے جو دیگر ملی اداروں کے ہیں یعنی تبلیغ دین، مسلمانوں کی دینی رہنمائی، اسلام اور مسلمانوں کا دفاع اور تحفظ شریعت، نیز ملت کی سماجی اور رفاہی خدمات وغیرہ۔اس کی انوکھی بات یہ تھی کہ اس جماعت کے بانیان نے ملت اسلامیہ ہند کی شیرازہ بندی کے لئے امارت شرعیہ کی تجویز پیش کی تاکہ ملت ایک قائد کے ماتحت اپنا لائحہ عمل متعین کر کے دینی و دنیاوی زندگی گزار سکے اور مستقبل کا خاکہ مرتب کر سکے۔مولانا ابوالمحاسن سجاد صاحب نے مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی اور مسلم معاشرہ پر رضا کارانہ شریعت کی تنفیذ کے لئے اس تحریک کی بنیاد ڈالی۔جس کی حمایت میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔ابتداء میں اس کا دائرہ کار کل ہند سطح کا تھا لیکن ملک گیر سطح پر ان لوگوں کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی البتہ بہار واڑیسہ (جس میں جھارکھنڈ بھی شامل ہے) میں کامیابی کی سطح سے گزری بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا قیام عمل میں آیا۔

26 جون 1921 کو بانکی پورہ پٹنہ میں پتھر کی مسجد میں بہار واڑیسہ کے پانچ سو علما اور مشائخ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی۔اس اجلاس میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کا قیام عمل میں آیا۔اس کے پہلے امیر شاہ بدرالدین قادری سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ہوئے۔اس تحریک کے محرک اول مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کو نائب امیر منتخب کیا گیا۔انھیں لوگوں کی رہنمائی اور قیادت میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ نے اپنے کام کا آغاز کیا۔ان لوگوں کے بعد شاہ محی الدین، شاہ قمرالدین، مولانا سید منت اللہ رحمانی اور مولانا عبدالرحمان بھی امیر شریعت ہوئے نیز مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا عبدالرحمٰن اور مولانا مجاہدالاسلام قاسمی وغیرہم نے نائب امیر شریعت کے طور پر کام کیا ہے۔یہ تحریک اپنے نام کے اعتبار سے بہار واڑیسہ تک ضرور محدود تھی مگر مجموعی اعتبار سے اس کا دائرہ عمل تمام ہندوستان تھا۔اس تحریک یا جماعت کا نظم ونسق مجلس ارباب حل وعقد، مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے تحت چلتا ہے۔

22.13.2 امارت شرعیہ کے اغراض ومقاصد:

اس تحریک کا دائرۂ عمل تو کافی وسیع ہے مگر جن نکات پر اس جماعت نے اپنے آپ کو منظم کیا تھا وہ یہ ہیں۔1-منہاج نبوت پر نظام شرعی کا قیام،2-اس نظام شرعی کے ذریعہ اسلامی احکامات کو بروئے کار لانا اور اس کے اجرا اور تنفیذ کے مواقع پیدا کرنا۔3-قوانین شرعی کو نافذ اور اسلام کے نظام عدل کو جاری رکھنے کے لئے استعداد پیدا کرنا۔4-ملت اسلامیہ ہند کے اسلامی حقوق کا تحفظ اور نگہداشت، 5-مسلمانوں کو کلمۂ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی بنیاد پر مجتمع کرنا۔6-تعلیم،معاش واقتصاد اور دیگر عملی میدان میں اسلامی نظام حیات کی روشنی میں رہنمائی کرنا۔ 7-رفاہی اور رفلاحی اداروں کو قائم کرنا۔8-اسلام کی روشنی میں ہندوستان میں بسنے والے تمام مذہبی فرقوں کے ساتھ صلح وآشتی کا معاملہ کرنا۔ 9-ملک میں امن پسند قوتوں کو فروغ دینا۔10-ملک میں مختلف فرقوں کے درمیان احترام کا جذبہ پیدا کرنا۔11-فرقہ پرست تحریکوں اور ان کے اثرات کا سدباب کرنا۔12-ان تحریکات سے اشتراک کرنا جو ملک میں مختلف مذہبی اکائیوں کے درمیان میل محبت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے جذبات کو فروغ دینے میں کوشاں ہوں، وغیرہ۔

22.13.3 امارت شرعیہ کی خدمات

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اپنے قیام کے اول روز سے ہی مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور تعمیر وترقی کے فرائض انجام دے رہی ہے اور تا حال یہ سلسلہ بدستور قائم ہے۔مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ان کی دینی ودنیاوی رہنمائی کے لئے ادارے کے ذمہ داروں نے مختلف شعبہ جات قائم کیے ہیں اور مستقل ملت کی خدمت کر رہے ہیں امارت شرعیہ کے قابل ذکر شعبے یہ ہیں۔شعبۂ دعوت وتبلیغ، شعبۂ تنظیم، شعبۂ تعلیم مذہبی وعصری، شعبۂ افتاء، شعبۂ قضاء، شعبۂ امور مساجد، المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء، دارالعلوم اسلامیہ وغیرہ۔امارت شرعیہ نے شعبۂ قضاء کے تحت تقریباً چالیس سے زائد دارالقضاۃ قائم کر کے مسلمانوں کے مختلف معاملات خاص کر کے عائلی معاملات کا تصفیہ کر کے ملت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔یہی نہیں بلکہ قضاۃ کی تربیت کے لئے الگ سے شعبہ بھی قائم کیا۔اس شعبہ کا یہ بھی امتیاز ہے کہ یہاں غیر مسلم حضرات بھی اپنی مرضی سے اپنے معاملات تصفیہ کرانے آتے ہیں۔شعبۂ نشر واشاعت کے تحت موقع بہ موقع مختلف موضوعات پر کتابیں، پمفلٹ، کتابچے اور پوسٹر وغیرہ شائع کر کے ملت کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے جاتے ہیں۔شعبۂ بیت المال کے تحت ضرورت مندوں کی بلا لحاظ مذہب وملت امداد کی جاتی ہے۔علاوہ ازیں اس تحریک کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس کے ذمہ داران نے فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر پورے ملک میں ریلیف کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور فسادات کے سدباب کی کوشش کی۔بہار اڑیسہ اور جھارکھنڈ میں فتنۂ قادیانیت کا بھی سامنا کیا اور شدھی تحریک کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ مرتد مسلمانوں کو دوبارہ دائرۂ اسلام میں لانے کا اہم کارنامہ بھی انجام دیا۔اسی طرح مسلم پرسنل لا پر موقع بہ موقع اٹھنے والے اعتراضات کا دفاع کرنے میں اس جماعت کے افراد بھی سرفہرست رہے ہیں۔یکساں سول کوڈ کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ مسلمانوں کو اس کے مضمرات سے واقف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔اس تحریک کا یہ امتیاز بھی قابل ذکر ہے کہ مسلمانوں کی عصری اور دینی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے امارت شرعیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ کو قائم کر کے اس کے تحت ٹیکنیکل اداروں کو قائم کیا۔علاوہ ازیں اسپتال اور صحت کے مراکز قائم کر کے ملت کی صحت کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں مدد ومعاون ہوئی۔علاوہ ان کاموں کے ملت کی فلاح وبہبود کی خاطر دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک عمل کیا۔الغرض اس جماعت کے قائدین اور ذمہ داروں نے محدود دائرہ کار میں

رہتے ہوئے اپنی خدمات پیش کیں اور بدستور یہ سلسلہ جاری ہے۔

22.14 دارالمصنفین اعظم گڑھ

22.14.1 دارالمصنفین اعظم گڑھ کا قیام و پس منظر

اس ادارے کو بھی ماقبل آزادی ہندوستان قائم کیا گیا تھا مگر اس کے قیام کے محرکات بالکل مختلف تھے۔ اس ادارہ کو صرف تحقیق اور تصنیف تالیف کے لئے مخصوص کیا گیا۔ دراصل اس کو علامہ شبلی کی علمی تحقیق کا نچوڑ سمجھنا چاہئے۔

علامہ شبلی نے علوم شرقیہ کی تحقیق میں جس نئے اسلوب کی داغ بیل ڈالی تھی اور جس کے تحت انھوں نے معروف زمانہ کتابیں اور مضامین و مقالات لکھے تھے اس کو قائم و دائم رکھنے اور اس کو جلا بخشنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسے ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جہاں مصنّفین کو تحقیق کے نئے انداز او راسلوب کے تحت تربیت دے کر انھیں اسلام اور مسلمانوں کے دفاع جیسے عظیم مقصد پر لگایا جا سکے۔

شبلی کے علمی کارناموں اور کارگزاریوں پر نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حیات بخش افکار و خیالات نئی صدی میں اسلام اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کو حقیقت میں بدلنے کے آرزومند افراد و اداروں کے لئے سرچشمہ تھے۔ ان کے کارناموں کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے انیسویں صدی کے آخری عشروں میں جب کہ ہندوستان غلام ہو چکا تھا اور مغرب سے ذہنی و فکری سیاہی ہر سو پھیلتی جاری تھی اپنی تحریروں سے پوری قوم کو بیدار کیا اور ذہنی مرعوبیت کے دلدل سے نئی نسلوں کو نجات دلانے کی کوشش کی۔ انھوں نے مسلمانوں کے اندر تاریخی شعور اس وقت بیدار کیا جب مغرب مسلسل مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کو داغدار بنانے کی کاوش کر رہا تھا۔ یہ کارنامہ انھوں نے ایسے وقت میں انجام دیا جب سرسید اور ان کے رفقاء مغرب پر مشرق کی برتری کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہیروز آف اسلام سیریز کے تحت الفاروق، الغزالی، المامون، سیرہ نعمان، سیرۃ النبی، نیز علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، الجزیہ، اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں۔ مضامین و مقالات اس پر اضافہ ہیں۔ شبلی نے جو کام تنہا کیا وہ ایک ادارہ کا کام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسی طرح کی تحقیقی کتابیں لکھی اور پڑھی جائیں تاکہ ملت اسلامیہ اپنے عظمت رفتہ کو نہ صرف دریافت کر سکے بلکہ اس کی تاریخ کا اسے بخوبی علم بھی ہو جائے۔ چنانچہ اس کا ابتدائی خاکہ انھوں نے الہلال میں شائع بھی کیا تھا اور 1914 میں اس کا نام دارالمصنفین شبلی اکیڈمی تجویز کر کے منظوری حاصل کی، اس کے لئے اپنا باغ اور بنگلہ وقف کیا قبل اس کے کہ مزید کام آگے بڑھتا، وقت موعود کے غلبہ نے اس کی تکمیل نہیں ہونے دی۔ بعد میں ان کے لائق شاگردوں نے انھیں خطوط پر ان کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کو قائم کیا۔

22.14.2 دارالمصنفین کا قیام اور اغراض و مقاصد

اس ادارہ کی بنیاد تو 1914 میں شبلی نعمانی خود ڈال گئے تھے، لیکن اس کی تعمیر و ترقی ان کے ہونہار شاگردوں کے ذریعہ شبلی کے انتقال کے بعد ان کے باغ و بنگلہ بمقام اعظم گڑھ میں عمل میں آئی۔ اس کے قیام و بقا اور تعمیر و ترقی میں شبلی کے شاگردوں نے اہم رول نبھایا۔ مولانا حمیدالدین فراہی اور سید سلیمان ندوی نے اس ادارہ کو مجلس اخوان الصفا کے تحت رجسٹر ڈ کرا کے اس کو عملی شکل دی۔ اس کے اصول و ضابطہ میں

انھیں اصولوں کو مدنظر رکھا گیا تھا جس کا خاکہ شبلی پیش کر گئے تھے۔ انھوں نے الہلال میں دارالمصنفین کے قیام کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ملک میں تصنیف و تالیف کا ذوق پھیلتا جا رہا تھا اور قابل قدر ارباب قلم پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی کتابوں کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مصنف کے بجائے مضمون نگار یا انشاء پرداز زیادہ ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک میں اعلیٰ درجہ کی تصنیف و تالیف کے لئے جس طرح کے اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ مہیا نہیں۔ ان میں سے اگر کوئی قومی کتب خانوں تک رسائی حاصل بھی کر لیتا ہے تو وہاں دلجمعی کے اسباب نہیں ہیں کہ اطمینان سے چند روز رہ کر کتابوں کا مطالعہ اور اس سے استفادہ اور نقل و انتخاب کر سکیں۔ علاوہ ازیں ارباب اہل قلم کے ماحول میں کوئی ایسا علمی مجمع بھی نہیں جس سے وہ لوگ مشورہ و تبادلۂ خیال کر سکیں۔ ان مشکلات کے حل اور تصنیف و تالیف کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ایک وسیع دارالتصنیف قائم کیا جائے جس کی ایک مختلف عمارت ہو اور اس میں ایک وسیع ہال کتب خانہ کے لئے ہو اور اس کے پاس ہی محققین کے لئے کمرے ہوں تا کہ وہ دلجمعی سے تحقیق و تالیف میں مشغول رہیں۔ کمرے خوبصورت اور خوش وضع ہوں اور ان مصنفین کے نام سے موسوم ہوں جو تصنیف کی کسی شاخ کے موجد ہوں۔ ایک عمدہ کتب خانہ ہو جس میں کثرت تعداد پر ہی نظر نہ ہو بلکہ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ جس فن کی کتاب ہو نادر یا کمیاب ہو۔ تصنیفی وظائف قائم کئے جائیں اور وظیفہ عطا کنندہ کے نام سے موسوم کیا جائے یہ وظائف ماہوار ہوں یا کسی تصنیف کے صلہ کے طور پر دیے جائیں وغیرہ۔ انھیں ضوابط و اصولوں کے تحت اس ادارہ کا قیام عمل میں آیا تھا۔

22.14.3 دارالمصنفین کے شعبہ جات

دارالمصنفین کے قیام کے بعد شبلی کے شاگردوں نے مصنفین کے اس ادارے کو سہولت کی خاطر مختلف شعبوں میں تقسیم کیا تھا۔ وہ شعبہ جات یہ ہیں۔ شعبہ دارالتصنیف، شعبہ دارالاشاعت، شعبہ دارالطباعت، دارالکتب، شعبہ رسالہ معارف، شعبہ تعمیرات وغیرہ۔ انھیں شعبوں کے تحت اس ادارے کے تمام امور انجام پاتے ہیں۔ شعبۂ دارالتصنیف اس ادارہ کا سب سے اہم شعبہ ہے جس کے لئے تمام کل پرزے تیار کئے گئے ہیں۔ اس شعبہ سے منسلک افراد نے شبلی کی علمی روایت کو جلا بخشنے میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے علاوہ علامہ حمید الدین فراہی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی وغیرہم نہ صرف شبلی کے شاگرد تھے بلکہ تصنیف و تالیف اور ذوق کے مطالعہ میں ان کے تربیت یافتہ بھی تھے۔ ان لوگوں کی تصنیفات شبلی کے فکر و خیال کی آئینہ دار ہیں۔ علاوہ ازیں ملک کے علماء اہل قلم حضرات نیز محققین اور علم و ادب سے بھی لگاؤ رکھنے والوں کی علمی و تحقیقی تربیت کے لئے جولائی 1910 میں معارف کے نام سے ایک علمی رسالہ بھی جاری کیا گیا جو طویل العمری کے باوجود اپنے معیار کے مطابق ابھی تک شائع ہو رہا ہے۔ یہ تحقیقی رسالہ اس ادارہ کے ترجمان کی حیثیت رکھتا ہے۔

22.14.4 دارالمصنفین کی کارکردگی

اس ادارے کو قائم ہوئے تقریباً 99 سال ہو چکے ہیں۔ اپنے قیام کے اول روز سے ہی اس ادارہ کے ذمہ داران اور محققین نے خود کو تصنیف و تالیف اور تحقیق کے لئے وقف کر دیا اور شبلی کے خواب و خیال ہیروز آف اسلام کی سیریز کو مزید وسعت دی اور اس طرح کی سیکڑوں کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ جن کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔ مسلم تاریخ و آثار کے حوالے سے جس طرح کی تحقیق اس ادارے میں کی گئی اس کی مثال برصغیر میں نہیں ملتی۔ دفاع اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے اسی ادارے کی خدمات بھی مسلم ہیں۔ مستشرقین کے ذریعہ پھیلائی جانے

والی غلط فہمیوں کا یہاں نہ صرف مطالعہ و تجزیہ کیا گیا بلکہ اس کے ازالہ کے لئے کانفرنسیں اور سمینار و لیکچرز کا اہتمام کر کے عملی کوششیں بھی کی گئیں ۔ اس ادارے نے استشراق کے ضمن میں جو کتابیں شائع کی ہیں ان کی اہمیت نہ صرف اس عہد میں تھی بلکہ آج بھی ہے ۔ برصغیر کے کسی دیگر ادارے نے مطالعہ استشراق کا اس طرح اہتمام نہیں کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ادارے سے وابستہ حضرات نے قومی خدمت کو معاشی ضرورتوں پر مقدم رکھ کر قلیل مشاہرے پر کام کیا اور اسلام و مسلمانوں کے ضمن میں پھیلی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے بھرپور کوششیں کیں جس سے نہ صرف اس ادارے کے وقار میں اضافہ ہوا بلکہ ملت کی بعض علمی ضرورتیں بھی پوری ہوئیں۔

22.15 دائرۃ المعارف عثمانیہ

22.15.1 دائرۃ المعارف کا قیام اور پس منظر:

اس ادارے کا قیام 1882 میں عمل میں آیا تھا۔ مہینہ اور دن کے تعین کی وضاحت تاریخ میں نہیں ملتی ۔ مولانا انواراللہ خاں فاروقی، مولانا عبدالقیوم اور نواب عمادالملک وغیرہم اس ادارے کے قیام کے محرک اول تھے ۔ اس وقت نواب میر محبوب علی خاں ششم کی حکومت تھی ۔ انھوں نے نہ صرف اس کے قیام کی تائید و حمایت کی بلکہ اس کی سرپرستی اور ریاستی سرمایہ کی مدد دے کر اس کے قیام و استحکام میں معاون و مددگار ہوئے ۔ ان کے بعد نواب میر عثمان علی خان ہفتم نے اس کی سرپرستی فرمائی ۔ ان کے زمانہ میں اس ادارے نے عالمی شہرت پائی ۔

پہلے پہل اس ادارے کا نام دائرۃ المعارف نظامیہ تھا جو کہ ریاست حیدرآباد کا خاندانی لقب تھا۔ مگر 25-1923 کے درمیان ساتویں نظام میر عثمان علی خاں کے نام سے اس ادارے کو منسوب کر کے نظامیہ کے بجائے عثمانیہ کا لفظ شامل کیا گیا۔ اس وقت سے تا حال یہ اسی نام سے معروف ہے۔

اس کے قیام کے پس منظر کا واقعہ بھی بہت ہی عجیب و غریب بیان کیا جاتا ہے زبانی روایتوں پر اگر یقین کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مولانا انواراللہ خاں فاروقی صاحب نے اپنے خدمت گار کو بازار سے کھجور لانے کو کہا۔ تا کہ وہ اپنے عزیز کو دے سکیں جو اسپتال میں بھرتی تھے ۔ خدمت گار کھجور لے کر آیا تو ان کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کیونکہ کھجوریں مشہور حدیث کی کتاب کنز العمال جو مخطوطہ کی شکل میں تھی کے ورق میں لپٹی ہوئی تھی ۔ اس واقعہ نے ان کے ذہن و قلب کو بہت متاثر کیا اور انھوں نے ایک ایسے ادارے کے قیام کے ارادے کو جہاں مخطوطوں کی نشر و اشاعت اور ان کی حفاظت کا اہتمام ہو سکے، حقیقت میں بدلنے کا ارادہ کیا۔ تا کہ آئندہ اس طرح کا واقعہ نہ ہو۔ انھوں نے اس سلسلے میں متعدد اسکالروں سے گفتگو کی اور اس کے قیام کی تگ و دو میں لگ گئے ۔ مولانا عبدالقیوم جو معروف اسکالر اور بہتر منتظم تھے اور نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی جو اس وقت ریاست کے ایجوکیشن سکریٹری تھے کے ساتھ مولانا فاروقی میر محبوب علی خاں سے ملے اور ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس طرح سے ان کی حمایت اور تائید سے یہ ادارہ قائم ہوا۔ اس واقعہ کی جو بھی حقیقت ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ واقعہ بھی اس کے قیام کے اسباب میں ایک سبب تھا۔

22.15.2 دائرۃ المعارف کے اغراض و مقاصد

دائرۃ المعارف کے اغراض و مقاصد میں درج ذیل باتوں کو اولیت کا مقام حاصل رہا ہے اور انہیں کے تحت اس ادارے کی کارگزاریاں سامنے آتی ہیں:

1- سائنس، آرٹ اور عربی کے مذہبی مخطوطوں کے حفاظت جو ختم ہو رہے ہیں یا ختم ہونے کے قریب ہیں۔

2- ان مخطوطوں کی نشر و اشاعت

3- نادر کلاسیکی مخطوطوں کی تحقیق و تدوین کے ساتھ ان کی طباعت کے ذریعہ ان کی حفاظت

4- دائرے کی مطبوعات کو مناسب قیمت پر فروخت کرنا۔

5- دائرے کی مطبوعات کو مفت یا معمولی قیمت پر مصنفوں، اساتذہ، اسکالرس اور معروف مدارس و جامعات کو دینا وغیرہ۔

22.15.3 دائرۃ المعارف کا نظام

دوسرے اداروں کی طرح یہ ادارہ بھی مختلف کمیٹیوں کی ماتحتی میں چلتا ہے۔ یہ ادارہ خود مختار ہے جس کا اپنا قانون بھی ہے۔ ایگزیکیوٹیو کمیٹی لٹریری کمیٹی اور ایڈوائزری کمیٹی کے ذریعہ حرکت پذیر ہے۔ اول الذکر دونوں کمیٹیوں کے کل سات سات ممبر ہوتے ہیں، دونوں کمیٹیوں کے صدر شیخ الجامعہ عثمانیہ ہوتے ہیں۔ ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر ملک و بیرون ملک کسی بھی جگہ کے ہو سکتے ہیں۔ یہ کمیٹی ادارہ کے استحکام و بقا میں معاون و مددگار ہوتی ہے اور اس کی وضع پالیسی میں اہم رول نبھاتی ہے۔ اس ضمن میں جرمن اسکالر سالم کرنکو (Salim Karanko) کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب تک ریاست حیدرآباد (ریاست نظام) قائم تھی اس وقت تک اس کی مالی ضرورتوں کو ریاست پوری کرتی تھی لیکن آزادی کے بعد اس کی مالی ضرورتیں مرکزی اور صوبائی حکومتیں پوری کرتی ہیں۔ 1996 میں اس وقت کی مرکزی حکومت نے اس ادارے کو انسانی فلاح و بہبود اور ترقی کی وزارت سے الگ کر کے وزارت اقلیتی بہبود اور ریاست آندھرا پردیش کے ماتحت کر دیا تھا اور مرکزی گرانٹ بھی ختم کر دی تھی اور اس کی مالی معاونت مذکورہ وزارت اور حکومت آندھرا پردیش کے سپرد کر دیا تھا، جس کی وجہ سے ادارہ معاشی بحران کا شکار ہو گیا تھا۔

اس ادارہ کی ایگزیکیوٹیو کمیٹی کو تمام طرح کے اقتصادی اور انتظامی اختیارات حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں ادارہ کا ناظم اعلیٰ ہی لٹریری کمیٹی کا سکریٹری ہوتا ہے اسی لئے اس کے ڈائریکٹر کی پوسٹ کا مکمل نام Director and Secretary ہے۔

22.15.4 دائرۃ المعارف کی کارکردگی

دائرۃ المعارف اپنے قیام کے اول روز سے ہی اپنے اغراض و مقاصد پر کاربند ہے چنانچہ اس وقت سے لے کر تا حال اس ادارہ سے ایسی سیکڑوں کتابیں اور مخطوطے شائع ہوئے ہیں جن کی مثال عالم عرب پیش نہیں کر سکتا۔ بنیادی طور پر اس ادارہ کا قیام تو عربی مخطوطوں کی حفاظت و بقا تھا لیکن اس کے بانیان اور ذمہ داران نے دوسرے موضوعات کو بھی شامل کیا اور اس ضمن میں تحقیق اور تصنیف کرا کر کتابیں طبع کیں مثلاً یہاں سے تفسیر قرآن، احادیث و اصول حدیث، رجال، سوانحی خاکے اور سوانح، قانون کی کتابیں، عقیدۂ اسلام اور تصوف، انسائیکلوپیڈیا،

تاریخ، ادب، فلسفہ، گرامر، ریاضی، تعلیم واصول تعلیم، زراعت، عہدوسطیٰ کی سائنس، جواہرات، طب یونانی اور اسلامی فقہ کی معتبر ومعروف کتابوں کی اشاعت کرکے پیش بہا کارنامہ انجام دیا ہے۔

اس ادارہ کی خوش بختی یہ تھی کہ اس کو جتنے بھی ذمہ دار ملے وہ یا تو اچھے منتظم تھے یا بہتر عربی داں اور محقق نیز ان میں بعض تو ایسے تھے کہ جو دونوں صفات سے معمور تھے۔انھیں لوگوں کی کوششوں سے یہ ادارہ اپنے اغراض ومقاصد کو پورا کرنے میں کامیاب ہوا۔ادارے کی سرکاری ویب سائٹس پر اس کے ذمہ داران کی جو فہرست ہے اس میں کل اٹھارہ نام ہیں۔وہ بھی 1926 سے تا حال۔جہاں تک اس کی تصنیفات کا تعلق ہے تو اس کی فہرست طویل ہے اور اس کی تفصیلات بھی ادارہ کی ویب سائٹس پر موجود ہیں جو سیکڑوں میں پہنچتی ہیں۔

22.16 خلاصہ

جدید ہندوستان میں مسلم تحریکات اور اداروں کا قیام 1857ء کی جدوجہد آزادی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کا مظہر ہے۔ان حالات میں جب کہ ہندوستانی مسلمان نہ صرف سیاسی اقتدار سے بے دخل کردیے گئے تھے بلکہ مختلف سطحوں پر ایسی کوششیں ہو رہی تھیں جن سے ان کی معاشی وتعلیمی پس ماندگی میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور وہ زندگی کی دوڑ میں مستقل پچھڑ رہے تھے۔ان حالات نے ہندوستانی مسلمانوں میں ایسے اصحاب نظر پیدا کیے جنھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو آگے لے جانے،ان کی تعلیمی ومعاشی پس ماندگی کو دور کرنے اور ان کی مذہبی شناخت کو بچانے کے لیے اپنے اپنے طور پر تدبیریں کیں اور پھر انہیں عملی جامہ پہنانے کے لیے ادارے اور تحریکیں شروع کیں۔پھر ان تحریکوں اور اداروں نے اپنی اپنی سطح پر مختلف قسم کے کارنامے انجام دیے اور ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کی اور آج بھی کر رہے ہیں۔

بلاشبہ آج ہندوستانی مسلمان جس مقام پر ہیں انہیں اس مقام تک پہنچانے میں ان تحریکوں اور اداروں کا رول بہت ہی اہم ہے۔ان میں تحریک مجاہدین، تحریک دیوبند، تحریک ندوہ، تحریک علی گڑھ، تبلیغی جماعت، سنی بریلوی جماعت، جمعیۃ علمائے ہند، جماعت اسلامی، مرکزی جمعیت اہل حدیث، جامعہ ملیہ اسلامیہ، امارت شرعیہ، دارالمصنفین اور دائرۃ المعارف اہم ہیں، جن کی کوششوں سے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی، عملی، مذہبی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی رہنمائی کا عمل انجام پایا۔اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور ملک کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے کا انہیں حوصلہ ملا۔

22.17 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

1۔ تحریک مجاہدین کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے ان کی کارگزاریوں کا احاطہ کریں۔

2۔ تحریک دیوبند کے قیام اور خدمات کا جائزہ پیش کریں۔

3۔ علی گڑھ تحریک کے قیام اور مقاصد پر ایک نوٹ لکھیں۔

درج ذیل سوالات کے جوابات تیس سطروں میں دیجیے۔

4۔ تحریک ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے اس کی کارگزاریوں کا جائزہ لیں۔

5۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام کیوں کر عمل میں آیا؟ وضاحت کریں۔

6۔ سنی بریلوی جماعت کے قیام اور خدمات کا جائزہ پیش کریں۔

22.18 مطالعے کے لیے معاون کتابیں

1۔ عصر حاضر کی اسلامی تحریکیں: ڈاکٹر احتشام احمد ندوی

2۔ 1947ء کے بعد ہندوستان میں اسلامی تحریکیں: پروفیسر اقتدار محمد خاں

3۔ ہندوستانی مسلمان: رحمانی

4۔ تاریخ دارالعلوم دیوبند: سید محبوب رضوی

5۔ تاریخ ندوۃ العلماء: مولانا محمد اسحاق جلیس رمولانا شمس تبریز خاں

اکائی 23 : مسلم شخصیات

اکائی کے اجزا

23.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ان شخصیات کے احوال و کوائف اور کارناموں سے واقف کرانا ہے جو جدید ہندوستانی مسلم سماج و معاشرے کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ تاکہ طلبہ ان شخصیات، ان کے افکار و خیالات اور خدمات سے آگاہی حاصل کرسکیں اور انہیں اس بات کا علم ہوسکے کہ جدید ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں کن مسلم شخصیات نے حصہ لیا اور مسلم معاشرے کی زبوں حالی کو دور کرنے میں انہوں نے کس طرح کا کردار نبھایا؟

23.2 تمہید

جدید ہندوستانی مسلم سماج و معاشرے کی تعمیر و ترقی میں جن اکابرین نے اہم کردار ادا کیا اور جن کی کوششوں سے نہ صرف مسلم معاشرے کی شیرازہ بندی ہوئی بلکہ ان کے افکار و خیالات نے مسلم معاشرے کو ترقی کی طرف گامزن کرنے میں بھی اہم کردار نبھایا، ان کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے۔ البتہ ان میں چند نام ایسے ہیں، جن کی نمایاں خدمات اور کوششوں نے انہیں نہ صرف ہندوستان کے مسلم معاشرے کے معماروں میں شامل کردیا ہے بلکہ قومی و ملکی ترقی میں بھی ان کا اہم کردار رہا ہے۔ مسلم معاشرے اور ملکی و قومی معماروں کے افکار و خیالات کے اثرات نہ صرف ملکی سطح پر دیکھے جاسکتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔

23.3 شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ

برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان کو اللہ تعالیٰ نے جو قدر و منزلت عطا کی وہ اس خطہء ارض کی اسلامی و دینی تاریخ کا ایک نہایت روشن باب ہے۔

قرآن، حدیث، تفسیر، اصول، فقہ، تصوف، جہاد غرض ہر میدان علم و عمل میں اس خانوادہ عالی مرتبت کی معزز شخصیات پیش پیش رہیں، اسی خاندان کے ایک فرد جلیل شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تھے جن کے احسانات اسلامی ہند بلکہ اسلامی دنیا پر بے شمار ہیں۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ 25 رمضان المبارک 1159ء مطابق 12 اکتوبر 1776ء میں دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے، تاریخی نام غلام حلیم رکھا گیا۔ آپ شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے بڑے صاحبزادے تھے، شاہ عبدالعزیزؒ کا سلسلہء نسب چونتیس واسطوں سے امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب تک پہنچتا ہے۔

والد محترم کی سرپرستی میں تعلیم کا آغاز ہوا، ناظرہ قرآن وغیرہ کے بعد صرف پانچ سال کی عمر میں قرآن پاک کے حفظ کا آغاز کیا اور جلد ہی حفظ قرآن سے فراغت کے بعد فارسی زبان کی تعلیم شروع کردی اور چونکہ اس وقت فارسی زبان کا دور دورہ تھا لہٰذا تھوڑی ہی مدت میں نہ صرف یہ کہ فارسی زبان سیکھ لی بلکہ ادب فارسی پر زبردست عبور حاصل کرکے فارسی زبان کے ایک ماہر اور قادرالکلام ادیب بن گئے، شاہ عبد العزیز نے اکثر و بیشتر علوم اپنے جلیل القدر والد ماجد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے حاصل کئے۔ ابھی شاہ صاحب کی عمر ۱۷ برس کی تھی کہ والد ماجد کا سایہء عاطفت سر سے اٹھ گیا، والد صاحب کے انتقال کے بعد ان پر دوہری ذمہ داری آن پڑی، ایک تو آپ کے علوم و فنون تشنۂ تکمیل ہی تھے، دوسرے یہ کہ آپ تمام بھائیوں میں بڑے تھے لہٰذا چھوٹے تین بھائیوں کی تربیت و پرورش کا بار بھی آپ پر آگیا، اس وقت شاہ رفیع الدین کی عمر 13 برس، شاہ عبدالقادر 9 برس اور شاہ عبدالغنی صرف 5 برس کے تھے۔

تیرہ سال کی عمر میں شاہ صاحب نے کتب درس، صرف و نحو، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، عقائد، ہندسہ، ہیئت اور ریاضی وغیرہ میں مہارت تامہ حاصل کرلی تھی، دو سال میں شاہ صاحب نے حدیث کی تمام کتابوں پر عبور حاصل کرلیا اور آپ کا شمار بہت بڑے بڑے علماء و فضلاء میں ہونے لگا۔

شاہ ولی اللہؒ کے انتقال کے بعد شاہ عبد العزیزؒ کی تعلیم وتربیت کا نظم اللہ تعالیٰ نے یوں کیا کہ اس زمانہ کے مایہ ناز علماء جن میں شیخ نور اللہ بڑھانوی، شیخ محمد امین کشمیری اور شاہ محمد عاشق بن شاہ عبید اللہ پھلتی رحمہم اللہ شامل ہیں ان حضرات سے علوم نبوت کی تحصیل کی اور ان اکابر کے فیوض علمیہ وروحانیہ سے بھرپور استفادہ فرمایا اور حدیث، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، کلام، منطق، فلسفہ اور شعر وادب غرض کہ تمام علوم دینیہ وعصریہ میں ممتاز حیثیت پائی، اور فن حدیث میں خصوصی مہارت حاصل کرلی۔ مولانا سید عبد الحی مرحوم اپنی کتاب نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں۔ ''مرحوم اپنے علم وفضل، آداب، ذکاوت، ذہانت، فہم وفراست اور سرعت حافظہ میں عالم کے اندر یگانہ روزگار علماء میں سے تھے، پندرہ برس کی عمر سے درس وتدریس میں مصروف ہوئے، درس دیا اور فیض پہونچایا، یہاں تک کہ ہندوستان میں یکتا عالم ہوگئے اور فضلاء نے ان سے اکتساب کمال کیا، بیشتر مقامات سے طلبہ محض ان سے پڑھنے کے لیے آئے اور ان پر ایسے ٹوٹ پڑے جیسے پیاسا پانی پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

شاہ عبد العزیز نے پندرہ برس کی عمر سے ہی مدرسہ رحیمیہ میں درس دینا شروع کردیا تھا لیکن والد محترم کے انتقال کے چند سال بعد باضابطہ 25 سال کی عمر میں اپنے والد محترم کی مسند درس پر رونق جلوہ افروز ہوئے اور چونکہ آپ بھی والد محترم کی طرح جامع الحیثیات والجہات انسان تھے اس وجہ سے اپنے والد کے انداز درس وتدریس اور تعلیم وتربیت کے طرز پر سلسلہ تدریس وتربیت اخلاق جاری فرما کر بڑی حد تک والد کی کمی کو پورا کردیا اور بہت جلد شاہ صاحب کی علمی شہرت چاردانگ عالم میں پھیل گئی اور اطراف عالم کے تشنگان علم وفن والہانہ انداز سے شاہ عبد العزیز صاحب کے درس میں حاضر ہوکر ولی اللہی علوم وفنون سے مستفیض ہونے لگے اور بہت ہی قلیل مدت میں شاہ صاحب کے علوم سے مستفیدین تلامذہ پورے عالم اسلام میں اور خصوصا برصغیر ہندوپاک میں پھیل گئے اور اس ہندوستان میں کوئی ایسی جگہ باقی نہیں رہی جو شاہ عبد العزیز کے شاگرد اور مرید سے خالی ہو۔

ان کے نامور تلامذہ میں سے چند کے نام قابل ذکر ہیں۔ حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی، امام المفسرین شاہ عبد القادر، حضرت شاہ عبد الغنی دہلوی، امام العلماء مولانا رشید الدین دہلوی، مولانا عبد الحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی، سید قمر الدین سونی پتی، حضرت شاہ غلام علی مجددی (خلیفہ مرزا مظہر جان جاناں شہید) مولانا سید قطب الدین بن مولانا محمد واضح رائے بریلوی، مولانا مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی، مولانا امام الدین دہلوی، مولانا صدر علی رامپوری، مولانا حیدر علی فیض آبادی، اور حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی۔ یہ وہ علماء ومشائخ ہیں جن کے ذریعہ علوم دینیہ اور خصوصا علم حدیث پورے ہندوستان میں پھیلا، شاہ عبد العزیز محدث اور عمدہ مفسر وماہر علوم عقلیہ ونقلیہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے ممتاز خطیب اور مقرر بھی تھے، شاہ صاحب کی مجلس وعظ میں ہر مذہب وملت کے لوگ جوق درجوق شریک ہوتے۔ شاہ صاحب تمام علوم میں مہارت تامہ رکھنے کے علاوہ موسیقی میں بھی یگانہ روزگار تھے، آپ کو یہ فن دوسرے علوم وفنون کی طرح اپنے والد بزرگوار سے وراثت میں ملا تھا۔

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے، ۱۱ جنوری ۱۶۱۳ء میں مغل شہنشاہ جہانگیر نے فرمان شاہی کے ذریعہ انہیں صوبہ گجرات میں تجارتی مراکز قائم کرنے کی اجازت دی، عالمگیر کی وفات کے بعد انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی نام سے ایک تجارتی ادارہ کی بنیاد ڈالی اور اس کے آڑ میں ملک کے مختلف حصوں پر اپنی حکومت قائم کرنی شروع کردی اور رفتہ رفتہ پورے ملک پر قبضہ کرلیا اور اس کے ساتھ عیسائیت کی ترویج بھی شروع کردی اور دوسری طرف دینی مدارس کو تباہ وبرباد کرنے کی مہم تیز کرکے اپنے مشنری اسکول قائم کرنے شروع

کر دیئے، جب پانی سر سے اوپر ہو گیا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے انگریزوں کے خلاف شاہجہانی جامع مسجد دہلی سے آواز بلند کی کہ ''آج سے یہ ملک دارالحرب ہو گیا، ان غاصبوں کے خلاف جہاد کرنا ہمارا فریضہ ہے''

اس زمانے میں علماء سے عوام الناس کو متنفر کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈہ بڑے زور و شور سے پھیلایا گیا کہ علماء انگریزی تعلیم کے مخالف ہیں، یہ پروپیگنڈہ اس شدت کے ساتھ کیا جاتا تھا کہ بہت سے بھولے بھالے مسلمان اس سے متاثر ہو کر علماء کرام کو برا بھلا کہنے لگتے، حالانکہ واقعہ بالکل برخلاف تھا، شاہ عبدالعزیزؒ انگریزی تعلیم کے حامی تھے دہلی میں جب انگریزی تعلیم کا انتظام ہوا تو مسلمانوں نے کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق شاہ عبدالعزیز سے فتویٰ طلب کیا تو آپ نے واضح لفظوں میں جائز قرار دیا۔ چنانچہ سر سید احمد خان نے اسباب بغاوت ہند کے صفحہ ۲۸ پر لکھتے ہیں ''شاہ عبدالعزیزؒ صاحب جو تمام ہندوستان میں نامی مولوی تھے مسلمانوں نے ان سے فتویٰ پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ انگریزی کالج میں جانا اور پڑھنا اور انگریزی زبان کا سیکھنا بموجب مذہب کے درست ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ علوم حدیث کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ وہ کثیر التصانیف تھے ان میں سے چند کا ذیل میں تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

فتح العزیز (معروف بہ تفسیر عزیزی) یہ تفسیر کئی جلدوں میں تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں ضائع ہو گئی اب صرف شروع اور آخیر کی دو جلدیں دستیاب ہیں۔

تحفہ اثنا عشریہ (فارسی) مذہب شیعہ کی تنقید و تردید میں شاہ صاحب کی شاہکار تصنیف ہے اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

بستان المحدثین (عربی) یہ کتب حدیث اور محدثین کی تفصیلی فہرست و تذکرہ اور تعارف ہے یہ اصلا عربی میں ہے لیکن اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔

العجالۃ النافعہ (فارسی) یہ اصول حدیث میں اہم فارسی رسالہ ہے۔

میزان البلاغۃ، یہ عربی زبان میں علم بلاغت پر ایک جامع مختصر متن ہے۔

السر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل، اس رسالہ میں شاہ صاحب نے خلفاء راشدین کے فرق مراتب پر نہایت محققانہ گفتگو کی ہے۔

میزان الکلام، یہ عربی میں علم کلام پر نہایت جامع و مانع مختصر رسالہ ہے۔

سر الشہادتین (عربی) ذکر حضرت حسنینؓ کے بارے میں یہ شاندار رسالہ ہے۔

مجموعہ فتاویٰ (فارسی) یہ آپ کے مختلف فتاویٰ کا مجموعہ ہے۔

اس کے علاوہ عربی میں عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس، تقریر دلپذیر فی شرح عدیم النظیر (فارسی)۔ ہدایۃ المومنین پر حاشیہ۔ سوالات عشرہ محرم (اردو) حواشی بدیع المیزان، (عربی) رسالہ تعبیر الرؤیا، میر زاہد رسالہ پر حاشیہ عربی میں، میر زاہد ملا جلال پر عربی میں حاشیہ، میر زاہد شرح مواقف پر عربی میں حاشیہ، شرح ہدایۃ الحکمۃ پر حاشیہ وغیرہ مزید تفصیل کے لیے ڈاکٹر ثریا ڈار کی تالیف ''عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور

ان کی علمی خدمات" دیکھا جاسکتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز بڑے باغ و بہار، خوش طبع، خوش گفتار، ہشاش وبشاش اور حاضر جواب انسان تھے، آپ ذہانت وفطانت اور ذکاوت حس میں بے مثل تھے، آپ کی تبحر علمی اور عبقریت کے بے شمار واقعات کتابوں میں مذکور ہیں۔حضرت شاہ عبدالعزیز بڑے غیور انسان تھے آپ کی جلالت شان اور قدرتی ہیبت کی بنا پر بڑے بڑے امراء وسلاطین بھی مرعوب رہتے تھے، تاریخ شاہد ہے کہ خاندان ولی اللہی نے کبھی کوئی شاہی منصب یا جاگیر منظور نہیں کیا، جس طرح آپ کے دادا شاہ عبدالرحیم اور والد شاہ ولی اللہ نے اپنے عہد کے بے راہرو بادشاہوں اور وزیروں کو متنبہ کیا تھا اسی طرح شاہ عبدالعزیز نے بھی اس ولی اللہی سنت کو قائم رکھا۔آپ کی قناعت کا یہ عالم تھا کہ کسی شاہی عطیہ کا قبول کرنا تو درکنار بادشاہوں اور امراء کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ کچھ پیش کریں کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری پیش کش نظر حقارت سے مسترد کردی جائے گی۔

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ عین جوانی میں ۲۵ برس کی عمر میں ہی کئی موذی امراض کے شکار ہوگئے جس کی وجہ سے آپ کی بصارت بھی جاتی رہی تھی، مخالفین نے آپ کو زہر دینے کی کوشش بھی کی تھی غرض ہندوستان کا یہ آفتاب علم وحکمت 7 شوال المکرّم 1239ھ مطابق 17 جولائی 1822ء میں 80 سال کی عمر میں بعد نماز فجر غروب ہوگیا، آپ کے نواسے شاہ محمد اسحاق نے ترکمان دروازہ کے قریب آپ کی نماز جنازہ پڑھائی اور موجودہ آئی ٹی او دلی گیٹ کے درمیان واقع قبرستان مہندیان میں اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

23.4 علامہ فضل حق خیر آبادی

علامہ فضل حق خیر آبادی 1212ھ/ 1797ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔آپ کا سلسلۂ نسب بتیس واسطوں سے حضرت عمر فاروق ص تک پہنچتا ہے۔آپ کے والد ماجد مولانا فضل امام خیر آبادی صدر الصدور دہلی (وفات 1829ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (وفات 1824ء) کے ہم عصر اور اکابر علماء میں شمار ہوتے تھے۔علامہ فضل حق خیر آبادی نے درسِ حدیث شاہ عبدالقادر محدث دہلوی سے حاصل کیا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے بھی استفادہ کیا۔علامہ فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدر الدین آزردہ دہلوی ہم سبق تھے۔

علامہ فضل حق خیر آبادی، کم عمری ہی میں تمام علوم وفنون کے حصول سے فارغ ہوگئے، بعد ازاں قرآن پاک حفظ کیا اور سلسلہ عالیہ چشتیہ میں حضرت دھومن شاہ دہلوی کے دستِ مبارک پر بیعت ہوئے۔علامہ خیر آبادی نقلی اور عقلی علوم میں صف اول کے ممتاز عالم دین تھے۔علم کلام، اصولِ فقہ اور علوم ادبیہ میں انہیں تخصص حاصل تھا۔منطق وحکمت میں درجۂ اجتہاد پر فائز تھے اور کوئی ہم عصر ان کا ہم پلّہ نہ تھا۔سرسید احمد خاں لکھتے ہیں:

> "جمیع علوم وفنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق وحکمت کی تو گویا اُنہی کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے۔علمائے عصر بلکہ فضلائے دَہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کرسکیں۔بارہا دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف سنا، دعویٰ کمال کو فراموش کرکے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔"

دینی علوم کے متبحر عالم ہونے کے ساتھ شعروادب کا نہایت پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔آپ کے چار ہزار سے زائد اشعار عربی

ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔اگر چہ خود اردو زبان میں طبع آزمائی نہیں فرماتے تھے تاہم بحیثیت نقاد کے آپ کی رائے سند کا درجہ رکھتی تھی۔مرزا غالبؔ ان کے مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، غالب کا موجودہ اردو دیوان ،علامہ فضل حق خیر آبادی اور مرزا خافی کا انتخاب ہے۔

دینی علوم سے فراغت کے بعد وہ دہلی جھجھر، ٹونک اور راؤر میں بلند مناصب پر فائز رہے۔لکھنؤ اور رامپور میں منصب صدارت کو زینت بخشی،اس کے باوجود فارغ اوقات میں تشنگانِ علوم کو سیراب کرتے۔آپ کے فیض یافتہ بے شار علما آسمانِ علم وفضل پر مہر وماہ بن کر چمکے اور ایک عالم کو فیضیاب کیا۔آج ہندو پاک کا شاید ہی کوئی مدرسہ ہوگا جہاں کسی نہ کسی شکل میں آپ کا فیض جاری نہ ہو۔آپ کے چند معروف تلامذہ کے نام، درج ذیل ہیں:

علامہ عبدالحق خیر آبادی (فرزند)،علامہ ہدایت اللہ خاں جونپوری (استاذ صدرالشریعہ مفتی امجد علی اعظمی ،مصنف بہارِ شریعت)، تاج الفحول مولانا شاہ عبدالقادر عثمانی بدایونی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا ہدایت علی بریلوی، مولانا سید محمد عبداللہ بلگرامی ،مولانا عبدالعلی رامپوری (استاذِ امام احمد رضا بریلوی)، نواب یوسف علی خاں، والی ریاست رامپور اور نواب کلب علی خاں، والی ریاست رامپور۔

علامہ نے مختلف مناصب کی مصروفیات اور درس وتدریس میں مشغولیت کے باوجود تصانیف کا قابلِ ذکر ذخیرہ یادگار چھوڑا۔یہ تصانیف اپنے مصنف کے علمی تبحر،قوتِ استدلال، زوربیان اور کمالِ فصاحت وبلاغت پر شاہد وعادل ہیں۔آپ کی چند مشہور تصانیف یہ ہیں:

تاریخ فتنۃ الہند (فارسی)، جنگ آزادی 1857ء کے اسباب وواقعات پر عربی میں الثورۃ الہندیہ،نثر اور قصائد فتنۃ الہند،نظم میں ہیں، الجنس الغالی فی شرح الجوہر العالی، حاشیہ افق المبین، مصنفہ میر باقر داماد، حاشیہ تلخیص الشفاء لابن سینا، حاشیہ قاضی مبارک شرح سلم۔ مطبوعہ، رسالہ فی تحقیق الاجسام، رسالہ فی تحقیق الکلی الطبعی ،الروض المجود (مسئلہ وحدۃ الوجود کی معرکۃ الاراء کتاب، مطبوعہ)،الہدیۃ السعیدیہ۔ (حکمت طبعیہ والہیہ پر مشتمل فلسفہ کی مبادیاتی کتاب ہے)، تحقیق الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ، فارسی، امتناع النظیر (فارسی) تحقیق الفتویٰ کا اردو ترجمہ سرگودھا و لاہور اور مبارک پور سے چھپ کر عام ہو چکا ہے۔اسی طرح الثورۃ الہندیہ یعنی انقلاب ہند 1857ء مولانا عبدالشاہد شروانی علی گڑھی کے اردو ترجمہ اور سوانحی اضافہ کے ساتھ بنام 'باغی ہندوستان' لاہور اور مبارک پور سے کئی بار چھپ چکا ہے۔

علامہ خیر آبادی ظاہری شان وشوکت اور علمی فضیلت کے ساتھ شریعت مطہرہ اور سنتِ مبارکہ پر عمل پیرا، عابد شب زندہ دار تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی کو اللہ تعالیٰ نے دلِ دردمند اور عقل بیدار سے نوازا تھا، سرزمین ہند پر انگریز کے مکارانہ تسلط اور مسلمانوں کی شوکت وعظمت کے زوال کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے اور اس امر کو شدت سے محسوس کرتے تھے کہ انگریز طرح طرح کے حیلے بہانے سے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے درپے ہیں۔علامہ نے الثورۃ الہندیہ (بغاوت ہندوستان) میں ان کی بعض سازشوں کی نشاندہی کی ہے مثلاً:

(1) انگریزوں نے مسلمان بچوں کو عیسائیت کی تعلیم دینے کے لئے شہروں اور دیہاتوں میں اسکول کھولے اور اسلامی مدارس کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔(2) نقد قیمت ادا کر کے تمام غلہ اور اجناس خرید لیتے تاکہ لوگ ایک ایک دانے کے لئے ان کے محتاج ہو جائیں اور کسی کو مجالِ سرکشی نہ رہے۔(3) بچوں کے ختنے پر پابندی عائد کردی اور عورتوں کا پردہ ختم کرا دیا اور اس طرح اہل ایمان کو فتنہ میں ڈالنے اور احکامِ اسلامیہ کے مٹانے کی مذموم کوشش کی۔

(4) کارتوس استعمال کرتے وقت مسلمان فوجیوں کو سور کی چربی اور ہندوؤں کو گائے کی چربی چکھنے پر مجبور کیا۔

میرٹھ سے مئی 1857ء میں انقلاب کا آغاز ہوا۔ علامہ خیر آبادی اُس وقت ریاست اُلور میں تھے۔ وہاں سے دہلی پہنچے اور جہادِ آزادی میں قائدانہ شان سے حصہ لیا، بادشاہ سے سابقہ روابط کی بنا پر خصوصی مشوروں میں شریک ہوتے اور اپنی صواب دید کے مطابق راہنمائی کرتے۔ علامہ کی تجویز کے مطابق مختلف والیانِ ریاست کو خطوط لکھے گئے۔ آپ کے صاحبزادے مولانا عبدالحق خیر آبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی بلند شہر کے کلکٹر مقرر کیے گئے، بہت سے حکام علامہ خیر آبادی نے خود مقرر کیے، جس کی بہادر شاہ ظفر کی طرف سے اجازت تھی۔ آپ کے حکم وہدایت کے مطابق لال قلعہ کے دارالانشاء (سیکریٹریٹ) کی طرف سے احکام وفرامین جاری ہوتے رہے۔ بادشاہ نے ایک کنگ کونسل قائم کی جو تین ارکان پر مشتمل تھی، جنرل بخت خاں، مولوی سرفراز علی اور مولوی فضل حق۔ مختلف برطانوی جاسوسوں نے لال قلعہ میں بہادر شاہ ظفر سے علامہ خیر آبادی کی ملاقات و گفتگو اور آپ کی انقلابی سرگرمیوں کا اپنے اپنے روزنامچوں میں ذکر کیا ہے جن میں سے کئی ایک روزنامچے چھپ چکے ہیں۔

19 ستمبر 1857ء کو دہلی پر انگریزوں کا مکمل تسلط ہوگیا تو علامہ خیر آبادی اپنے اہل وعیال کے ساتھ کسی طرح دہلی سے نکل کر اپنے آبائی وطن خیر آباد پہنچے۔ پھر خیر آباد سے سیتاپور (لکھنؤ) پہنچ گئے جہاں ملکۂ عالیہ "حضرت محل" انگریزی فوجوں سے نبرد آزما تھیں، یہاں بھی وہ انقلابیوں کی مجلس شوریٰ کے خصوصی رکن تھے، انقلابی آپ کے مدبرانہ مشوروں سے مستفید ہوتے رہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود انقلابیوں کو ہر محاذ پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور انگریز اپنا اقتدار بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ انہی دنوں ملکۂ برطانیہ نے عام معافی کا اعلان کردیا۔ مولوی فضل حق اس اعلان پر اعتماد کرتے ہوئے خیر آباد چلے گئے، ابھی چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ آپ کو گرفتار کرلیا گیا، مقدمہ چلا اور فیصلہ یہ دیا گیا کہ ان کی تمام جائداد ضبط اور انہیں تازیست جزیرۂ انڈمان (کالے پانی) بھیج دیا جائے۔ چنانچہ علامہ فضل حق نے 12 صفر، 1278ھ۔ 20 اگست 1861ء کو انڈمان میں جامِ شہادت نوش کیا۔

علامہ خیر آبادی کو جہادِ حریت کا بطلِ جلیل اور انقلاب 1857ء کا قائد تسلیم کیا جاتا ہے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی فاضلِ دیوبند سابق ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ لکھتے ہیں:

> "اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل ہے اس پر 38 دلّی کے علماء ومشائخ کے دستخط ہیں، مولانا فضل حق خیر آبادی کے اس پر دستخط نہیں لیکن ان کا ایک الگ مستقل فتویٰ جہاد تھا جس کا ذکر 1857ء کی جنگ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔

مولانا بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت وجسارت اور دینی حمیت وغیرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلّی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی اور دوسرے علماء کے دستخط تھے۔"

انگریزی حکومت سے سر زمین ہند کو نجات دلانے کے جو جذبات علامہ خیر آبادی کے سینے میں موجزن تھے اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آپ کے فرزند علامہ عبدالحق خیر آبادی نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ جب انگریز چلے جائیں تو میری قبر پر آکر اطلاع دے دینا۔

چنانچہ 15/اگست 1947ء کو مولانا سید نجم الحسن رضوی خیر آبادی نے مولانا عبدالحق خیر آبادی کے مدفن (درگاہ مخدومیہ خیر آباد) پر ایک جم غفیر کے ساتھ حاضر ہو کر میلاد شریف کے بعد قبر پر فاتحہ خوانی کی اور اس طرح پورے پچاس سال کے بعد انگریزی سلطنت کے خاتمہ کی خبر سنا کر وصیت پوری کی۔

23.5 مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی

انیسوی صدی کے ہندوستان میں مسلم حکومت کی تباہی اور خاتمہ کے بعد جو نئی اسلامی تحریک اٹھی اس کے قبل از وقت زوال کی جو بھی تاویلیں کی جائیں حقیقت واقعہ یہ بھی ہے کہ اس کی باقیات کو بچانے اور خاص طور پر عمل بالحدیث کو رواج دینے والوں میں مولانا سید نذیر حسین دہلوی نے کلیدی اور نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے مسند ولی اللٰہی کی شمع ایسے وقت میں جلائے رکھی جب کہ حالات ناگفتہ بہ تھے۔ انہوں نے تقریباً پچاس برس تک دہلی میں مسند درس وحدیث کا حلقہ قائم رکھا۔

سید نذیر حسین محدث دہلوی غالباً 1220ھ میں بمقام موضع بلتھوا، ضلع مونگیر بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی زندگی کے احوال کی تفصیلات نہیں ملتی۔ صرف اتنا بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا بچپن تابناک نہیں تھا۔ زمانہ طفولیت لہولعب میں گزرا۔ کبھی دریا میں تیراکی کی تو کبھی شہہ سواری۔ خاندانی عزت ووقار کے باوجود اس دوران علم وتعلیم سے بے بہرہ رہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ اس وقت ان کے والد کے معاشی حالات زیادہ بہتر نہیں تھے جو ان کی تعلیم کے لیے باقاعدہ استاد کا انتظام کرتے یا کہیں اور بھیجتے۔ سید نذیر حسین محدث دہلوی نسباً سادات حسین سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلسلہ نسب 34 واسطوں سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔

سید صاحب کی تعلیم کے حوالے سے بھی روایتیں خاموش ہیں کہ کب انہوں نے باقاعدہ تعلیم شروع کی۔ اس وقت ان کی عمر کیا تھی۔ تراجم علماء حدیث ہند میں لکھا ہے کہ عہد طفولیت لہولعب میں گزر رہا تھا کہ اسی زمانے میں ان کے والد سید جواد علی کے ایک برہمن دوست ان سے ملنے ان کے گھر آئے تھے۔ وہ ان کو لہولعب میں مصروف دیکھتے۔ ایک روز انہوں نے کہا کہ میاں تم اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک کچھ پڑھا نہیں۔ دیکھو تمہارے خاندان میں سب مولوی ہیں مگر تم جاہل ہو۔ یہ نصیحت کارگر ہوئی۔ والد سے عربی فارسی زبان کی تحصیل کی اور یہاں سے تعلیم کا جو سلسلہ شروع ہوا تو وہ دہلی میں آ کر ختم ہوا۔

انہوں نے اپنے والد سے عربی فارسی کے مبادی تک ہی تعلیم حاصل کی کیوں کہ ان کی رسائی یہیں تک تھی۔ تشنگی علم کی بر آوری کو نہ دیکھتے ہوئے اپنے دوست بشیر الدین عرف مولوی مراد علی کے ہمراہ والد کی اجازت کے بغیر رات کو گھر سے نکل کر صادق پور پٹنہ میں مولوی شاہ محمد حسین کی درس گاہ میں پہنچے۔ یہاں انہوں نے مشکوٰۃ شریف اور ترجمہ قرآن پڑھا۔ اس وقت ان کی عمر 17 سال تھی۔ یہاں وہ چھ مہینے ٹھہرے۔ اسی دوران سید احمد شہیدؒ کا قافلہ پٹنہ وارد ہوا۔ جہاں انہوں نے پہلی مرتبہ شاہ اسماعیل دہلوی کا وعظ سنا اور ان لوگوں سے ملتے رہے۔ یہاں سے ان کی طبیعت دہلی کی طرف مائل ہوئی جس کی اہمیت شیراز ہند کی تھی اور جہاں شاہ عبدالعزیز دہلوی کی مسند درس بچھی ہوئی تھی۔ ان سے استفادے کے شوق نے انہیں دہلی آنے پر مجبور کیا چنانچہ وہ اور ان کے دوست پٹنہ سے دہلی روانہ ہوئے۔ زاد راہ کی قلتوں اور پیادہ پا مسافت کی صعوبتوں کی وجہ سے تشنگان علوم نبوت کئی سال بعد دہلی پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس وقت تک شاہ عبدالعزیز دہلوی کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے خلیفہ ونواسے شاہ محمد اسحاق صاحب سے استفادہ کرنے سے پہلے دوسرے علماء سے ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اس طرح خود کو تیار کر کے شاہ محمد اسحاق کے درس میں شریک ہوئے۔ دہلی میں انہوں نے حدیث کے علاوہ فقہ وتفسیر کا علم بھی حاصل کیا۔ حدیث کے ساتھ تفسیر وفقہ

پر بھی ان کی گہری دست رس تھی۔ کثرت سے مطالعہ کی وجہ سے ان کے قلب و ذہن میں وسعت تھی۔ مطالعہ کا شوق دوران تعلیم ہی پیدا ہو گیا تھا چنانچہ دہلی میں قیام کے دوران انہوں نے اپنے کتب خانہ کے علاوہ لال قلعہ کے شاہی کتب خانہ، شاہ عبدالعزیز کے کتب خانہ لکھنؤ میں سید حامد حسین کے کتب خانہ وغیرہ سے بھرپور استفادہ کیا۔ مطالعہ کا اس قدر شوق تھا کہ جب آپ راولپنڈی جیل میں بند تھے تو وہاں سرکاری کتب خانہ سے کتابیں منگا کر پڑھتے تھے۔

سید صاحب نے تعلیم کی تکمیل کے بعد دہلی ہی میں مسجد اورنگ آبادی حلقہ درس قائم کیا جو اگلے ساٹھ برس تک مسلسل قائم رہا۔ ابتداء کے بارہ برس جملہ علوم کی کتابیں کسی استثنا کے بغیر طالبین علم کو پڑھاتے رہے لیکن بعد میں خود کو صرف تفسیر، حدیث اور فقہ تک محدود کر لیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ طالب علموں کو ان سے استفادہ کا خوب موقع میسر آیا۔ درس و تدریس کی مشغولیات کی وجہ سے انہیں تصنیف کے مواقع کم میسر ہوئے۔ پھر بھی ان کے فتاوی تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے فتاوے ''فتاویٰ نذیریہ'' کے نام سے شائع بھی ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ردتقلید میں ''معیار حق'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی۔

سید صاحب کا دہلی میں مسند درس قائم کرنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں طالبان علوم نبوت نے ان سے فیض حاصل کیا اور عالم میں پھیل گئے۔ ان کے حلقۂ درس میں ہند اور بیرون ہند کے طلبہ شامل تھے۔ ان کے شاگردوں میں ایسے نام ملتے ہیں جن کا شمار اپنے وقت کے ائمہ فن میں ہوتا تھا۔ حافظ ابو محمد ابراہیم آروی (مؤسس مدرسہ احمدیہ آرہ بہار)، شاہ عین الحق پھلواری، علامہ شمس الحق ڈیانوی، (صاحب عون المعبود) مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، حافظ عبداللہ غازیپوری، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری (صاحب تحفۃ الاحوذی) وغیرہم قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے سوانح نگار نے حیاۃ بعد الممات میں ان کے ہزاروں طلبہ میں سے پانچ سو کے نام لکھے ہیں۔

علاوہ ازیں سید صاحب کی اس خوبی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ وہ خطابت کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے اس کو محض ہدایت انسانیت کے لیے اختیار کیا تھا۔ ان کا وعظ عام فہم اور سلیس و سادہ ہوتا تھا۔ بیان میں صفائی اور سادگی ہوتی تھی۔ آپ کی تقریر کا سامعین پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ سید صاحب درس و تدریس میں سیکھنے اور سکھانے کے اصول پر عمل کرتے تھے۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ طلبہ میں یہ تأثر قائم رہے کہ سید صاحب صرف بولتے نہیں سنتے بھی ہیں۔ سید صاحب ہنگامہ غدر کے شکار بھی ہوئے اور قید و بند کی صعوبتوں میں گرفتار بھی۔ ان پر بھی وہابیت کا مقدمہ چلا۔ اس سلسلے میں راولپنڈی جیل میں ایک سال قید رہے۔ یہاں بھی تعلیم و تعلم کا مشغلہ جاری رکھا۔ ایک سال بعد ان کی رہائی عمل میں آئی۔ ان کے مخالفین نے انہیں غدار وطن کہا اور انگریز نوازی کے طعنے دیے مگر حمیدہ اوصاف کی وجہ سے صبر کا دامن تھامے رکھا۔

سید صاحب کو 1315ھ میں حکومت برطانیہ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا تھا مگر اس پر انہوں نے کبھی فخر نہیں کیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلماء کہے تو کیا۔ میں نہایت خوش ہوں کہ لوگ مجھے میاں صاحب کہتے ہیں۔ بھائی سادات کے لیے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔

سید صاحب نے 1300ھ میں حج بیت اللہ کا سفر بھی کیا تھا۔ میاں صاحب نے وہاں بھی مسند درس جمائے رکھی اور وعظ و ارشاد کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وہ اپنے وعظ میں شرک و بدعت سے اجتناب، عمل بالحدیث اور غیر شرعی رسومات سے اجتناب کی ترغیب دیتے رہے۔ مخالفین نے وہاں بھی انہیں نہ چھوڑا اور رنج و غم کا باعث بنے۔

سید صاحب نے تقریباً سو سال کی عمر پائی۔ دس رجب بروز دوشنبہ 1320ھ مطابق 13 اکتوبر 1902ء کو بعد نماز مغرب آپ فوت ہوئے۔ اگلے روز صبح میں جنازہ ہوا اور تدفین عمل میں آئی۔ دہلی و اطراف کے تمام اہل علم صوفیاء اور علماء دین نے شرکت کی۔

23.6 مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی

ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی تاریخ علماء فرنگی محلی کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔ اس خانوادے کے علماء نے علم دنیا کی جو خدمت کی ہے اور جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اس کا مقابلہ ہندوستان کا دوسرا خانوادہ نہیں کرسکتا۔ خاندانِ فرنگی محل لکھنؤ کی شہرت علمی بالخصوص مرکز علوم عقلی کے بانی و موسس، حضرت مولانا نظام الدین سہالوی (وفات 1161ھ/ 1848ء) ہیں۔ ان کے دور سے ہی یہ خانوادہ ہندوستان کا مرکز او رمعروف علمی خانوادہ رہا ہے۔ یہی اُس درس نظامی کے بانی ہیں جو دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بطور آج بھی جزوی ترمیم کے ساتھ رائج ہے۔ معقولات، منطق اور فلسفہ میں اسی خاندان نے اپنے عہد میں عالمی سطح کے صاحبانِ فن پیدا کیے۔ حدیث، فقہ، دیگر عربی علوم وفنون میں بھی ہندوستان کا یہ بڑا علمی مرکز رہا ہے۔ دہلی میں ولی الہٰی نظام تعلیم جس میں قرآن وحدیث کو نمایاں فوقیت حاصل تھی بلکہ قرآن وحدیث ہی کے لیے شہرۂ آفاق تھا، اس کی علمی شعاعوں میں بھی درس نظامی اور اساتذۂ فرنگی محل کی علمی تابنا کیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس خانوادہ کے آخری عہد میں علامہ عبدالحیٔ فرنگی محلی کی ذات گرامی تھی جس نے دونوں مکتب فکر عقلی ونقلی کو ایک مرکز پر جمع کر دیا۔ علماء فرنگی محل کی خوبی یہ ہے کہ فقہ حنفی پر عمل کرتے ہوئے بھی تحقیق وتدقیق سے کام لیا اور بہت سے مسائل میں علماء حنفیہ سے الگ راہ اپنائی۔ خود مولانا عبدالحی کا مزاج یہ تھا کہ انہیں جب صحیح احادیث ملتی تو وہ اس پر عمل پیرا ہوتے اور اس کی نشر واشاعت بھی کرتے۔ وہ تقلید جامد کے خلاف تھے۔ ان کی تحریں علماء تحقیق کے لیے مشعل راہیں۔

ابوالحسنات، مولانا عبدالحیٔ ابن مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی لکھنوی 26 ذی قعدہ بروز سہ شنبہ 1264ھ 1847ء کو باندہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت ایوب انصاری سے آپ کا شجرۂ نسب ملتا ہے۔ والد گرامی، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کی نگرانی میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ 4 سال کی عمر میں باندہ سے لکھنؤ آگئے۔ یہاں آپ کی باضابطہ تعلیم شروع ہوئی۔ حافظ قاسم علی لکھنوی سے قرآن کریم کا حفظ شروع کیا اور دس برس کی عمر میں قرآن حفظ کرلیا لیکن والد صاحب کی نقل مکانی کی وجہ سے یہ مبارک کام جونپور میں مکمل ہوا۔ یہاں انہوں نے سب سے پہلے جامع مسجد میں نماز تراویح میں قرآن مجید سنایا۔ والد کے اکلوتے فرزند تھے، نازونعم میں پرورش ہوئی اور بہت اہتمام سے تعلیم وتربیت کے مراحل طے ہوئے۔

عربی وفارسی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر تفسیر وحدیث، فقہ واصول وغیرہ تمام عقلی ونقلی علوم کی کتابیں والد گرامی سے پڑھیں۔ 17 سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوگئے۔ اور اپنی عملی زندگی کا آغاز شہر حیدرآباد سے شروع کیا جہاں وہ تعلیم کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ یہاں وہ ایک مدت تک رہے۔ اسی دوران آپ نے 1279ھ اور 1292ھ میں آپ نے دو حج کیے۔ دوسرے حج کے سفر میں تین ماہ مکہ معظّمہ میں قیام کر کے عرب علماء ومشائخ سے علم حدیث حاصل کیا، ان کے عرب شیوخ میں شیخ احمد بن زین دحلان شافعی، مفتی محمد بن عبداللہ بن حمید حنبلی، شیخ محمد بن محمد الغربی شافعی اور شیخ عبدالغنی بن ابی عید العمری الحنفی دہلوی وغیرہم ہیں۔ ان شیوخ سے انہوں نے سند حدیث کی اجازت حاصل کی۔ علم حدیث میں آپ کی مہارت وتحقیق کی تعریف آپ کے اساتذہ وشیوخ نے بھی اپنی اسناد میں کی ہے۔ آپ کی اولاد میں صرف ایک صاحب زادی تھیں۔ بقیہ اولاد کا صغر سنی ہی میں انتقال ہوگیا۔ ریاست حیدرآباد نے 250 روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، اس پر قناعت تھی۔ دوسرا کوئی

ذریعہ معاش نہیں تھا۔

صرف 39 سال کی عمر میں متقدمین علمائے کرام اور محققین کے طرز تصنیف وتحقیق کے مطابق 114 ضخیم کتابیں تصنیف وتالیف کردیں۔آپ خود بیان کرتے ہیں کہ بیک وقت کئی تصانیف میں مشغول ومصروف رہتے، سفر وحضر، صحت ومرض، موسم کی شدت اور حالات وماحول کی سردی گرمی کوئی بھی چیز آپ کے عزم واستقلال کو متاثر نہ کرسکی۔البتہ بیک وقت کئی ایک تصانیف کی عادت نے یہ نقصان پہنچایا ہے کہ بہت سی تصانیف، ناتمام رہ گئیں اور کچھ تصانیف صرف مسودہ یا مخطوطہ کی شکل میں باقی ہے جن کی طباعت کی شکل نہ نکل سکی۔ناتمام کتابوں کے مسودے اور دیگر مخطوطات جو ضائع ہونے سے بچ سکے وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری ''عبدالحیٔ کلیکشن'' میں محفوظ ہیں۔

تصنیفات

(1)تبیان، تكملة الميزان، امتحان الطلبة ، شرح تكملة الميزان۔ عربی وفارسی زبان میں یہ علم صرف کے قواعد کی چار کتابیں ہیں (۲)النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر۔امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب حدیث ''جامع صغیر'' پر نہایت بیش قیمت تعلیقات وحواشی ومفید اضافات، مطبوع ہوچکے ہیں۔

مقدمة الهداية ۔ مذيلة الدراية۔ یہ دونوں فقہ حنفی کی مشہور کتاب قدوری کی شرح ہے۔

مقدمة السعاية۔ شرح وقایہ کی عربی شرح ۔عمدة الرعاية۔ یہ بھی شرح وقایہ کے نصف اول کی شرح ہے۔

(1) الاجوبة الفاضلة للأسئلة العشرة الكاملة۔ فقہ اسلامی کے ائمۂ اربعہ کی تقلید کی حمایت میں دس اعتراضات کا عقلی ونقلی جواب ہے۔

(2) طبقات الحنفيه ، الفوائد البهية فى تراجم الحنفية۔ یہ دونوں علمائے احناف سے متعلق حوالہ جاتی کتب کا درجہ رکھتی ہیں۔

(3) الرفع والتكميل فى الجرح التعديل۔ ظفر الأماني ۔ علم حدیث سے متعلق یہ بنیادی کتابیں علمی حلقوں میں معروف ومقبول ہیں۔

حاشیہ حصن حصین ۔اقامة الحجة على أن الأكثار فى العبادة ليست ببدعة۔

آپ کی سب سے زیادہ کتابیں علم منطق وفلسفہ اور کلام سے متعلق ہیں جو مستقل تصنیف وتالیف، ترجمہ، تحشیہ، تعلیق اور تقدیمات وغیرہ کی شکل میں ہیں۔خانوادۂ فرنگی محل کے علماء ومشائخ اور اساتذہ وطلبہ پر فلسفہ اور کلام کا رنگ غالب تھا جس کے اثرات ان کی تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس پر واضح شکل میں نظر آتے ہیں۔

مطالعہ بہت زیادہ کرتے تھے جس کا اثر آپ کے اعضاو جوارح پر بھی پڑتا تھا مگر مطالعہ میں آپ کوئی کمی نہ آنے دیتے۔20ربیع الاول 1304ھ/1886ء بروز دوشنبہ آپ کا انتقال ہوا۔فرنگی محل لکھنؤ میں دفن ہوئے۔

23.7 سید امیر علی

سید امیر علی ایک مشہور قانون داں اور ایک مسلم قائد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، ان کی خصوصیت و اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے سو عظیم مسلم شخصیات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ان کے والد ماجد کا نام سید سعادت علی تھا جو اپنے عہد کے عالم و فاضل اور دانشور تھے۔انہوں نے طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، ان کا آبائی وطن ایران کا شہر مشہد تھا۔عہد قدیم سے ہی ان کا خاندان بادشاہوں کے یہاں ملازم تھا۔چنانچہ 1739ء میں جب نادرشاہ ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو سید امیر علی کے اجداد بھی نادرشاہ کی فوج کے ساتھ ایران کے شہر مشہد سے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ان کا خاندان ایک مشہور شیعہ خاندان تھا۔سید امیر علی کا خاندان ایک امتیازی حیثیت کا مالک ہونے کی وجہ سے ہندوستان آکر بھی حکومت مغلیہ اور نوابان ہند سے وابستہ رہا، مسلمانوں کے زوال کے بعد برطانوی حکومت سے تعلقات استوار ہوگئے۔

سید امیر علی کی پیدائش 6/ اپریل 1849 کو بمقام کٹک اڑیسہ میں ہوئی، یہ پانچ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے، امیر علی کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد ان کے والد اپنے خاندان کے ساتھ اڑیسہ سے بنگال کے شہر کولکاتہ منتقل ہو گئے۔یہاں کچھ دن قیام کے بعد مغربی بنگال کے شہر چن شورا آئے اور پھر یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

پیشے کے اعتبار سے امیر علی ایک وکیل تھے جنہوں نے مسلم مسائل کو حل کرنے میں نہایت دلچسپی دکھائی، اور ساتھ ہی ساتھ برطانوی عہد حکومت میں مسلمانوں کے سیاسی مسائل کی طرف بھی توجہ دی اور انہوں نے مسلم تاریخ پر کئی کتابیں تصنیف کیں، ان کا شمار آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

سید امیر علی نے اپنی تعلیم کا آغاز بنگال کے شہر کولکاتہ سے کیا، حسب دستور سید امیر علی کے والد نے گھر پر ہی ایک عالم دین کے ذریعہ ان کو قرآن مجید اور عربی و فارسی کی تعلیم دلوائی، امیر علی کے والد نے اپنے تمام بچوں کو انگریزی اسکولوں میں تعلیم دلوائی اور عصری علوم کے مواقع سے مکمل فائدہ اٹھایا۔ان کے تمام بھائیوں نے کولکاتہ کا مشہور ادارے مدرسہ عالیہ (جو برطانوی عہد میں مدرسہ کلکتہ کے نام سے جانا جاتا تھا) سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہگلی کالجیٹ اسکول سے تعلیم حاصل کی۔سید امیر علی نے کالج میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور اپنی علمی صلاحیت کی بناء پر دوران تعلیم حکومت برطانیہ سے بہت سارے مقابلہ جاتی وظائف حاصل کیے، حکومت برطانیہ نے ان کے خاندان کو تعلیمی سہولت فراہم کی جس سے انہوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ان کے والد کے اس اقدام سے مسلم سماج کو نہایت حیرانی ہوئی کیونکہ اس دور میں ہندوستانی مسلمانوں میں عام طور پر انگریزوں کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی اور برطانوی حکومت کے ذریعہ دی جانے والی کسی بھی طرح کی مراعات قبول نہیں کی جاتی تھیں۔

سید امیر علی نے 1867ء میں کولکاتہ یونیورسٹی سے گریجویشن اور 1868ء میں تاریخ کے مضمون میں ایم اے اور 1869ء میں قانون (LLB) کی ڈگری حاصل کی، اس کے معاً بعد کولکاتہ میں ہی وکالت شروع کی اور اس میں انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت سے خوب نام کمایا، اپنی قابلیت کی بناء پر وہ اس وقت کے نامور مسلم وکیلوں میں شمار کیے جاتے تھے۔کولکاتہ میں کچھ عرصہ وکالت کے بعد وہ 1869ء میں ہی اعلیٰ تعلیم

کے لیے برطانیہ چلے گئے اور 1873ء تک وہاں مقیم رہے اور تعلیم کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی وسیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے، خاص طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر ہونے والے مباحثوں میں شرکت کرتے رہے اور اس دوران انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر لکچر دیے نیز برطانیہ میں قیام کے دوران انہوں نے شرفاء سے تعلقات استوار کیا۔ وہاں رہ کر انہوں نے آزادی کے معنی ومفہوم سے مکمل طور پر واقفیت حاصل کی، اسی دوران انہوں نے ہندوستان سے متعلق تمام اعلی عہدیداران وافسران سے تعلق پیدا کیے، جن میں جان برائٹ، ہنری اور ان کی اہلیہ سینٹ فاسٹ شامل ہیں۔ 1873ء میں برطانیہ سے واپسی کے بعد انہوں نے سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ساتھ ساتھ کولکاتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس شروع کی، اس کے اگلے سال وہ کولکاتہ یونیورسٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ پریزیڈنسی کالج کولکاتہ میں اسلامی قانون کے لیکچر رہو گئے۔

امیر علی نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی شعور کو بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا لہذا اس مقصد کے لیے انہوں نے کولکاتہ میں قیام کے دوران 1877ء میں ایک سیاسی تنظیم "سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن" کی بنیاد رکھی۔ اس تنظیم کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہوا بلکہ فکر جدید کی تشکیل بھی ہوئی، اور اس تنظیم سے سید امیر علی 25 سال تک وابستہ رہے اور مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے لیے کام کرتے رہے۔

1878ء وہ بنگال لیجسلیٹیو کونسل کے ممبر چنے گئے، پھر 1880ء میں ایک سال کے لیے انہوں نے دوبارہ برطانیہ کا دورہ کیا۔ 1870 اور 1880 کی دہائیوں میں وہ کولکاتہ یونیورسٹی میں قانون کے پروفیسر رہے، 1883ء میں وہ گورنر جنرل کونسل کے ممبر بنائے گئے، 1890ء سے 1904ء تک وہ کولکاتہ ہائی کورٹ کے جج رہے۔

1904ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر مستقل طور پر برطانیہ میں قیام کا فیصلہ کیا۔ اسی دوران 1908ء میں مسلم لیگ کی لندن شاخ کی بنیاد رکھی اور اس کے صدر رہے، حالانکہ یہ تنظیم مسلم لیگ کی ایک شاخ کے طور پر جانی جاتی تھی لیکن حقیقتاً یہ آل انڈیا مسلم لیگ سے بالکل الگ تھی، 1909ء میں وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو Judicial committee of the Privy Council کے ممبر بنائے گئے۔ 1910ء میں انہوں نے برطانیہ میں پہلی مسجد کی بنیا د رکھی اور اس کے لیے ایک مسجد فنڈ قائم کیا، برطانیہ میں مسجد کے قیام کے بعد سید امیر علی نے اپنے دائرۂ عمل کو وسعت دی اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے کام کرنا شروع کیا۔

بعد میں جب خلافت تحریک چلی تو اس کی حمایت کی اور انہوں نے تحریک خلافت کو عالمی پیانے پر متعارف کرایا اور جنوب ایشیاء کے مسلمانوں کے سیاسی تحفظ کے لیے اہم رول ادا کیا۔

سید امیر علی اگر چہ سیاسی انسان تھے لیکن ان کی اصل خدمت اور کارنامہ سیاسی نہیں بلکہ تصنیف وتالیف ہے۔ اپنی آخری عمر میں وہ سیاسی سرگرمیوں سے الگ ہو گئے اور اپنی تمام تر سرگرمیوں کا رخ اسلامی تصنیف وتالیف کی طرف موڑ دیا۔ اس کے ذریعہ انہوں نے اسلام کی روشن تاریخ کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اجتہاد کی ضرورت واہمیت کو اجاگر کیا، مسلم خواتین کی حقوق کے آواز بلند کی اور مسلم شخصی قانون (مسلم پرسنل لاء) کو عہد جدید کے اعتبار سے ترتیب دیا۔

برطانوی عہد کے مسلمانوں کے سیاسی قائد اور معروف اسلامی اسکالر سید امیر علی کا انتقال /4 اگست 1928ء میں برطانیہ میں ہوا۔

انہوں نے کئی تصنیفات بطور یادگار چھوڑی ہیں، ان کی تمام تصنیفات اسلام اور مسلمانوں سے متعلق ہیں، انہوں نے سب سے پہلی کتاب 24 سال کی عمر میں تصنیف کی جب وہ برطانیہ میں مقیم تھے۔ اس کا نام A Critical examination of the life and teaching of Mohammad (1873) ہے۔

ان کی مشہور کتابوں میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

(1) The Personal law of Mohammadans (1880)

(2) The sprit of Islam (1891)

(3) Ethics of Islam (1893)

(4) Islam (1906)

(5) The legal position of women in Islam (1912)

(6) A Short history of saracens (1898)

23.8 اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی

10 شوال 1272ھ/14 جون 1856ء کو ہندوستان کے معروف شہر، بریلی میں مولانا احمد رضا بریلوی پیدا ہوئے۔ آپ کا پیدائشی نام ''محمد'' رکھا گیا، تاریخی نام ''المختار'' (1272ھ) تجویز کیا گیا جب کہ آپ کے دادا، مولانا رضا علی خاں بریلوی نے ''احمد رضا'' نام تجویز فرمایا جس سے آپ مشہور ہوئے۔

مولانا احمد رضا بریلوی کے آباؤ اجداد قندھاری پٹھان تھے۔ عہد مغلیہ میں لاہور آ کر قیام پذیر ہوئے اور ایک مدت کے بعد دہلی آئے اور دونوں جگہ، معزز مناصب پر فائز رہے۔ شجاعت جنگ جناب محمد سعید اللہ خاں اِس خانوادہ کے سب سے بڑے عہدے دار تھے۔ ان کے صاحب زادے سعادت یار خاں مغل عہد حکومت میں روہیل کھنڈ ایک مہم پر روانہ کیے گئے اور فتح یابی کے بعد بریلی کے صوبے دار ہوئے۔ ان کے تین صاحب زادگان تھے۔ اعظم خاں، معظم خاں اور مکرم خاں اور یہ سب بڑے منصب دار تھے۔ بڑے صاحب زادے محمد اعظم خاں خانوادۂ رضویہ بریلی کے مورث اعلیٰ ہیں۔ ان کے صاحبزادے مولانا رضا علی خاں بریلوی، مولانا احمد رضا بریلوی کے دادا اور مولانا نقی علی خاں قادری بریلوی آپ کے والد گرامی ہیں۔

مولانا احمد رضا بریلوی نے ابتدائی اور تمام درسی کتابوں کی تعلیم اپنے والد ماجد مولانا نقی علی خاں بریلوی (وصال 1297ھ/1880ء) سے حاصل کی۔ 1869 میں کم عمری کے زمانے میں ہی تمام درسیات سے فراغت پالی۔ آپ نے میزان ومنشعب وغیرہ جناب مرزا غلام قادر بیگ بریلوی سے پڑھیں۔ آپ کے اساتذہ کی فہرست بہت مختصر ہے جن میں چند نام یہ ہیں:

مرزا غلام قادر بیگ بریلوی، مولانا عبد العلی ریاضی داں رامپوری، سید شاہ ابوالحسین احمد نوری مارہروی، مولانا نقی علی بریلوی، سید آلِ

رسول قادری مارہروی۔

1877 میں مارہرہ ضلع ایٹہ، اتر پردیش میں اپنے والد اور مولانا عبدالقادر برکاتی کے ساتھ سید شاہ آل رسول مارہروی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے سلسلہ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں بیعت ہوئے۔ مرشد طریقت نے پہلی ہی ملاقات میں اجازت اور خلافت عطا کردی۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے براہ راست علم حاصل کیا تھا، مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے 1878ء میں پہلی مرتبہ اور 1905ء میں دوسری مرتبہ حج و زیارت کا سفر کیا۔ ان دونوں سفروں کے دوران انہوں نے حرمین شریفین کے جید علماء سے ملاقاتیں کیں اور ان سے استفادہ کیا۔ وہاں کے علماء کے ساتھ علمی مذاکرات میں حصہ لیا اور اپنی کلامی، فقہی و علمی بصیرت سے علمائے حجاز کو متاثر کیا۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی ایک کامیاب معلم تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا، البتہ کسی مخصوص درس گاہ سے وابستہ نہ ہوئے۔ طلبہ علم حاصل کرنے کے لیے آتے انہیں اپنے گھر پر ہی پڑھاتے۔ اس طرح ہزاروں کی تعداد میں طالبان علم نے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے علم و فضل سے استفادہ کیا اور اپنے اپنے علاقوں میں جا کر علم کے چراغ روشن کیے۔

آپ کے مشہور تلامذہ و خلفا میں درج شدہ حضرات سرفہرست ہیں: مفتی امجد علی اعظمی رضوی، مصنف بہار شریعت، مولانا محمد نعیم الدین مرادآبادی، مولانا سید سلیمان اشرف علی گڑھی، مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی، مولانا برہان الحق جبل پوری، مولانا ظفر الدین بہاری مصنف حیات اعلیٰ حضرت، مولانا حسن رضا خاں بریلوی، مولانا حامد رضا خاں بریلوی، مولانا مصطفیٰ رضا نوری بریلوی، مولانا سید محمد اشرفی محدث کچھوچھوی اور قاضی عبدالوحید فردوسی عظیم آبادی۔

آپ نے فتاویٰ کی شکل میں نقلی اور عقلی علوم و فنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ علم تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول حدیث، تصوف، منطق و فلسفہ، نثر و نظم اور تاریخ و سیر سبھی علوم و فنون میں معیاری کتابیں آپ نے یادگار چھوڑی ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں آپ کو مہارت حاصل تھی۔

مولانا احمد رضا خاں علوم عالیہ اور علوم آلیہ دونوں میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ فقہ و فتاوی سے انہیں خاص شغف تھا۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے مسلمانوں میں دینی تعلیم عام کرنے کے لیے 1904ء میں مدرسہ منظر الاسلام بریلی قائم کیا، جس کا علمی فیضان آج بھی جاری ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کامیاب مدرس اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مبلغ بھی تھے اور انہوں نے دین کی خدمت و تبلیغ میں اپنی بہترین صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ اپنے زمانے کی روایت کے مطابق مباحثوں اور مناظروں میں بھی حصہ لیا۔ مولانا احمد رضا خاں کو مسلمانوں کے دین و ایمان کی بڑی فکر رہا کرتی تھی۔ چناں چہ جب شدھی تحریک نے زور پکڑا تو انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لیے جماعت رضائے مصطفیٰ قائم کی، جس نے اس زمانے میں مسلمانوں کو ضلالت و گمراہی میں پڑنے سے بچانے کے لیے قابل ذکر کوششیں کیں۔

حضرت مولانا احمد رضا کی ذات اور شخصیت جس خاص خوبی کی وجہ سے معروف و مقبول ہے، وہ محبت و اطاعت رسول اور عشق و اتباع رسول ہے۔ آپ کی پوری زندگی شریعت محمدی و سنت نبوی کی پابندی میں گزری ہے جس پر عشق مصطفیٰ کا غلبہ رہا ہے۔ حدائق بخشش آپ کے نعتیہ کلام کا مجموعہ اور آپ کے عشق رسالت کا نمونہ ہے۔ آپ کے دینی و علمی و فقہی کارنامے اور تجدیدی خدمات کی وجہ سے متحدہ ہندوستان کے جمہور علمائے اہل سنت نے آپ کو چودھویں صدی کا مجدد تسلیم کیا ہے اور ''امام اہل سنت'' کے خطاب سے آپ کو یاد کیا جاتا ہے جب کہ اہل محبت

وعقیدت کے حلقے میں "اعلیٰ حضرت" سے آپ کو شہرت حاصل ہے۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی کثیر التصانیف شخصیت ہیں۔ان کی مشہور تصانیف درج ذیل ہیں۔

1۔ کنز الایمان فی ترجمة القرآن قرآن مجید کا ترجمہ ہے۔اس ترجمے کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں نے مختلف تفسیری حواشی بھی لکھے ہیں۔

2۔ فتاوی رضویہ 21 جلدوں میں مولانا احمد رضا خاں کے فتاوی کا مجموعہ۔اس کے علاوہ انہوں نے فتاوی کے مختلف مجموعوں پر حواشی بھی لکھے ہیں۔

3۔ الملفوظ: مولانا احمد رضا خاں کے ملفوظات کا مجموعہ (چار حصوں میں شائع ہوا ہے) کتابوں اور رسالوں کے علاوہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے بڑی تعداد میں اپنے خلفاء اور تلامذہ بھی چھوڑے ہیں، جنہوں نے ان کے بعد بھی ان کے مشن کو جاری رکھا۔ان میں سے چند کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔28 اکتوبر 1921ء کو بریلی میں مولانا احمد رضا خاں کا انتقال ہوا اور وہیں پر محلّہ سوداگران میں مدفون ہوئے۔

23.9 علامہ شبلی نعمانی

شبلی ہندو پاک کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک ہیں جن کی علمی وقلمی رہنمائی کی وجہ سے مسلمانوں کو سمت راہ کے تعین میں آسانی ہوئی۔رفقاء سرسید میں ان کا نام اس لیے معتز ہے کہ انھوں نے بحیثیت عربی استاد طلبہ کے ذہن و دماغ کو اسلامی فکر کی طرف اس وقت موڑا جب مغربی افکار و خیالات ہندی معاشرہ پر اپنا اثر و رسوخ جما چکے تھے اور طلبہ کے کچے ذہن اس سے پراگندہ ہو رہے تھے۔

شبلی 3 جون 1857ء ضلع اعظم گڑھ کے موضع بندول میں جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔یہ سال ہندوستانی مسلمانوں کے لیے کرب ناک تھا۔اسی سال برصغیر ہندو پاک سے مسلم حکومت کا بدست انگریز خاتمہ ہوا۔گھرانے میں ہر طرف تعلیم وتعلم کا چرچہ تھا۔والد ماجد شہر کے نامور وکیلوں میں سے تھے۔وکالت کے علاوہ تجارت بھی کرتے تھے۔شکر کے کارخانے اور نیل کی کوٹھیوں کے مالک بھی تھے۔ان کا شمار علاقہ کے رئیسوں میں ہوتا تھا۔بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی سالانہ آمدنی تیس ہزار سے زیادہ تھی۔وہ سرکار کو چھ ہزار سالانہ مالگذاری دیتے تھے۔ان کے گھرانے میں تعلیم وتعلم کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ ان کے جداعلیٰ شیخ کریم الدین گورکھپور میں بندوبست کے محکمہ میں ملازم تھے تو دادا منشی حسن علی اور ان کے بھائی منشی وارث علی عدالت کلکٹری اعظم گڈھ میں مختار تھے۔اس روایت کو ان کے والد نے بھی برقرار رکھا اور اپنے سبھی بچوں کو عصری تعلیم کی تحصیل کا اس عہد میں موقع فراہم کیا جب کہ مسلمان نہ صرف انگریزوں سے نفرت کرتے تھے بلکہ انگریزی تعلیم کی حرمت کے قائل تھے۔مولانا کے بھائی مہدی حسن نے علی گڑھ سے فراغت کے بعد انگلستان سے بیرسٹری کی۔تیسرے بھائی اسحاق صاحب بھی الہ آباد میں وکیل تھے اور چوتھے بھائی مولوی محمد جنید صاحب نے بھی وکالت کی پڑھائی کی تھی اور منصفی کی نوکری پر فائز رہے۔

شبلی کی تعلیم چھ برس کی عمر میں شروع ہوئی۔قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی کتابوں سے تعلیم کا آغاز ہوا۔حکیم عبداللہ جے راجپوری ان کے پہلے معلم مقرر ہوئے۔ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کرنے کے بعد مدرسہ عربیہ اسلامیہ اعظم گڈھ میں مولوی فیض اللہ صاحب سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔یہاں سے وہ مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور میں تعلیم حاصل کرنے گئے جہاں مولانا فاروق چریا کوٹی صاحب کی

تدریس کا دور دور تک شہرہ تھا۔ یہاں پر انھوں نے روایتی تعلیم کا سلسلہ پورا کیا۔ اس کے بعد دستور زمانہ کے مطابق مشاہیر فن سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے مختلف مقامات کا دورہ کیا۔ اسی سلسلے میں 1870ء میں لکھنؤ گئے اور عبدالحی فرنگی محلی سے کسب فیض کیا۔ رام پور میں انھوں نے مولانا ارشاد حسین صاحب سے فقہ او راصول میں مہارت پیدا کی۔ 1876 میں سہارن پور میں مولانا احمد علی سہارن پوری سے علم حدیث میں گہرا درک حاصل کیا۔ لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنی پوری صاحب سے عربی ادب پڑھا۔ مولانا عبدالحلیم شرر کے مطابق شبلی نے کچھ دنوں تک جون پور میں بھی تعلیم حاصل کی تھی مگر اس کی زیادہ تفصیلات نہیں ملتیں اس کے علاوہ انھوں نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا تھا اور کچھ دنوں تک ضلع بستی میں وکالت بھی کی تھی مگر مزاج کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے اس پیشہ کو خیر آباد کہہ دیا۔

شبلی کے علمی کارناموں کی جلا علی گڑھ میں سرسید اوران کے رفقاء کی سرپرستی میں ہوئی۔ یہیں پر انھیں سمت راہ ملی اور ملت کی زبوں حالی کا احساس ہوا۔ مسلمانوں کی بے علمی اور جہالت کا ادراک بھی یہاں ہوا۔ غرض ملت کے درد کے مداوا کا جذبہ بھی انھیں علی گڑھ تحریک سے ہی ملا۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے اپنے لکھنے کی ابتدا علی گڑھ سے کی۔ وطن میں رہتے ہوئے انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ رسائل کی شکل میں ان کی بعض ابتدائی تحریروں کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے لیکن علی گڑھ آنے کے بعد انھیں مقصد مل گیا چنانچہ علی گڑھ کی سولہ سالہ پروفیسری کے دوران انھوں نے الفاروق، سیرت نعمان، الغزالی، المامون، مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، علم الکلام، الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم اور سیرۃ النبی جیسی کتابیں تصنیف کیں۔ مضامین و مقالات اس پر اضافہ ہیں جو کتابی شکل میں شائع بھی ہو گئے ہیں۔ یہ بھی کتابیں علی گڑھ میں تصنیف نہیں ہوئیں لیکن بیشتر کا تعلق وہیں سے ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے اصلاح نصاب کے تعلق سے جو کچھ ریاست بھوپال اور ریاست حیدرآباد نیز ڈھاکہ یونیورسٹی میں خدمات انجام دیں ان کی اہمیت وافادیت کسی بھی طرح کم نہیں۔ نصاب تعلیم میں اصلاح کی غرض سے ندوۃ العلماء میں جو کچھ خدمات انجام دیں وہ ہماری تاریخ کا نہ صرف روشن باب ہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ میں انقلابی قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزی، ہندی اور سنسکرت کو نصاب کا جزبنانا اس زمانے میں جرأت مندانہ قدم تھا۔ اس کے علاوہ ان کے علمی کارناموں میں شبلی نیشنل کالج اور دارالمصنفین کا قیام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ شبلی نیشنل ڈگری کالج شمالی ہند میں مسلمانوں کے بڑے اداروں میں شامل ہے، جہاں علم جدید کے امہات اور علم کے بیشتر شعبے قائم ہیں۔ دارالمصنفین کی اہمیت نہ صرف ہند و پاک میں ہے بلکہ اپنے تحقیقی کارناموں کی وجہ سے دنیا جہان میں اس کی شہرت ہے۔ اس ادارے کو شبلی نے خود قائم نہیں کیا تھا لیکن انھوں نے اس کا نہ صرف خاکہ تیار کیا تھا بلکہ طریقۂ کار کا تعین بھی کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے انتقال کے ایک سال بعد ان کے شاگردوں نے اس ادارے کو انھیں کے وقف کیے ہوئے باغ و بنگلہ بہ مقام اعظم گڈھ میں قائم کیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک اس ادارہ سے اسلامی تاریخ اور تہذیب و تمدن نیز اسلامیات و اخلاقیات پر مستقل تحقیقی کتابیں شائع ہو رہیں ہیں۔ سید سلیمان ندوی، علامہ حمید الدین فراہی، شاہ عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین ندوی وغیرہم اس ادارے کے آفتاب و ماہتاب تھے جنہوں نے شبلی کے مقاصد کو اپنے قلم کے ذریعہ آگے بڑھایا۔

شبلی نے 18 نومبر 1914ء میں 57 سال کی عمر میں بمقام اعظم گڈھ میں وفات پائی اور دارالمصنفین کے احاطہ میں جو اس وقت ان کا باغ و بنگلہ تھا میں مدفون ہوئے۔ 57 سال کے قلیل عرصہ میں انھوں نے جس طرح کی علمی و قلمی خدمات انجام دی ہیں وہ اہمیت کی حامل ہیں۔ اس طرح کی عبقری شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

23.10 مولانا اشرف علی تھانوی

برصغیر ہندو پاک میں جن علماء کو لازوال شہرت حاصل ہوئی ان میں مولانا اشرف علی تھانوی کا نام بھی نمایاں ہے۔انھوں نے تحریرو تقریر اور قلم وعمل کے ذریعہ کئی نسلوں کو ہی متاثر نہیں کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ایسی راہ عمل چھوڑ گئے کہ جس پر چل کر انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔علم وحکمت کے ذریعہ سے انہوں نے مسلمانوں کی اصلاح اور اخلاق کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ جو ان سے ملا ان کا ہو کر رہ گیا۔اصلاح امت کے حوالے سے انہیں حکیم الامت کا خطاب ملا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ضلع مظفر نگر اتر پردیش کے قصبہ تھانہ بھون میں 19 اگست 1863ء کو پیدا ہوئے۔معزز گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔خاندان میں علم وعمل اور تعلیم وتعلم کا چرچا تھا۔ان کی ولادت کے بعد گھر والوں نے ان کا نام عبدالغنی رکھا۔نانیہالی رشتہ دار حافظ غلام مرتضی پانی پتی جو اہل تصوف سے تھے اور کافی شہرت کے حامل تھے، نے اشرف علی کا نام دیا۔مولانا آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہوئے۔والد ماجد کا نام عبدالحق فاروقی تھا۔ان کا شمار تھانہ بھون کے بڑے جاگیرداروں میں ہوتا تھا۔وہ فارسی زبان میں کافی استعداد رکھتے تھے۔

مولانا اشرف علی تھانوی نے ابتدائی تعلیم والد ماجد، ماموں جان واجد علی اور مولانا فتح محمد وغیرہم سے حاصل کی۔عربی فارسی کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ تھانہ بھون میں ہی حافظ حسین علی میرٹھی کی نگرانی میں قرآن مجید کم سنی میں حفظ کرلیا۔ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1295ھ میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا جہاں پر مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند محمود حسن، اور مولانا یعقوب نانوتوی کی مسند درس بچھی ہوئی تھی۔ان ائمہ کرام اور علماء عظام سے انہوں نے درس لیا جن کی تربیت کا ان کی زندگی پر خاص اثر تھا۔دیوبند میں تعلیم کے دوران انہوں نے راہ سلوک میں قدم رکھا اور مشہور صوفی بزرگ حاجی امداداللہ مہاجر مکی کے بعض خلفا اور مریدوں سے تربیت حاصل کی۔ 1883 میں انھوں نے شریعت وطریقت کی تعلیم سے فراغت حاصل کی اور عملی میدان میں قدم رکھا۔

انہوں نے کانپور کے ایک مدرسہ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا جہاں 14 سال تعلیم وتعلم اور درس وتدریس میں گزارے۔جس سال انہوں نے تدریس کا کام شروع کیا اسی سال انہیں بیت اللہ کی زیارت کا موقع ملا اور خاندان کے بعض بزرگوں کے ساتھ سفر حج پر روانہ ہوگئے۔ یہاں روحانی پیر و مرشد حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے ملاقات کی اور بیعت کی تجدید کر کے باقاعدہ مریدین میں شامل ہوگئے۔1893 میں انہوں نے دوسرا حج کیا۔اس موقع پر انہوں نے تقریباً چھ مہینے وہاں گزارے۔اس دوران پیر ومرشد حاجی صاحب کی خوب خدمت کی اور ان کی زیر سرپرستی ریاضت ومجاہدہ کرتے رہے۔اس کے بعد ہی ان کی زندگی میں تصوف کا ایسا رنگ چڑھا کہ فانی دنیا سے کچھ بھی رغبت نہ رہی۔ پیغمبرانہ مشن کے فرائض کی ادائیگی میں انہوں نے اپنی تمام طاقت جھونک دی۔علم اور تعلیم سے لے کر بیعت وارشاد کے ذریعہ امت کی اصلاح کرتے رہے اور حکیم الامت کے لقب سے مشہور ہوئے۔اصلاح امت کے لئے تعلیم وتدریس کے ساتھ وعظ وتقریر کا ذریعہ اپنایا اور شہر شہر گاؤں گاؤں اور قصبوں میں گھوم پھر کر لوگوں کو صحیح اسلامی تعلیمات پر چلنے کی دعوت دی۔ان کا وعظ اور ان کی تقریریں موثر ہوتیں۔اور دلوں پر اثر کرتی تھیں، اس کے نتیجہ میں ہزار ہا لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا اور غلط عمل سے توبہ کیا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کی زندگی بہت ہی مصروف تھی مگر ان میں ضبط کے ساتھ نظم بھی تھا۔تعلیم وتدریس، وعظ ونصیحت، اور تصنیف و

تالیف کا کام ایک ساتھ جاری رکھتے اور وقت کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ۔ایک اندازے کے مطابق ان کی تحریروں اور تقریروں پر مشتمل کتابوں اور رسالوں کی تعداد تقریباً آٹھ سو سے زیادہ ہے ۔انہوں نے تفسیر ،حدیث ،منطق ،کلام ،عقائد اور تصوف کے موضوعات پر خوب لکھا اور ان میں علمی زبان استعمال کیا لیکن اصلاحی رسائل کی زبان سادہ آسان اور عام فہم ہے ۔اردو ،فارسی اور عربی پر عبور ہونے کی وجہ سے وہ بنیادی ماخذ تک رسائی رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں باوزن اور مدلل ہوتی تھیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی تعلیم و تدریس کا سلسلہ 98-1897 میں بند کر کے اپنے آبائی وطن تھانہ بھون لوٹ آئے اور اپنے مرشد کی خانقاہ کو آباد کر کے لوگوں کی دینی و روحانی تربیت میں مشغول ہوگئے انہوں نے سب سے زور زیادہ تعلیم اور اخلاقی تربیت پر دیا۔قدرت نے انہیں جس علم نوازا تھا اور جس علم کی بدولت ان کی طبیعت میں کشادگی اور وسیع المشربی تھی اس کے قدرداں اپنے اور غیر بھی تھے ۔اختلاف رائے کی ان کے یہاں بہت اہمیت تھی ۔مولانا عبدالماجد دریابادی نے جس طرح اپنے پیرو مرشد سے بعض تفسیری مباحث میں اختلاف کیا ہے اور مولانا نے نصیحت کے ساتھ پذیرائی کی اور بر انہ ماناوہ اعلیٰ ظرفی کی مثال ہے ۔مولانا اشرف علی تھانوی کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

1۔ **بیان القرآن:** یہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر پر مشتمل ہے ۔یہ تفسیر 21 جلدوں پر مشتمل ہے تفسیر اردو زبان میں ہے ۔

2۔ **بہشتی زیور:** اس کتاب میں انہوں نے معاشرتی برائیوں کو ذکر کر کے اس کا علاج اور طریقہ بتایا ہے ۔اس میں خواتین کے مسائل زیادہ ہیں ۔دراصل یہ کتاب آپ کے ایک متوسل کی لکھی ہوئی تھی جس پر انہوں نے نظر ثانی کی چنانچہ مؤلف نے ازراہ عقیدت اس کتاب کو آپ کی طرف منسوب کر دیا۔ یہ کتاب بھی اردو زبان میں ہے ۔اس کی اہمیت یہ ہے کہ برصغیر پاک و ہند کے بھی گھروں میں اس کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی ہے ۔

3۔ **امدادالفتاوی:** یہ کتاب آپ کے فتاوی کا مجموعہ ہے جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے ۔آپ کی وفات کے بعد اس کی ترتیب کا کام ہوا اور یہ کتاب شائع ہوئی ۔یہ بھی بزبان اردو ہے ۔

ہندوستان کا بطل جلیل ،حکیم الامت اور قوموں کے حیات کا نباض ملت کا یہی خواہ 9/جولائی 1943ء مطابق 6/رجب 1362ء کو اس دارفانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کر گیا ۔آپ کے انتقال کی خبر لوگوں پر بجلی بن کر گری ۔عقیدت مندوں نے جنازے میں شرکت کی کوشش کی اور جو لوگ دور دراز مقامات پر تھے اور نہیں پہنچ سکتے تھے ان لوگوں نے جنازہ غائبانہ پڑھ کر عقیدت اور ملی بے داری کا ثبوت دیا ۔ان کے جنازہ میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی ۔

23.11 مولانا ابوالکلام آزاد

بیسوی صدی عیسوی میں ہندوستانی مسلمانوں میں عبقری صلاحیتوں کی مالک شخصیات کا اگر تذکرہ کیا جائے تو ان میں ایک نمایاں نام مولانا ابوالکلام آزاد کا بھی ہوگا ۔مولانا آزاد تحریک آزادی ہند کے نامور سپہ سالار ،دور اندیش سیاست داں ،عظیم صحافی ،بہترین تذکرہ نگار ،تفسیر ،حدیث اور فقہ جیسے دینی علوم کے ماہر اور جدید دنیا کے تقاضوں سے آشنا تھے ۔ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔

مولانا آزاد 22/اگست 1888ء مطابق 14/ذی الحجہ 1305 میں بروز بدھ مکہ معظمہ کے محلہ قدوہ متصل باب السلام میں پیدا

ہوئے۔ ان کے والد کا نام خیرالدین تھا جوان دنوں مکہ ہی میں سکونت پذیر تھے اور وہیں شادی کر لی تھی۔ والد ماجد نے ان کا نام محی الدین رکھا۔ پانچ سال کی عمر میں ان کی رسم بسم اللہ کعبہ میں ادا کی گئی۔ وہاں انہوں نے دو یا تین سال تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد ان کے والد ماجد نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا اور کلکتہ میں مقیم ہو گئے۔ سعودی عرب سے واپسی کے بعد بھی آپ کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ مولانا آزاد کے لیے ہندوستان میں صدمے کا جو پہلا سبب بنا وہ یہ تھا کہ 1898ء میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر تقریباً دس یا گیارہ سال کی رہی ہو گی۔ ان کی والدہ کا تعلق مکہ کے معزز خاندان سے تھا۔

ہندوستان میں اقامت کے بعد مولانا آزاد نے اپنے والد ماجد سے تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے اردو، فارسی اور عربی زبان کی تحصیل کی۔ علاوہ ازیں ان کی تعلیم کے لیے ایک اتالیق بھی مقرر کیا تھا، جن سے انہوں نے درس نظامی کا سبق لیا۔ آپ کے والد ماجد جید عالم تھے، ساتھ ہی صوفی و مرشد بھی تھے۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر کو دوسرے فقہی مسالک سے محفوظ رکھنے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور مولانا آزاد نے والد کے طریقہ تصوف کو بالکل ترک کر دیا۔ 1904ء میں تعلیم کی رسم سے فراغت کے بعد گھر پر ہی درس دینا شروع کیا۔ طلبہ کو صرف ونحو، منطق و فلسفہ، فقہ و حدیث اور معقولات کی کتابیں پڑھاتے تھے۔

مولانا آزاد کی خدمات وسیع و بسیط ہیں۔ ماہرین نے انہیں تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور 1905ء سے لے کر 1920ء تک۔ دوسرا دور 1920ء سے لے کر 1923ء تک اور تیسرا دور 1923ء سے لے کر 1958ء تک ہے۔ پہلے دور میں وہ بطور صحافی مسلم محبِّ وطن کے طور پر ابھرے۔ اس زمانے میں ان پر مغربی استعمار کی عالمگیر ریشہ دوانیوں کے خلاف اتحاد اسلامی کو مضبوط کرنے اور عالمی اسلامی برادری کے احیاء کی بنیاد کو روشن خیالی پر رکھنے کا جذبہ حاوی تھا۔ اس زمانے میں وہ تین مصلحین سے بہت متاثر ہوئے، جن میں سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سید رشید رضا مصری ہیں۔ سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی سے بھی انہوں نے فیض حاصل کیا۔ ان دونوں بزرگوں سے انہوں نے عقلیت پسندی اور جدیدیت، سیرت رسول، ممتاز اسلامی شخصیات کی سوانح، ادبی تنقید، انسان دوستی اور رومانی رجحان کا گر سیکھا۔

دوسرے دور میں وہ سیاست میں سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں وہ خلافت تحریک، سول نافرمانی تحریک اور ستیہ گرہ تحریک میں سرگرمی کے ساتھ شریک دکھائی دیتے ہیں۔

تیسرے دور میں انہوں نے قومی تحریک کے عظیم رہنما کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس دور میں انہوں نے نہ صرف برادران وطن کے لیے اتحاد و اتفاق کی بات کی بلکہ علیحدہ تہذیب اور سیکولر قومیت کی اقدار کے زبردست مبلغ اور محافظ کی حیثیت سے نمایاں کارنامے انجام دیے۔

مولانا آزاد نے اپنی علمی زندگی کا آغاز تعلیم و تعلم اور صحافت سے کیا جس میں وہ تقریباً 27 برس تک مشغول رہے۔ صحافت میں انہوں نے خود اپنے اخبار نکالے اور بعض مجبوریوں کے تحت دوسرے اخبارات کی ادارتی ذمہ داریاں بھی سنبھالیں، جن کی تعداد ایک درجن ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ نیرنگ عالم کلکتہ، المصباح کلکتہ، احسن الاخبار کلکتہ، لسان الصدق کلکتہ، خدنگ نظر لکھنؤ، الندوہ لکھنؤ، وکیل امرتسر، دارالسلطنت کلکتہ، الہلال کلکتہ، البلاغ کلکتہ، پیغام کلکتہ، پیام کلکتہ، الجامعہ کلکتہ، الہلال کلکتہ (دور ثانی) وغیرہ۔

مولانا آزاد صحافت کے راستے سیاست میں آئے اور بعد میں سیاست کا رنگ ان پر کچھ ایسا چڑھا کہ وہ صرف اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اس عہد کا شاید یہی تقاضا رہا ہو۔ میدان سیاست میں وہ آخر عمر تک رہے۔ 1947ء میں قومی

حکومت کے قیام کے بعد وہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کے محکموں کے وزیر رہے۔اس دوران انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں اور ہندوستان میں جدید تعلیم کے معمار اول قرار پائے۔مولانا آزاد بطور وزیر تعلیم انڈین کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (سی ایس آئی آر)، انڈین کونسل آف ایگری کلچرل ریسرچ (آئی سی اے آر)، انڈین کونسل آف سوشل ریسرچ، انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے علاوہ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (یو جی سی)، ساہتیہ اکیڈمی، سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی جیسے شعبے کی بنیاد رکھی۔انہوں نے ہی انڈین کونسل ایجوکیشن کی بھی بنیاد رکھی تھی جس کے تحت انڈین انسٹیٹیوٹ آف کھڑک پور کا قیام عمل میں آیا تھا۔ آگے چل کر اسی ادارے کی نگرانی میں آئی آئی ٹیز بامبے، مدراس، کانپور، دہلی کا قیام عمل میں آیا۔اس کے علاوہ انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ووکیشنل ٹریننگ، تعلیم بالغان کی طرف خصوصی توجہ دی تھی۔علاوہ ازیں انہوں نے یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، سکنڈری ایجوکیشن کمیشن بھی مقرر کیا تھا تا کہ تعلیمی صورت حال کا جائزہ لیا جاسکے۔یہ مولانا آزاد ہی تھے جنہوں نے 3+2+10 کے تعلیمی سلسلے کو رواج دیا تھا۔اسکول آف پلاننگ اینڈ آرکیٹکچر کی بھی بنیاد رکھی تھی تا کہ شہروں کی ترقی میں اس ادارہ سے خصوصی کام لیا جاسکے۔

سیاست کی مشغول زندگی کی وجہ سے مولانا کو تصنیف وتالیف کا زیادہ موقع نہیں ملا لیکن پھر بھی مصروف زندگی میں انہوں نے بعض کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد بقول احمد سعید ملیح آبادی 33 سے زیادہ ہوتی ہے۔ان میں تذکرہ، غبار خاطر، تفسیر ترجمان القرآن کافی شہرت کی حامل ہیں۔علاوہ ازیں میگزینوں اور اخبارات کے مضامین اس پر اضافہ ہیں جو بعد میں کتابی صورت میں مدون ہوئے۔ماہرین نے ان کی تصنیفات کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔13 سے 18 برس تک کی عمر کی تصنیفات کی تعداد چودہ ہے اور 18 برس کے بعد کی تصنیفات کی تعداد 19 سے زائد بتائی جاتی ہے۔ان میں سے زیادہ تر تحریریں دستیاب نہیں ہیں۔

مولانا آزاد نے قومی خدمات کے سلسلے میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔آزادئ ہند کے لیے انگریزوں سے اس وقت مذاکرات کیے جب تمام قومی رہنما نظر بند تھے۔علاوہ ازیں یہ پہلے ایسے کانگریسی لیڈر تھے جو کم عمری کے باوجود کانگریس کے صدر منتخب کیے گئے۔انہیں کی صدارت کے زمانے میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی بات چلی۔

مولانا آزاد علمی، قومی اور ملی خدمات انجام دیتے ہوئے 22 رفروری 1958ء کو اس دار فانی سے دار جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور قومی حکومت نے سوگ کا اعلان کیا۔

23.12 سید عابد حسین

سید عابد حسین کا شمار بھی مسلم دانشوروں میں ہوتا ہے۔نہ صرف ماقبل آزادی بلکہ اس کے بعد بھی انہوں نے ملت کے لیے گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت ہے۔جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ آکر اس ادارے کے قیام و بقا میں نمایاں رول ادا کیا تھا۔جنگ آزادی میں بھی وہ شریک رہے اور اس وقت کے قومی قائدین کے شانہ بشانہ حریت ملت کے لیے خدمات انجام دیں۔پنڈت جواہر لال نہرو، گاندھی جی، مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر، سردار پٹیل، سروجنی نائیڈو اور اس عہد کے دیگر بڑے قائدین سے ان کے مراسم تھے۔قومی قائدین سے ذاتی تعلق ہونے کے باوجود بھی انہوں نے عہدے کی خواہش نہیں کی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی عسرت بھری زندگی پر قانع رہے۔جامعہ کے استحکام و بقا میں ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

سید عابد حسین 25 رجولائی 1896ء میں بروز ہفتہ بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد حامد حسین ملازم تھے اور دادا سید مہدی حسین تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔ان کا تاریخی نام منظور حسین تھا مگر والدین پیار سے انہیں چنومیاں کہتے تھے۔ان کی تعلیم کا آغاز ناظرہ قرآن اور ابتدائی عربی و فارسی کی کتابوں سے ہوا۔اس کے لیے ایک مولوی صاحب بطور اتالیق مقرر کئے گئے تھے۔اس کے بعد جہانگیریہ اسکول بھوپال میں داخل کرائے گئے جہاں انہوں نے اردو قواعد اور دوسری کتابیں پڑھیں۔اس کے بعد ان کا داخلہ آبائی وطن داعی پور قنوج کے پرائمری اسکول میں کرایا گیا جہاں وہ ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے تھے۔1910ء میں باضابطہ ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ اسکول میں تعلیم کے علاوہ ہاکی اور ٹینس کھیلنے کا شوق بھی تھا۔ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد 1916ء میں بیس برس کی عمر میں الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس سال پانچ ہزار طلبہ میں سے سترہ سو طلبہ ہی کامیاب ہو سکے تھے اور ان میں بھی صرف سات طلبہ اول ڈویزن حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے،ان ہی میں ایک عابد صاحب بھی تھے۔میٹریکولیشن کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد شمالی ہند کے مشہور میور سینٹرل کالج الہ آباد میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا۔انگریزی زبان و ادب کے علاوہ کیمیا،طبعیات اور ریاضی کا مضمون اختیار کیا مگر اس امتحان میں انہیں دوسرے درجے کے نمبر ملے۔بی اے کی تعلیم بھی انہوں نے الہ آباد سے حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کی تحصیل کے دوران انہیں ریاست بھوپال سے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ بھی ملتا تھا جس کی وجہ سے انہیں کافی سہولت ہوئی،وہیں پر ان کے تعلقات پنڈت موتی لال نہرو،جواہر لال نہرو،سروجنی نائیڈو اور گاندھی جی سے ہوئے جو آخر عمر تک قائم رہے۔

بی اے میں نمایاں کارکردگی کے بعد بھوپال کے پرنس حمید اللہ خاں کی تحریک اور مالی معاونت کی وجہ سے انہوں نے علی گڑھ کالج سے انگریزی میں ایم اے پاس کیا۔اس دوران بھی انہیں ریاست کی طرف سے ساٹھ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا رہا۔ڈاکٹر سید عابد حسین نے مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے ستمبر 1921ء میں لندن کا سفر کیا جہاں تاریخ پر یوی کا امتحان پاس کرکے آکسفورڈ میں داخلہ لیا لیکن مالی تنگی اور عسرت کی وجہ سے جرمنی جانے کا فیصلہ کیا جہاں انہوں نے برلن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔یہاں ان کے استاد ڈاکٹر اشپرانگر تھے۔ان کی نگرانی میں انہوں نے ہربرٹ اسپنسر کے فلسفۂ تعلیم پر مقالہ لکھا۔دسمبر 1925ء کے آخر میں وہ ڈاکٹریٹ کے امتحان میں امتیازی حیثیت سے پاس ہوئے۔اس دوران انہوں نے کافی دقتوں کا سامنا کیا اور احباب سے قرض لے کر تعلیم کو جاری رکھی۔بعد ازاں ان کے لیے ریاست بھوپال سے دوبارہ وظیفہ جاری ہوگیا جس سے کافی سہولت ملی۔تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے جہاں انہوں نے تاعمر ملت کے نونہالوں کی تربیت کی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین کی علمی اور قومی و ملی خدمات کا دائرہ جامعہ ملیہ اسلامیہ تھا۔تعلیم سے فراغت کے بعد وہ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ہمراہ فروری 1926ء میں پیرس سے دہلی آئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں قیام کیا۔یہاں ان تینوں حضرات کا ایک ساتھ تقرر ہوا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین رجسٹرار بنائے گئے اور ساتھ ہی وہ رسالہ جامعہ کے مدیر بھی مقرر ہوئے۔اپنی آمد کے تیسرے مہینہ یعنی اپریل 1926ء میں انہوں نے ''پیام تعلیم'' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے ذریعہ جامعہ کے کاموں کی تفصیل اور اس ادارہ کے مقاصد لوگوں تک پہنچائے جانے لگے۔بعد ازاں وہ شعبۂ تصنیف و تالیف کے ناظم بھی مقرر ہوئے۔انہوں نے اپنے رفقا عبدالعلیم اور سعید انصاری کی مدد سے ایک ایسی تجویز پر عمل کیا جس سے ہر سال نئی کتابیں پڑھنے اور رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم کا مطالعہ کرنے کا شوق پیدا ہو سکے۔اس سلسلے میں ترغیب دلانے کی غرض سے یہ اعلان کیا کہ جو شخص سال میں چوبیس روپیہ جمع کرائے گا اسے ہر تیسرے مہینہ اس کی پسند کی نئی کتابیں دی جائیں گی۔رسالہ

جامعہ مفت دیا جائے گا اور پیام تعلیم کی خریداری میں بھی رعایت دی جائے گی۔ان کی حسن کارکردگی سے جامعہ کے ذمہ داران بہت متاثر ہوئے۔

جامعہ میں انہیں فلسفہ پڑھانے پر معمور کیا گیا۔انہوں نے دلجمعی سے اس مضمون کی تدریس کی۔علاوہ ازیں انہوں نے ''مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ'' جیسے شہرہ آفاق مضامین کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیم کو اہم ترین قومی مسئلہ سے تعبیر کیا اور مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ اپنی نسلوں کو اسلامی روایات پر مبنی زیور تعلیم سے آراستہ کریں۔اردو اکادمی دہلی کے قیام و بقا میں بھی سید عابد حسین کی محنت اور کوشش کا بڑا دخل ہے۔انہوں نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تصنیف و تالیف کے لیے اس طرح کے مستقل ادارے کی ضرورت ہے جہاں اساتذہ چند رہنما طلبا اور بیرونی علماء کے ساتھ مل کر تحقیقی کام کریں۔اس ادارہ کا نام اردو اکادمی ہو۔بعد میں جب اس ادارہ کا قیام جامعہ میں عمل میں آیا تو وہ اس کے سربراہ مقرر ہوئے۔

سید عابد حسین صاحب کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ جب جامعہ کو مالی مشکلات پیش آنے لگیں تو انھوں نے بھی ذاکر صاحب اور مجیب صاحب کے ساتھ اپنے مشاہرہ میں سے سو روپیہ کم کر دیا لیکن پھر بھی جامعہ کو استحکام نہیں ملا تو مذکورہ دونوں بزرگوں کی طرح انہوں نے بھی بیس برس تک ماہانہ ڈیڑھ سو روپیہ پر جامعہ کی خدمت کا عہد کیا۔ڈیڑھ سو روپیہ کے بجائے مجیب صاحب اور عابد صاحب سو سو روپیہ پر خدمت کرنے لگے اور ذاکر صاحب پچہتر روپیہ مشاہرہ لینے لگے۔گھر کی ذمہ داریوں کی وجہ سے عابد صاحب کا خرچ سو روپیہ میں پورا نہیں ہوتا تھا اس کے لیے وہ قرض لیتے تھے،اس طرح وہ قرض کے بوجھ تلے دبتے چلے گئے۔چنانچہ مالی دشواریوں کی وجہ سے 1930ء میں جامعہ سے رخصت لے کر اورنگ آباد میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے جہاں انہوں نے دو سو روپیہ ماہوار گوئٹے کی شاہکار فاوسٹ کا اردو میں ترجمہ کیا اور مولوی عبدالحق کے زیر تربیت انگریزی اردو لغت کی تیاری میں مدد دی۔

ان کا یہ کارنامہ بھی قابل ذکر ہے کہ 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے وقت جب مسلمانوں کے جان و مال، عزت و آبرو کا تحفظ ناممکن ہو گیا اور بیشتر جگہوں پر مسلمانوں نے پاکستان جانے کو ترجیح دی تو انہوں نے مسلمانوں کے اندر خود اعتمادی کا احساس جگانے اور انہیں نئے حالات سے روشناس کرانے کی غرض سے ''نئی روشنی'' کے نام سے ایک ہفت روزہ پرچہ نکالا۔یہ رسالہ 15/جون 1948ء کو پہلی دفعہ منظر عام پر آیا اور دو سال تک شائع ہوتا رہا۔اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور مسلمانوں میں قومی حکومت کے تئیں اعتماد بحال ہوا۔

19/جون 1962ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کو Deemed University کا درجہ دیا گیا اور 1975ء میں جب یونیورسٹی کے اساتذہ کے لیے ترمیم شدہ تنخواہیں سینٹرل یونیورسٹیوں میں نافذ ہو گئیں اور انہیں جامعہ میں لاگو نہیں کیا گیا تو سید عابد حسین صاحب نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی توجہ اس جانب مبذول کراتے ہوئے اس سلسلے میں عملی اقدام کرنے کی درخواست کی۔

سید عابد حسین صاحب مختلف اداروں اور تنظیموں سے وابستہ رہے۔وہ گاندھی اسمارک ندھی کے ٹرسٹی اور اس کے ایگزیکوٹیو کونسل کے ممبر تھے۔ترقی اردو بورڈ کے رکن تھے۔اردو انسائیکلوپیڈیا اور اردو انگریزی لغت کے بورڈ کے چیئرمین بھی تھے۔1967ء میں انہوں نے اسلام اینڈ ماڈرن ایج انگریزی اور اسلام اور عصر جدید کے نام سے اردو میں جامعہ میں الگ سے ادارہ قائم کیا۔امریکہ کی راک فیلر فاؤنڈیشن کی جانب سے 1953ء میں ان کی اپنی اردو تصنیف ''ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب'' کو انگریزی کا قالب بخشنے کے لیے اور ''گاندھی اور نہرو کی راہ'' کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کرنے کی غرض سے مدعو کیا جسے انہوں نے منظور کر لیا۔

سید عابد حسین صاحب ایک ادیب، زود گو شاعر اور ممتاز مترجم تھے۔ ان کی تصانیف اور تراجم کی تعداد چالیس سے زائد ہے۔ اردو میں ان کی تقریباً دس تصنیفات پائی جاتی ہے اور انگریزی میں نو اور ان کے تراجم کی تعداد 23 ہے۔ اردو میں ان کی تصنیف میں 'بزم بے تکلف' ہندوستانی قوم پروری اور ہندوستانی ثقافت، ہندوستانی قومی ثقافت، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں، مسلمان اور عصری مسائل بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی انہیں خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے 1976ء میں انھیں پدم بھوشن کا ایوارڈ دیا۔

سید عابد حسین قومی و ملی خدمات ادا کرتے ہوئے تقریباً 82 سال کی عمر میں کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر 13 / دسمبر 1978ء کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح ملت کا یہ بطل جلیل ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ ان کی بیوی مصداق بیگم دنیائے ادب میں صالحہ عابد حسین کے نام سے مشہور ہوئیں۔

23.13 خلاصہ

اس اکائی کے خلاصے کے طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا مسلم شخصیات نے اپنی سکت بھر مسلم سماج اور معاشرے کی رہنمائی کی اور اس کی تعمیر و ترقی میں شامل رہے۔ انہوں نے نہ صرف مسلم معاشرے کے فکری دھارے کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا بلکہ ان کے اندر مثبت افکار بھی پیدا کیے اور مختلف شعبوں میں ان کی رہنمائی فرمائی۔ مسلم معاشرے پر مذکورہ بالا شخصیت کے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں اور یہ اثرات صرف کسی ایک خاص شعبے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان کا دائرہ کار مذہبی زندگی سے لے کر سیاسی، سماجی اور معاشی سطحوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے ان شخصیات کو نہ صرف جدید مسلم معاشرے کی تشکیل کا معمار شمار کیا جاتا ہے بلکہ قومی اور ملکی معماروں میں بھی انہیں گنا جاتا ہے۔

23.14 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

1۔ شاہ عبدالعزیز کی زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کیجیے۔

2۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے کردار کی وضاحت کیجیے۔

3۔ سید نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمات کا تذکرہ کیجیے۔

درج ذیل سوالات کے جوابات پندرہ سطروں میں دیجیے۔

4۔ سید امیر علی کی سماجی و سیاسی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

5۔ مولانا احمد رضا خاں کی زندگی اور ان کی کارگزاریوں سے بحث کیجیے۔

6۔ مولانا شبلی نعمانی کی تصنیفات کے حوالے سے ان کی زندگی کا جائزہ پیش کیجیے۔

23.15 مطالعہ کے لیے معاون کتابیں

1۔ حیاتِ شبلی: سید سلیمان ندوی

2۔ نقوش: (شخصیات نمبر)

3۔ پرانے چراغ (تین جلدیں): ابوالحسن علی ندوی

4۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ: متعلقہ شخصیات

اکائی۔ 24 : موجودہ صورت حال

اکائی کے اجزاء

24.1 مقصد

اس اکائی کا مقصد طلبہ کو ہندوستانی مسلمانوں کے حقیقی حالات سے آگاہ کرانا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مسلمانوں کے متعلق مختلف قیاس آرائیاں عام ہیں اور اکثر میڈیا (media) بھی مسلمانوں کی ایک مفروضہ (Stereotyped) شبیہ کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔

اس اکائی کا مقصد ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں ٹھوس معلومات فراہم کر کے ان کے متعلق رائج غیر حقیقی تصورات و مفروضات کو دور کرنا ہے۔

24.2 تمہید

اس اکائی میں جو معلومات ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق فراہم کی گئی ہیں وہ بڑے پیمانے پر اور منظم انداز میں کئے گئے جائزوں اور

مردم شماری کے اعداد و شمار کے تجزیوں پر مبنی ہیں۔ جن اداروں وتنظیموں کے جائزوں کا استعمال کیا گیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

- ☆ نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن (NSSO)
- ☆ نیشنل فیملی ہیلتھ سروینر (NFHS)
- ☆ نیشنل کاؤنسل آف اپلائیڈ اکنامک ریسرچ (NCAER)
- ☆ اپریشنز ریسرچ گروپ (ORG)

لیکن مسلمانوں کا مطالعہ کرتے وقت ایک دشواری یہ پیش آتی ہے کہ کسی بھی بڑے فرقے کی طرح ہندوستانی مسلمان بھی ہم جنس، ہم رنگ، یا یکساں گروہ نہیں ہیں۔ کسی بھی دوسرے مذہبی گروہ کی طرح ہندوستانی مسلمانوں میں بھی معاشی، سماجی، لسانی، نسلی، علاقائی اور ذات برادری کا فرق پایا جاتا ہے۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کے اندرونی فرق اور اختلافات کو دیکھتے ہوئے انہیں ایک یک رنگ جماعت تصور کرنا غلط ہوگا۔ اس کے باوجود مطالعہ اور جائزے کی خاطر یہ ممکن اور ضروری ہے کہ مجموعی طور پر ان کے متعلق کچھ عمومی باتیں کہی جا سکیں۔

24.3 آزادئ ہند کے بعد مسلمانوں کے حالات کا اجمالی تعارف

ملک کے دستور کے مطابق آزاد ہندوستان کو ایک سیکولر اور جمہوری ملک قرار دیا گیا۔ یعنی حکومت ہند مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار ہے اور لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ ساتھ ہی ملک کے تمام باشندوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ انتخابات کے ذریعہ حکومت کرنے والے نمائندے چنیں۔ آزاد ہندوستان میں مقیم مسلمانوں کی حیثیت ملک کی سب سے کثیر التعداد اقلیت کی ہے۔ دستور ہند نے انہیں ہندوستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے برابر کے حقوق اور ترقی کے مساوی مواقع فراہم کئے۔

لیکن بظاہر خوشگوار معلوم ہونے والے حالات ہندوستان کی مسلم قوم کے لئے زیادہ سازگار ثابت نہیں ہوئے۔

اول یہ کہ آزادئ ہند کے خوشگوار واقعہ کے ساتھ جڑی ہوئی ہے تقسیم ہند کی تلخ حقیقت جو کہ دنگے، فسادات اور خون خرابے کی ہولناکیوں کے زیر سایہ واقع ہوئی۔ یہ بات بھی باعث افسوس ہے کہ اکثر مسلمانوں کو ہی تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا اور 67 سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی انہیں وقتاً فوقتاً اس کا احساس دلایا جاتا ہے۔

بظاہر ہندوستانی مسلمانوں نے ترقی کی نئی منزلیں چومی ہیں، اعلیٰ عہدوں اور نمایاں شخصیتوں میں بے شمار مسلمان نظر آتے ہیں مگر بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمان آج بھی بے شمار مسائل سے دوچار ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش مسائل کے کئی پہلو ہیں جن کے تین اہم حصے ہیں۔ تشخص، تحفظ اور مساویانہ سلوک۔ یعنی اپنی مذہبی، ملی اور دیگر شناختوں میں توازن بنائے رکھتے ہوئے دوسرے فرقوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنا، عدم تحفظ کے احساس کی وجہ سے اپنی جان، مال وسلامتی کی فکر اور تیسرے غیر منصفانہ سلوک کا احساس جو اقتصادی ترقی سے پیدا ہونے والے مواقع کے ثمرات سے محرومی پر منتج ہوتا ہے۔

مسلمانوں کو بیک وقت وطن دشمن ہونے اور نازبرداری کا دوہرا الزام سہنا پڑتا ہے۔ ایک طرف انہیں بار بار اپنی حب الوطنی اور ملک

دشمنی میں ملوث نہ ہونے کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔دوسری طرف اس بات پر بھی غور نہیں کیا جاتا کہ جس نا زبرداری کا ان پر الزام ہے اس کے نتیجہ میں انہیں کوئی ترقی حاصل نہیں ہوئی ہے۔

انہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اکثر انہیں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے جس کا احساس نوکری اور مکان ڈھونڈنے میں اور اسکولوں میں داخلہ کے وقت زیادہ ہوتا ہے۔

ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ مسلم خواتین کے مسائل ہوں یا مسلم قوم کی پسماندگی، ان سب کے لیے مذہب اسلام، اسلامی شریعت یا پھر خود مسلم قوم کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔

سیاسی امور میں بھی مسلمانوں کو اکثر امتیازات سے گذرنا پڑتا ہے۔مثال کے طور پر اکثر ووٹر فہرستوں (Voters' lists) سے مسلمانوں کے نام غائب رہتے ہے نیز مسلم اکثریتی اسمبلی حلقوں کو مخصوص (Reserved) حلقہ قرار دیا جاتا ہے۔ان وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کو ووٹ دینے اور اپنے علاقوں سے منتخب ہونے میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔

تمام مذہبی فرقوں اور سماجی طبقوں (جنھیں اب سماجی و مذہبی طبقے یا SRC یعنی (Socio-Religious Community) کہا جائے گا کے سماجی و معاشی حالات کا جائزہ لینے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ (General) یا عمومی زمرے کے مسلمانوں کے سماجی اور معاشی حالات ہندو OBC (دیگر پسماندہ طبقوں) سے ابتر ہیں۔اور مسلم OBC کے حالات تو عمومی زمرہ (General) کے مسلم طبقے سے بھی بدتر ہے۔

24.4 مسلم آبادی

24.4.1 تعارف

2011ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 14.2 فیصد تھا۔ 2001ء کی مردم شماری کے اعتبار سے مسلمانوں کی کل تعداد 138 ملین (یعنی تیرہ کروڑ اسی لاکھ) سے زیادہ تھی۔OBC میں ان کا تناسب 15.7 فیصد تھا۔

مسلمان ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہے اور انڈونیشیا کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی جو پاکستان اور بنگلادیش کی مسلم آبادی کے برابر اور دنیا کے دوسرے مسلم مما لک کی آبادی سے زیادہ ہیں۔

24.4.2 علاقائی تقسیم

ہندوستان میں مسلم آبادی کا پھیلاؤ یکساں نہیں ہے۔چار ریاستوں یعنی اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور مہاراشٹر میں ہندوستان کے آدھے سے زیادہ مسلمان آباد ہیں۔

2001ء کی مردم شماری کے مطابق مختلف ریاستوں میں مسلمانوں کی تعداد کچھ اس طرح تھی۔

ریاستیں	مسلمانوں کی آبادی
اتر پردیش	31 ملین (تین کروڑ دس لاکھ)
مغربی بنگال، بہار، مہاراشٹر	10 ملین (ایک کروڑ) سے زیادہ
جموں وکشمیر، کیرل، کرناٹک، آندھرا پردیش	5-10 ملین (پچاس لاکھ سے ایک کروڑ) کے درمیان
گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، جھارکھنڈ، تمل ناڈو	3-5 ملین (تیس سے پچاس لاکھ) کے درمیان
دہلی، اترا کھنڈ، ہریانہ	1-2 ملین (دس سے بیس لاکھ) کے درمیان
پنجاب، اڑیسہ	1 ملین (دس لاکھ) سے کم

لکشدیپ کی تقریباً تمام آبادی مسلم ہے لیکن اس علاقہ کی آبادی بہت کم ہے۔ جموں وکشمیر واحد ریاست ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔

کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب:

ریاستیں	مسلم آبادی کا تناسب (%)
جموں وکشمیر	67فیصد
آسام، مغربی بنگال، کیرل	20فیصد سے زیادہ
اتر پردیش، بہار، جھارکھنڈ، کرناٹک، اترا کھنڈ، دہلی، مہاراشٹر	10-20فیصد
آندھرا پردیش، گجرات، راجستھان، مدھیہ پردیش، ہریانہ، تمل ناڈو، منی پور، تریپور، گوا، پانڈیچری، دمن اور دیو، انڈمان نکوبار	5-10فیصد
اڑیسہ، پنجاب، چھتیس گڑھ، ہماچل پردیش	5 فیصد سے کم

1961 اور 2001ء کے درمیان زیادہ تر ریاستوں کی مسلم آبادی کے تناسب میں معمولی اضافہ ہوا ہے۔ صرف کیرل، آسام، مغربی بنگال اور دہلی میں یہ اضافہ کچھ زیادہ ہے یعنی 5 فیصد۔ جموں وکشمیر واحد ریاست ہے جہاں اس دوران مسلم آبادی کا تناسب 68.3فیصد سے گھٹ کر 67فیصد ہو گیا۔

2001 کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کے 594 اضلاع میں سے 20 میں مسلم اکثریت ہے جن میں سے 10 میں مسلم آبادی 75فیصد سے زیادہ ہے۔ 75فیصد سے زیادہ آبادی والے ضلعوں میں لکشدیپ، آسام کا دوبری ضلع اور جموں وکشمیر کے 8 اضلاع ہیں۔ اکثریت

والے 10 اضلاع میں آسام کے 5، جموں وکشمیر کے 2، کیرل، بہار اور مغربی بنگال کا ایک ایک ضلع ہے۔

38 ضلعوں میں مسلم آبادی 25 فیصد سے زیادہ لیکن 50 فیصد سے کم ہے۔ 224 ضلعوں میں مسلم آبادی بہت معمولی ہے یعنی 5 فیصد سے بھی کم۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عام طور پر ہندوستان کی ریاستوں اور ضلعوں میں مسلم ارتکاز، اجتماع یا یکجائی (Concentration) زیادہ نہیں ہے۔

24.4.3 حجم اور اضافہ

1961 اور 1991 کے درمیان شرح اموات کی بہت زیادہ گراوٹ کے باعث ہندوستان کی آبادی میں بہت زیادہ اضافہ ہوا یعنی 134 فیصد۔ مسلم آبادی میں 194 فیصد اضافہ ہوا جو اوسط سے کافی زیادہ تھا لیکن مسلم آبادی میں ہوا یہ اضافہ تمام ریاستوں میں یکساں نہیں تھا۔

پنجاب اور ہریانہ کی مسلم آبادی تقسیم ہند کے بعد چوں کہ بہت کم ہوگئی تھی اس لئے یہاں اضافہ بہت زیادہ نظر آتا ہے یعنی 300 فیصد۔ آندھرا پردیش، کیرل اور گجرات میں تقریباً 150 فیصد اور تمل ناڈو میں 122 فیصد اضافہ رہا۔ جموں وکشمیر جو مسلم اکثریت کا واحد صوبہ ہے اس رجحان سے مستثنیٰ ہے۔ یہاں مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح 179 فیصد تھی جو عام آبادی کے اضافہ کی شرح 185 فیصد سے کم تھی۔ اکثر ریاستوں میں مسلم اور عام آبادی کی شرح نمو میں تقریباً وہی فرق رہا جو وسطاً ملکی سطح پر رہا۔

پچھلی دہائی کی بہ نسبت 2001-1991 کی دہائی میں ہندوستان کی عام اور مسلم دونوں آبادیوں کی شرح نمو میں گراوٹ نظر آتی ہے البتہ مسلم آبادی کی بڑھوتری کی رفتار میں آئی گراوٹ عام آبادی سے زیادہ ہے۔ مسلم اور عام آبادی کے بڑھنے کی رفتار میں جو فرق تھا وہ دھیرے دھیرے کم ہو رہا ہے۔

24.4.4 شہری آبادی

ہندوستان کی عام آبادی کی طرح بیشتر مسلمان بھی دیہاتوں میں رہتے ہیں البتہ 1961 سے یہ دیکھا گیا ہے کہ مسلم شہری آبادی کا تناسب دیگر لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ رہا ہے۔ 2001 میں 28 فیصد ہندوستانیوں کے مقابلہ میں 36 فیصد مسلمان شہروں میں رہتے تھے۔

ہندوستان کی عام آبادی کے مقابلہ میں مسلمان کاشتکاری پر کم منحصر ہیں۔ 2001 میں 75 فیصد دیہی کارکن زراعت سے جڑے تھے (کاشتکار یا زرعی مزدوروں کی حیثیت سے) لیکن مسلم دیہی کارکنندگان میں یہ تناسب صرف 60 فیصد تھا۔

24.4.5 شرح پیدائش

مسلمانوں کی شرح پیدائش اوسط سے زیادہ ہے لیکن اس میں گراوٹ آرہی ہے اور یہ گراوٹ اوسط شرح پیدائش میں آنے والی گراوٹ سے زیادہ ہے۔

مسلم شرح پیدائش سماجی اور معاشی خصوصیات اور علاقہ کے ساتھ بدلتی نظر آتی ہے۔

کیرل، تمل ناڈو، کرناٹک، جموں وکشمیر اور آندھرا پردیش میں مسلم شرح پیدائش کچھ شمالی ریاستوں کی نہ صرف مسلم بلکہ دیگر سماجی

وندہبی طبقوں (SRCs) کی شرح پیدائش سے بھی کم ہے۔ان صوبوں میں مسلم اوراوسط شرح پیدائش کے درمیان فرق بھی کم ہے۔

مطالعہ کی بناپر یہ ماناجاتا ہے کہ تعلیم، آمدنی اورصحت کی سہولیات کی فراہمی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ شرح پیدائش گھٹتی جارہی ہے۔

24.4.6 ضبط تولید

اکثر یہ ماناجاتا ہے کہ اسلام مانع حمل طریقوں کا مخالف ہے اس لئے مسلمان ان کا استعمال نہیں کرتے جب کہ ایسانہیں ہے اور جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک تہائی (1/3) سے زیادہ مسلم جوڑے ان طریقوں کا استعمال کرتے ہیں۔اگر چہ یہ اوسط سے کم ہے۔

مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ضبط تولید کے طریقوں کے استعمال میں فرق کی بڑی وجہ تعلیم کا فرق ہے۔لیکن مسلمانوں میں ان کا استعمال عام لوگوں کے مقابلہ میں کم ہے۔اور مسلم شرح پیدائش اوسط سے زیادہ ہونے کی ایک اہم وجہ یہی ہے۔وقت اور ترقی بالخصوص تعلیمی ترقی کے ساتھ مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان فرق کم ہوتا نظر آتا ہے۔

تجزیہ سے مسلم شرح پیدائش کے زیادہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی پتہ چلتی ہے کہ مسلم معاشرہ میں بھی ہندوؤں کی طرح لڑکوں کو ترجیح دی جاتی ہے البتہ لڑکیوں سے بے رغبتی ہندوسماج کے مقابلہ میں کم پائی جاتی ہے۔جس کے سبب لڑکیوں کی پیدائش کو روکا نہیں جاتا اور ایسے خاندان بڑا ہو جاتا ہے۔

24.4.7 شرح اموات

مطالعہ وتجزیہ سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ 1981 سے 2006 تک لگاتار دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں مسلمانوں میں نوزائدوں اور بچوں کی شرح اموات نہ صرف قدرے کم ہے بلکہ اس میں گراوٹ بھی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تیزی سے ہورہی ہے۔

ان دونوں وجوہات یعنی لڑکیوں سے کم بے رغبتی اور شرح اموات کی کمی کے سبب مسلم بچوں کا صنفی تناسب (Child sex ratio) بھی ہندوؤں سے بہتر ہے اور پچھلے کچھ سالوں میں بڑھا بھی ہے۔بچوں کے صنفی تناسب سے مراد ہے کسی ایک عمر کے ہر 1000 بچوں پر اسی عمر کی بچیوں کی تعداد۔

حالاں کہ مسلمانوں کی بڑھی ہوئی شرح پیدائش سیاسی اور علمی حلقوں میں کافی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے لیکن اس کے برعکس ان کی گھٹتی ہوئی شرح اموات پر زیادہ غور نہیں کیا گیا جو مسلمانوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے کافی تعجب خیز امر ہے۔

مندرجہ ذیل اسباب کی بناپر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ مسلم بچوں کی شرح اموات دوسروں کے مقابلہ میں اور زیادہ ہوگی۔

1) ان کی سماجی اور معاشی حیثیت دوسری قوموں سے کم ہے۔

2) مسلمانوں میں غربت دوسری قوموں سے زیادہ اور تعلیم ان سے کم ہے۔

3) ان کے رہائشی علاقوں میں اکثر عوامی سہولیات کا فقدان ہے۔

4) بچے جننے اور علاج کی دوسری سہولیات تک ان کی رسائی کم ہے۔

5) مسلمانوں کی شرح پیدائش بڑھی ہوئی ہے۔

6) بچوں میں وقفہ کم ہوتا ہے۔

7) مسلم بچوں کے لئے غذائیت سے محروم ہونے کا خطرہ زیادہ ہے۔

تحقیق کے ذریعہ مسلم بچوں کی بہتر شرح اموات کی یہ امکانی وجوہات نکالی گئی ہیں۔

1۔ مسلم مائیں اکثر لمبی ہوتی ہیں جو کہ بہتر صحت کی نشانی مانی جاتی ہے۔

2۔ اس بات کا امکان کم ہوتا ہے کہ بچوں کی پیدائش کے وقت انہیں ضرورت سے کم غذا ملتی ہو۔

3۔ ان کی غذا میں گوشت شامل ہوتا ہے۔

4۔ ان کے نوکری کرنے کے امکان کم ہوتے ہیں۔

5۔ مسلمان شہری علاقوں اور بڑے گاؤں میں زیادہ آباد ہیں جہاں بہتر طبی سہولیات ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

6۔ مسلم مائیں اسہال (diarrhea) کا علاج زیادہ کراتی ہیں جو بچوں کی موت کی بڑی وجہ ہے۔

7۔ ہندوؤں میں لڑکوں کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے جس کی وجہ سے دونوں گروہوں کی لڑکیوں کی شرح اموات میں زیادہ فرق ہے۔

8۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ غالباً مسلمانوں کے حفظان صحت کے طریقوں کا بھی دخل ہوسکتا ہے۔

9۔ غالباً مسلم گھرانوں میں صنفی تعصب کم ہونے کی وجہ سے عورتوں اور بچیوں کی غذا اور صحت بہتر رہتی ہے۔

مسلمانوں میں متوقع عمر (life expectancy) اوسط سے تقریباً ایک سال زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں ماؤں کی شرح اموات بھی اوسط سے کم ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی گھٹتی شرح اموات کا ایک سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عام آبادی کے مقابلہ میں وہ شہروں میں زیادہ رہتے ہیں اور شہری آبادی کی شرح اموات دیہی کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے۔

24.4.8 صنف کا تناسب

1961-2001 کے درمیان ہندوستان کا صنفی تناسب 930 کے آس پاس رہا ہے یعنی 1000 مردوں پر اتنی عورتیں۔ مسلم آبادی اس سے الگ نہیں ہے۔ لیکن حال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ چھوٹی عمر میں صنفی تناسب کم ہوتا جارہا ہے۔ اس کی اہم وجہ نسوانی جنین کشی بتائی جاتی ہے۔ 2001 میں 0-6 عمر کے بچوں کا صنفی تناسب 927 تھا جو بہت کم ہے البتہ مسلم آبادی میں یہ 950 تھا جس میں کوئی عدم توازن نہیں ہے یعنی یہ زیادہ تر آبادیوں کے برابر ہے۔ بہرحال کچھ ایسے صوبے بھی ہیں جہاں چھوٹی عمر میں مسلمانوں کا صنفی تناسب بھی کم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً کچھ صوبوں میں مسلم معاشرہ میں بھی کسی حد تک نسوانی جنین کشی پائی جاتی ہے لیکن یہ عام آبادی کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

24.4.9 عمر کا تناسب

عمر کے لحاظ سے مسلم آبادی کی تقسیم ہندوستان کی عام آبادی سے کافی مختلف ہے۔مسلمانوں میں نوجوانوں کی تعداد عام آبادی سے کافی زیادہ ہے۔خاص طور پر 15 سال سے کم عمر کی جماعت میں کم عمروں کی تعداد کا زیادہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ مسلم آبادی میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔لیکن کسی آبادی میں کم عمروں کی تعداد کے زیادہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کام کرنے کے لائق لوگوں کی تعداد کم ہے جس سے گھروں،سماج اور معیشت پر زیادہ بوجھ پڑتا ہے۔لہٰذا بڑی تعداد میں کم عمروں کی کفالت کا مسئلہ مسلم سماج کے لئے نقصاندہ ہے۔

حال میں کچھ ریاستوں میں شرح پیدائش کے کم ہونے سے نوعمروں کا تناسب کم ہوا ہے۔جیسے تمل ناڈو،کیرل،آندھرا پردیش،گجرات اور چھتیس گڑھ۔ان صوبوں میں کام کرنے والوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔

24.4.10 ازدواجی حیثیت

مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اوسطاً شادی کے وقت مسلم لڑکیوں کی عمر بقیہ اقوام کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہوتی ہے یا ان کی شادیاں تھوڑی بڑی عمر پر ہوتی ہیں۔جموں وکشمیر،اڑیسہ،چھتیس گڑھ،دہلی،اتراکھنڈ اور گجرات میں 19-15 عمر کی 15 فیصد سے کم لڑکیاں شادی شدہ ہیں۔ہریانہ،آسام،مغربی بنگال اور جھارکھنڈ میں یہ تناسب 30 فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔

اکثر یہ مانا جاتا ہے کہ بیواؤں کی شادی ہندو سماج میں نایاب ہے لیکن مسلمانوں میں یہ عام ہے اور مسلمانوں کی اوسط سے زیادہ شرح پیدائش کی ایک وجہ یہ بھی سمجھی جاتی ہے۔لیکن مردم شماری کے اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ مسلم آبادی میں بیواؤں کا تناسب اتنا ہی ہے جتنا کہ عام آبادی میں ہے۔اکثر یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں طلاق زیادہ عام ہے لیکن عملی طور پر اس کا کوئی ثبوت نہیں پایا جاتا ہے۔

معلومات کی جانچ

1۔ موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کس طرح کے مسائل درپیش ہیں؟

2۔ ایسی کون سی ریاستیں ہیں جن میں مسلمانوں کی آبادی پانچ سے دس ملین کے درمیان ہے اور کون سی ریاستیں ہیں جن میں مسلم آبادی پانچ ملین سے کم ہے؟

3۔ کن اسباب کی بنا پر یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ مسلم بچوں کی شرح اموات دوسروں کے مقابلہ میں اور زیادہ ہوگی؟

4۔ مسلم بچوں کی بہتر شرح اموات کی کیا امکانی وجوہات نکالی گئی ہیں؟

24.5 تعلیمی صورت حال

24.5.1 تعارف

مسلم گروہ کے سامنے بہت بڑا مسئلہ تعلیمی پچھڑے پن کا ہے۔کئی جائزوں بالخصوص سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمان تعلیم کے میدان میں دیگر سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں کافی پسماندہ ہیں۔

تعلیم کے میدان میں مسلمان دوسرے گروہوں سے لگاتار پچھڑتے جارہے ہیں اور دونوں کے درمیان کا تعلیمی فرق بڑھتا جارہا ہے۔مزید یہ کہ تعلیم کے معاملے میں SRCs میں جو فرق ہے وہ لڑکیوں کے معاملے میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ملک کی تعلیمی حالت سدھرنے کے باوجود مسلمانوں کی تعلیمی محرومی لگاتار باقی ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ جب کہ دلتوں اور آدیواسیوں اور قبائلی جن جاتیوں کی تعلیمی محرومی کو دور کرنے کی باقاعدہ کوششیں کی گئیں مسلمانوں کی تعلیمی محرومی میں کمی لانے کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔

یہ تاثر غلط ہے کہ مسلمانوں میں پائی جانے والی مذہبی قدامت پسندی ان کے تعلیم حاصل نہ کرنے کا بڑا سبب ہے۔مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میں اپنے تعلیمی پسماندگی کا شدید احساس پایا جاتا ہے اور وہ اس صورت حال کو جلد از جلد درست کرنا چاہتے ہیں۔

24.5.2 مسائل

اسکولوں تک محدود رسائی

مسلم تعلیمی بدحالی کی ایک وجہ یہ ہے کہ اچھے اور معیاری اسکولوں تک قوم کے بچوں کی رسائی محدود ہے اور اس سے طالبات زیادہ متاثر ہوئی ہیں۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے اور مسلمانوں کی طرف سے بھی یہ شکایت ملتی ہے کہ ان کی آبادی والے علاقوں میں یا ان کے آس پاس اسکولوں کی خاص طور پر سرکاری اسکولوں کی خاصی کمی رہتی ہے۔یہ بھی مسلم تعلیمی محرومی کی ایک بڑی وجہ ہوسکتی ہے۔سچر کمیٹی نے یہ بھی پایا کہ عام طور پر گھنی مسلم آبادی والے چھوٹے گاؤں میں اسکول کم پائے جاتے ہیں۔

تعلیم نسواں

بچیوں کے اسکولوں کی تعداد بھی کم ہے اور اکثر یہ مسلم بستیوں سے خاصے فاصلے پر ہوتے ہیں۔اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ تناؤ کے زمانہ میں والدین اپنی بچیوں کے تحفظ کے اندیشے سے انہیں اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔خاص طور پر جب وہ پرائمری اور مڈل اسکول میں ہوتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس عمر کی مسلم لڑکیوں میں تعلیم چھوڑنے کی شرح زیادہ پائی جاتی ہے۔اکثر گھر کے آس پاس اسکول نہ ہونے کے سبب والدین کو اپنے بچوں کو نجی اسکولوں یا مدرسوں میں بھیجنا پڑتا ہے۔

تمام سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) میں سماجی سطح پر منفی صنفی امتیازات کا عمومی ماحول پایا جاتا ہے۔اس کے پیش نظر مسلم لڑکیوں کی تعلیم حد درجہ متاثر ہوئی ہے۔کیوں کہ غریب مسلم والدین اکثر و بیشتر صرف بیٹوں کو ہی نجی اسکولوں میں بھیجتے ہیں۔لہٰذا یہ تاثر بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی قدامت پسندی لڑکیوں کی تعلیم کے بیچ حائل ہے۔

حالیہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ دراصل غریبی اور مالی دشواریاں مسلم لڑکیوں کو جدید یا سیکولر تعلیم سے محروم رکھنے کا سب سے بڑا سبب ہے۔کیوں کہ لڑکیوں یا خواتین کو روایت کا امین سمجھا جاتا ہے نا کہ روزی کمانے والیاں یا ملازمت کی خواہشمند۔اس لئے بعض لوگ اردو کی تعلیم کو لڑکیوں کے لئے زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔چوں کہ اردو اب بیشتر سرکاری اسکولوں میں نہیں پڑھائی جاتی ہے اس لئے بعض والدین اپنی لڑکیوں

کومدارس میں بھیجنے کوترجیح دیتے ہیں۔ہاسٹلوں کی کمی بھی ایک بڑی رکاوٹ ہےخصوصاًلڑکیوں کےسلسلہ میں۔

لیکن سچرکمیٹی کواس تاریک منظر نامہ میں بھی امید کی کرن نظر آئی۔کمیٹی کا کہنا ہے کہ گوتعلیمی نظام مسلم لڑکیوں سے دستبردار ہوگیا ہومگر خودلڑکیوں نےتعلیم کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔مختلف ریاستوں میں ملاقاتوں اور بات چیت کے دوران کمیٹی نے محسوس کیا کہ ہرطبقہ کی مسلم خواتین اورلڑکیوں میں تعلیم کے لئےزبردست جوش اور خواہش پائی جاتی ہے۔

درسی کتابوں اور اسکول کے ماحول میں اکثرفرقہ واریت کے پائے جانے کی وجہ سےبھی بہت سے والدین بچوں کواسکول بھیجنا پسند نہیں کرتے۔

نجی ادارے

تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ غالباًاپنی پسند کےسرکاری اداروں کی غیر موجودگی یا ان تک رسائی نہ ہونے کے سبب دوسری سماجی ومذہبی قوموں (SRCs) کےمقابلہ میں مسلمان نجی شعبہ کےتعلیمی اداروں کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں۔دوران تحقیق والدین سے ہوئی بات چیت سے اخذ ہوتا ہے کہ تعلیم کےسرکاری نظام سےان کی بیزاری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں دن بدن ہندی وسنسکرت زبان اور ہندوتہذیب ومذہب کا رنگ غالب ہوتا جارہا ہے جب کہ دوسری طرف اردو زبان اور ملی جلی تہذیب کوکھلم کھلا درکنار کیا جاتا ہے۔اس لحاظ سے مذہبی،تہذیبی اورسیاسی شناخت کاتعلیم سےگہرا تعلق ہے۔

اردو

اکثراردو بولنے والے علاقوں کےمسلمان اسی زبان میں بچوں کوبنیادی تعلیم دلانا پسند کرتے ہیں۔لہٰذاایسےعلاقوں میں ان اسکولوں کی بڑی اہمیت ہے۔لیکن ان کی تعداد ضرورت سے بہت کم ہے۔ابتداءًاردوصرف مسلمانوں کی زبان نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ اسے اس قوم سے جوڑدیا گیا۔ہندی اوراردو کےمسئلہ نے جوفرقہ وارانہ رنگ اختیار کرلیا اس سےبھی اس زبان کا اوراس سے جڑے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا ہے۔بالخصوص آزادہندوستان میں۔

آئین کی دفعہ 351 نے مسئلہ کوشدید تر کردیا جب یہ کہا گیا کہ ہندی کوزیادہ سے زیادہ سنسکرت سے الفاظ لینے چاہئیں۔کئی ہندی بولنے والی ریاستوں میں ہندی کی سنسکرت کاری اورسہ لسانی فارمولے کے مسخ کئے جانے سے(صرف ہندی،سنسکرت اورانگریزی کی تعلیم کی فراہمی)بیشترسرکاری اسکولوں میں اردوکی تعلیم کا سلسلہ عموماًبالکل ختم ہوگیا جس سے مسلمانوں کی تعلیم متاثر ہوئی۔

اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کواعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے کیوں کہ اردو کے ذریعہ ثانوی اوراعلیٰ تعلیم دینے والے اسکول زیادہ نہیں ہیں۔سہ لسانی فارمولے پر مناسب عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے طلبہ ہائرسکینڈری اسکول کا امتحان اردو میں نہیں دے پاتے کیوں کہ اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔لہٰذا انہیں ہندی میں امتحان دینا پڑتا ہے۔نیز اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کےبعدروزگار کافراہم نہ ہوپانا بھی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔

غربت

1993/4 میں کئے گئے سروے کے مطابق 26 فیصد مسلم کنبوں میں بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہ دینے کی بڑی وجہ شدید غریبی ہے۔ دوسرے بہت سے ہندوستانیوں کی طرح مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا خاص سبب بھی یہی ہے۔اس کے سبب بچے ابتدائی چند درجات کے بعد تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔یہ بات مسلم بچوں کے معاملہ میں زیادہ نمایاں ہے۔چھوٹے چھوٹے بچوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ کارخانوں یا گھروں وغیرہ میں کام کر کے گھر کی آمدنی میں ہاتھ بٹائیں یا ان کی مائیں کام کرنے گئی ہوں تو گھر میں بھائی بہنوں کی دیکھ بھال کریں۔مزدوری کرنے والے بچوں کا تناسب بھی ملکی اوسط (2.4%) کے مقابلہ میں مسلمانوں میں زیادہ ہے یعنی (3%)۔

غریب اور ناخواندہ والدین اپنے بچوں کے لیے ٹیوشن کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا پاتے، نہ وہ گھر پر ان کی تعلیم میں وہ مدد دے سکتے ہیں جو آج کے تعلیمی نظام کا لازمی جزبن گئی ہے۔

1993/4 میں کئے گئے سروے میں 10-9 فیصد مسلم والدین نے کہا کہ وہ روایت کے دباؤ یا بچوں کی شادی کرانے کی وجہ سے انہیں نہیں پڑھا پاتے۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم اور انسانی ترقی کے دوسرے پیانوں پر علاقے کے ساتھ ساتھ مذہب کا بھی بہت اثر پڑتا ہے۔کئی پیانوں پر SC/ST گروہوں کے مقابلہ میں مثبت خصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود مسلمانوں کے تعلیمی پچھڑے پن کا مطلب یہ ہے کہ یا تو تعلیم کے متعلق مسلمانوں کا رویہ مثبت نہیں ہے یا اسکول جانے کے لئے ان کے پاس مواقع کم ہیں۔

اس کے بھی کئی اسباب ہوسکتے ہیں:۔

1۔ مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک جس کی ان کی طرف سے اکثر شکایت ملتی ہے۔

2۔ مسلمانوں کی اپنی پسند اور معیار کے مطابق مناسب اسکولوں تک عدم رسائی۔

3۔ تعلیم کے نتیجہ میں پہنچنے والے فوائد کا انہیں احساس نہیں ہے۔

جائزوں میں 18-17 فیصد مسلمانوں کا کہنا ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم اہم نہیں تھی۔

تعلیمی فوائد کا ناکافی احساس

تعلیم سے جڑے ہوئے فائدے اس کے نتیجہ میں ملنے والی ملازمت کے امکانات سے جڑے ہوئے ہیں۔اس لئے یہ مانا جاتا ہے کہ لوگوں کو ملازمت ملنے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا اتنا ہی وہ تعلیم کی طرف راغب ہوں گے۔چوں کہ بنیادی دھارے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کے لئے روزگار ملنا عموماً نہایت مشکل ہوتا ہے اس لئے اسے غیر سودمند سرمایہ کاری سمجھا جاتا ہے۔

کیوں کہ اکثر روزگار اور نوکریوں کی فراہمی میں مسلمانوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں اپنی اہلیت کے مطابق نوکریاں نہیں ملتیں،اس وجہ سے بھی مسلم قوم تعلیم سے حاصل ہونے والے فوائد کے احساس سے محروم رہ جاتی ہے۔

سرکاری ونجی زمرہ کے روزگار میں مسلمانوں کی کم نمائندگی اور باتنخواہ ملازمتیں حاصل کرنے میں امتیازات برتے جانے کے خیال کے تحت مسلمان سیکولر تعلیم کو دیگر سماجی ومذہبی قوموں کے مقابلہ میں کم اہمیت دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی مسلم قوم خاص طور سے تعلیم یافتہ متوسط طبقہ انتظام وانصرام، پالیسی سازی اور سیاسی اداروں میں اپنی عدم موجودگی اور کم مواقع دیکھ کر بھی مایوسی کا شکار ہورہا ہے اور خود کو الگ تھلگ محسوس کررہا ہے۔

24.5.3 مدارس

مدارس درہائشی مذہبی تعلیم گاہیں ہیں جن کا انتظام مسلم قوم خود اپنے طور پر کرتی ہے۔مدارس کا مسلم معاشرہ میں بہت اہم کردار ہے۔ اول تو یہ کہ ان کے ذریعہ مذہبی تعلیم کی روایت زندہ ہے۔دوسرے ان کے ذریعہ ایسے افراد تیار ہوتے ہیں جو معاشرہ کے اندر مذہبی فرائض ادا کرنے اور مسلمانوں کے مذہبی وملی تشخص کو برقرار رکھنے کا کام کرتے ہیں۔تیسرے یہ مدارس غریب ونادار بچوں کی کفالت کا بھی ایک بڑا ذریعہ ہے۔کبھی کبھی مسلمانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسہ بھیجیں البتہ عموماً مسلمان مدرسہ کی روایتی تعلیم کے مقابلہ میں رائج الوقت سیکولر تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں کیوں اس میں ملازمت کے بہتر مواقع ہیں۔

مدارس مسلم قوم کی جانب سے ایک اہم کوشش ہے لیکن ان کی رسائی نہایت محدود ہے۔7-16 سال (اسکول جانے کی عمر) کے صرف 4فیصد مسلم بچے ہی مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنیادی دھارے کے اسکول ہی اکثر مسلمانوں کی پہلی ترجیح ہیں۔

24.5.4 مسائل کے حل

مدارس کی تجدید

مدارس کی تجدید ہونی چاہئے لیکن اس سے مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوگا کیوں کہ ان کا دائرہ بہت محدود ہے۔ہاں اگر مدارس اسلامیہ میں مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم کا بھی معقول انتظام ہوجائے اور ایسے ہی پیشہ وارانہ تعلیم پر بھی محنت کرائی جائے تو ان کا دائرہ وسیع ہوسکتا ہے۔حالاں کہ کچھ مدارس نے اس طرح کی کوششیں کی ہیں لیکن وہ سطحی اور ناکافی ہیں۔

حکومت کی طرف سے بھی مدارس کی جدید کاری کی منصوبہ بندی ہوتی رہتی ہے لیکن وہ مسلم قوم کا اعتماد حاصل نہیں کرپارہی ہے۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ حکومت کے یہ منصوبہ صرف کاغذی زینت ہوتے ہیں اور عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا۔مسلم آبادی کا ایک بڑا حصہ حکومت کی تجدیدی کوششوں کا اس لئے بھی مخالف ہے کہ انہیں خوف ہے کہ حکومتی مداخلت بڑھتی رہے گی اور اس سے مدارس کی آزادی اور افادیت جاتی رہے گی۔

مدارس کے اساتذہ کی جدید طرز کی تربیت بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ایسے قدم اٹھائے جانے چاہئے جن سے مدارس کے فارغین بنیادی دھارے (mainstream) میں داخل ہوسکیں۔جہاں تک ممکن ہو انہیں جدید تعلیم کے اداروں میں داخلہ کا اہل مانا جائے۔کچھ یونیورسٹیز نے ان مدارس کی اسناد کو اپنے یہاں تعلیم کے الگ الگ سطحوں کے مساوی مانا ہے۔ایسے ہی علی گڑھ یونیورسٹی نے برج کورس بھی شروع کیا ہے جس کو پاس کرنے کے بعد یہ فارغین یونیورسٹیوں کے کورسز میں داخلہ لینے کے اہل ہوں گے۔اس عمل کا دائرہ وسیع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ مدارس کے فارغین کو بنیادی دھارے کے اداروں میں داخلہ لینے میں کسی امتیاز کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

24.5.5 تعلیم یابی کے اشاریے

شرح خواندگی

مسلم شرح خواندگی SC/ST کو چھوڑ کر بقیہ تمام مذہبی وسماجی گروہوں سے کم ہے۔ اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال میں مسلم خواندگی کی صورت حال سب سے بدتر ہے۔ مسلم شرح خواندگی میں اضافہ ست روی کا شکار ہے جس کے سبب وہ ملک کے دوسرے گروہوں کی شرح خواندگی کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔

دراصل پچھلے کچھ سالوں میں مسلمانوں کے مقابلے SC/ST کی خواندگی میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ ایسے مسلم بچوں کی فی صد شرح بہت زیادہ ہے جو کبھی اسکول ہی نہیں گئے اور یہ SC/ST بچوں سے صرف تھوڑی ہی کم ہے۔

ترک تعلیم

مسلمانوں میں ترک تعلیم کی شرح سب سے زیادہ ہے اور مڈل اسکول کے بعد اس میں نمایاں اضافہ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ مسئلہ پریشان کن ہے۔

شرح داخلہ

مسلمانوں میں داخلوں کا تناسب بھی بہت کم ہے البتہ پچھلے کچھ سالوں میں اس میں کچھ اضافہ ہوا ہے اور یہ اس بات کا غماز ہے کہ مسلمان اب اپنی سماجی ومعاشی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے تعلیم کی اہمیت کو جاننے لگے ہیں۔

شرح داخلہ میں مختلف سماجی فرقوں کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے وہ لڑکیوں کے معاملہ میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مختلف سماجی ومذہبی گروہوں کے درمیان شرح داخلہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ تاریخی محرومی یا پھر مساوی مواقع فراہم نہ ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ لیکن کسی ایک گروہ کے اندر جو صنفی فرق نظر آتا ہے وہ لڑکے اور لڑکیوں کے متعلق والدین کے مختلف رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔

سطح تعلیم یابی

ابتدائی اور ہائر سکینڈری تعلیم یابی کی سطح بھی مسلمانوں میں بہت کم ہے۔ مسلمانوں کی تعلیمی محرومی کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ بچے اسکولوں میں ٹکتے نہیں ہیں۔ ترک تعلیم کی وجہ سے اسکولی تعلیم کے ایک مرحلہ سے دوسرے تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ 2012 کے حکومت ہند کے اعداد وشمار کے مطابق ملکی سطح پر پہلی جماعت میں داخل بچوں میں مسلمانوں کا تناسب 16.6 فیصد تھا لیکن آٹھویں تک پہنچتے پہنچتے یہ گھٹ کر 8.4 فیصد رہ گیا تھا۔ اسکولی داخلہ اور پھر اسکولی تعلیم مکمل کرنے کی شرح میں اب جو بہتری آرہی ہے وہ بہت معمولی ہے۔

بیسویں صدی کے شروع میں دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں SC/ST طبقوں کے مرد اسکولی تعلیم میں بہت پیچھے تھے لیکن پچھلی صدی کے دوران انہوں نے اس میں بہت ترقی کرلی۔ اس کے برعکس مسلم مردوں نے دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں کے مقابلہ میں اسکول کی تعلیم یابی میں زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ یعنی SC/ST مردوں نے مسلمانوں سے زیادہ تیزی سے اپنی تعلیم

یابی میں اضافہ کیا ہے ۔البتہ مسلم خواتین وقت کے ساتھ اپنی سکول کی تعلیم میں اضافہ کرنے میں SC/ST خواتین سے پیچھے نہیں رہی ہیں ۔لیکن یہ دونوں ابھی تک اس میدان میں اونچی ذات کی ہندو خواتین کا مقابلہ نہیں کر پائی ہیں۔

سبھی سماجی و مذہبی گروہوں میں اسکول کی تعلیم میں صنفی فرق وقت کے ساتھ کافی کم ہوا ہے اور مسلمانوں میں یہ فرق اور بھی تیزی سے کم ہوا ہے۔

پچھلی صدی کی پہلی تین دہائیوں میں پیدا ہوئی مسلم خواتین کی اسکولی تعلیم مردوں کے مقابلہ میں 14 فیصد تھی لیکن 1970 کی دہائی میں یہ بڑھ کر 63 فیصد ہوگئی۔

خلاصہ یہ ہے کہ پچھلی صدی میں مسلم مردوں و عورتوں کی اسکولی تعلیم کے حصول میں کافی ترقی دیکھنے کو ملتی ہے لیکن اونچی ذات کے ہندوؤں کے مقابلہ میں یہ ابھی بھی بہت کم ہے ۔کو مسلم مرد بمشکل اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی اسکولی تعلیم کی بڑھتی ہوئی رفتار کا مقابلہ کر پائے ہیں لیکن مسلم عورتوں نے اس معاملے میں ہندو اعلیٰ ذات کی خواتین اور اپنے درمیان پائے جانے والے فرق کو بہت حد تک کم کرلیا ہے لیکن اس کے باوجود بھی مسلمان ابھی ان سے کافی پیچھے ہیں۔مسلم بچوں کی داخلہ کی شرح میں اگرچہ اضافہ ہوا ہے لیکن ترک تعلیم کی شرح میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آرہا ہے۔

اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کی سطح تک SRCs کے درمیان فرق بہت بڑھ جاتا ہے جس سے اعلیٰ تعلیم میں گراوٹ نظر آتی ہے۔اسی وجہ سے مسلمانوں میں گریجویٹ تعلیم یابی یا گریجویٹوں کی تعداد کا تناسب (GAR) بھی دوسری قوموں اور اوسط کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔

اسکول اور کالج کی تعلیم یابی (GAR) میں دیہی و شہری مسلم الگ نظر آتے ہیں۔دیہات میں مسلمان SC/ST کے برابر کھڑے ہیں جب کہ شہروں میں ان کی حالت بہت خراب ہے اور ان دونوں پیمانوں میں وہ سب سے نچلی سطح پر نظر آتے ہیں۔

والدین اگر تعلیم یافتہ ہوں تو ان کی اولاد کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے امکانات زیادہ رہتے ہیں اور اگر والدین گریجویٹ ہوں تو ان کے بچوں کے لئے اس کا امکان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔اس امکان پر آمدنی اور معاشی حیثیت کا کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔والدین کی تعلیم کا اثر سماجی و مذہبی حیثیت سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

یہ امر نہایت تشویشناک ہے کہ 2004 اور 2010 کے درمیان دوسرے تمام سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلہ میں میٹرک (دسویں جماعت) اور اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی شمولیت میں سب سے کم اضافہ ہوا ہے۔شہری علاقوں میں جہاں مسلمان زیادہ آباد ہیں، اعلیٰ تعلیم میں ان کی شرکت پہلے کے مقابلہ میں کم ہوئی ہے۔

سچر کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ بنیادی مسئلہ اسکول کی سطح پر ہے۔محروم گروہوں کے افراد جب اس مرحلہ کو پار کر لیتے ہیں یعنی اسکول کی تعلیم مکمل کر لیتے ہیں تو کالج جانے کے ان کے امکان بہت بڑھ جاتے ہیں اور مختلف سماجی و مذہبی گروہوں کے GARs میں زیادہ فرق باقی نہیں رہ جاتا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر محروم گروہوں کی اعلیٰ تعلیم میں شرکت بڑھانی ہے تو یہ سمجھنا ہوگا کہ اسکولی تعلیم کی راہ میں ان کے سامنے کیا رکاوٹیں ہیں اور انہیں کیسے دور کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے شعبوں کی طرح تکنیکی اور انجینئر نگ کی تعلیم بھی مسلمانوں کی شمولیت ناکافی ہے۔

24.5.6 مسائل کا حل

تعلیمی اداروں تک رسائی

یہ مانا جاتا ہے کہ تعلیمی اداروں کا مہیا ہونا اور ان تک رسائی اگر مسلمانوں کو حاصل ہو تو ان کی تعلیمی صورت حال میں نمایاں بہتری لائی جاسکتی ہے۔ لڑکیوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ حکومت اور خود مسلم قوم کو ان کے لئے علیحدہ اسکول اور کالج قائم کرنے چاہئیں۔

شہروں اور قصبوں میں خاص طور سے لڑکیوں کے لئے ہاسٹل ہونے چاہئے۔

اسکولوں تک رسائی

سچر کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام سماجی و مذہبی گروہوں کے بچوں کی اچھے باضابطہ اسکولوں تک رسائی ہونی چاہئے۔ حکومت کو چاہئے کہ وہ بالخصوص محروم سماجی و مذہبی گروہوں کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرکے ان کے بچوں کی اسکول تک رسائی کو ممکن بنائے۔

درسی کتابیں

اسکول کی درسی کتابوں میں تکثیریت (diversity) کا احترام کرتے ہوئے ایسے مواد کو ترجیحی طور پر شامل کیا جانا چاہئے جو تکثیریت کو بڑھاوا دینے والا ہو۔

جو بچے مڈل اسکول (آٹھویں جماعت) کے بعد تعلیم ترک کردیتے ہیں ان کے لئے تکنیکی تعلیم کے مواقع فراہم ہوں۔

داخلہ کے معیار میں صرف قابلیت ہی نہیں بلکہ پسماندگی کو بھی بنیاد حاصل ہونی چاہئے اور یہ پسماندگی آمدنی، علاقہ، سماجی حیثیت (پیشہ اور ذات) پر مبنی ہونی چاہئے۔ اس سے تمام محروم طبقوں کی اعلیٰ تعلیم تک رسائی میں اضافہ ہوگا۔

اردو

ایسے حکومتی اقدامات کی ضرورت ہے جن سے اردو کو اس کا درجہ مل سکے اور بالخصوص مسلم علاقوں میں موجود سرکاری اسکولوں کے اندر ابتدائی تعلیم اردو میں ہونی چاہئے۔

ملازمتوں میں ریزرویشن

بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لئے بھی ملازمتوں میں ریزرویشن ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے تعلیمی پچھڑے پن کی ایک بڑی وجہ ریزرویشن کا نہ ہونا ہے۔ محروم طبقوں کے تعلیم میں مسلمانوں سے آگے نکلنے کی ایک بڑی وجہ یہی ریزرویشن ہے۔ اس کی وجہ سے تعلیم سے فائدہ حاصل ہوتا ہے جس سے اس کی طرف ان طبقوں کی رغبت بڑھتی ہے۔

معلومات کی جانچ

1) مسلمانوں کے چند تعلیمی مسائل بیان کیجئے۔

2) مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کو بہتر بنانے کی کچھ تدابیر بیان کیجئے۔

3) مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق کچھ غلط فہمیاں بیان کیجئے۔

4) لڑکیوں کی تعلیم کے کچھ مسائل اوران کے حل بیان کیجئے۔

24.6 معاشی صورت حال

24.6.1 چند اقتصادی اشاریے

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے انسانی ترقی اور گزر بسر کے حالات کے لحاظ سے دوسری قوموں کے مقابلہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی محرومی کو اجاگر کیا ہے۔

غریبی

خوشحالی کے تعین کا ایک اشاریہ گھروں میں چیزوں کے استعمال پر ہونے والے اخراجات ہیں۔محروم طبقے اقتصادی لحاظ سے گزر بسر کے بدتر حالات سے دوچار رہتے ہیں۔اوسط فی کس اخراجات (MPCE) SC/ST کو چھوڑکر بقیہ تمام سماجی و مذہبی گروہ(SRCs) میں مسلمانوں کے لئے سب سے کم ہے۔خط افلاس سے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد(HCR) بھی SC/ST کو چھوڑکر بقیہ تمام گروہوں سے مسلمانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

شہری علاقوں میں مسلمان ہی غربت کا زیادہ شکار ہیں خاص طور سے چھوٹے قصبوں میں وہ سب سے زیادہ غریبی کی مار جھیل رہے ہیں۔البتہ دیہی علاقوں میں مسلمان SC/ST اور OBC کے مقابلہ میں غربت کے کم ستائے نظر آتے ہیں۔

دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں کی طرح مسلمانوں کی غربت کی شرح میں بھی سدھار آیا ہے لیکن اس کی رفتار دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں سست ہے،خاص طور سے شہری علاقوں میں اس سدھار کی رفتار بہت دھیمی ہے۔

آمدنی

1987 اور 1999 کے درمیان اونچی ذات کے ہندوؤں اور SC/ST کی آمدنی میں فرق گھٹا ہے لیکن مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان آمدنی کا یہ فرق اور بڑھ گیا ہے جو کہ مسلمانوں کے لئے نقصاندہ ہے۔

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی اوسط آمدنی ہندوؤں سے کم ہوتی ہے اور مختلف مذہبی فرقوں کے اعداد وشمار سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

مختلف ذاتی اور مذہبی فرقوں کی آمدنی کے درمیان فرق کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آمدنی کے معاملہ میں اوسطاً ہندوؤں کی اونچی ذاتیں SC/ST اور OBC سے بہتر ہیں اور ہندو مسلمانوں سے۔

1987 اور 1999 کے درمیان تمام ذاتوں اور مذہبی گروہوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے لیکن مختلف گروہوں کی آمدنی میں ہوئے اضافہ میں واضح فرق بھی تھا جس کو ذیل میں دیکھا جاسکتا ہے۔

SC/ST کے لئے:	73فیصد
غیر SC/ST ذاتوں کے لئے:	52فیصد
ہندوؤں کے لئے:	54فیصد
مسلمانوں کے لئے:	49فیصد

24.6.2 معاشی بدحالی کے اسباب

عدم تحفظ

عدم تحفظ کا احساس خاص کر خواتین کی نقل وحرکت کو منفی طور پر متاثر کرتا ہے۔اس سے ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن کی وجہ سے مسلمان اقتصادی مواقع سے پوری طرح سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔

عالم گیریت اور آزاد تجارت

مسلمانوں کے روزگار کی صورت حال کے اور بدتر ہونے کا ایک سبب اقتصادی عالمگیریت (Globalisation) اور نرم روی (Liberalisation) کی حکومت کی پالیسیاں اور ان سے جڑی سرگرمیاں ہیں جنھوں نے محروم وپسماندہ (marginalised) طبقوں کی اقتصادی حالت پر زیادہ منفی اثر ڈالا ہے جیسے چھوٹے وغریب کسان، مزدور، دستکار اور ذاتی وگھریلو چھوٹی صنعتوں سے جڑے لوگ (Self-employed) اور ان لوگوں میں مسلمانوں کا تناسب بہت زیادہ ہے۔اس لئے دوسروں کے مقابلہ میں مسلم پیشوں اور بالخصوص خواتین پر اس کا زیادہ منفی اثر پڑا ہے۔

اس کے علاوہ چوں کہ مسلم کام کرنے والے اور خاص کر گھروں میں مرکوز (home based) کارکنوں کو کام کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کے مواقع مہیا نہیں ہیں اس وجہ سے بھی ان کی آمدنی کم ہوئی ہے۔

سرکاری پروگراموں تک کم رسائی

سرکاری پروگراموں کو بروئے کار لانے اور بنیادی ڈھانچے (infrastructure) کی فراہمی میں مسلمانوں کے ساتھ جو امتیاز برتا جاتا ہے اس سے ان کے اقتصادی مسائل میں اضافہ ہوتا ہے۔حکومت کے پروگراموں میں مسلمانوں کے استفادہ کی صورتحال عام طور پر محدود ہے۔لیکن اکثر الگ الگ پروگراموں میں ان کی شراکت مختلف رہتی ہے۔کچھ اقلیتی پروگراموں میں مسلمانوں کی شرکت اچھی ہے لیکن ان

پروگراموں کے لئے مختص رقم اتنی کم ہوتی ہے کہ اس کا کوئی قابل لحاظ اثر مرتب نہیں ہوتا۔ کچھ دیگر پروگراموں سے مسلمانوں سے زیادہ فائدہ دوسری اقلیتوں کو ہوتا ہے۔

قرضوں کا ناقص نظام

خودروزگاروں کی آمدنی میں اضافہ کے لئے سرمایہ تک رسائی نہایت ضروری اور اہم ہے۔ خودروزگاری کی سرگرمیوں میں زیادہ شرکت کے پیش نظر قرضوں کی دستیابی مسلمانوں کے لیے دیگر سماجی ومذہبی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے قرضوں کی فراہمی کافی محدود ہے۔ بہت سے بینکوں نے مسلم اکثریتی علاقوں کو 'منفی' یا 'سرخ' علاقہ قرار دے رکھا ہے جہاں وہ قرضے نہیں دیتے۔ قرضوں کی عدم موجودگی مسلم قوم کے لیے ان کی اقتصادی حالت سدھارنے میں رکاوٹ بنتی ہے۔

بینکوں کے قرضوں میں مسلمانوں کی حصہ داری دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں کے مقابلے اور آبادی میں ان کے تناسب کے لحاظ سے بھی بہت کم ہے۔ لیکن جمع رقوم (deposits) میں کافی زیادہ ہے اور اکثر آبادی میں ان کے تناسب کے قریب تر۔ لہٰذا یہ عام تصور کہ مسلمان بینکنگ میں شریک نہیں ہوتے ایک وہم ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کی شرکت دوسرے گروہوں کے مقابلہ میں کم ہے۔

قرضوں کی تعداد اور رقم دونوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حصہ داری کم ہونے کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ان میں غریبی زیادہ اور آمدنی کی سطحیں کم ہونے کی وجہ سے قرضوں کی طلب بھی کم ہے لیکن مسلمانوں کے لیے قرضوں کی بہتر فراہمی کا مسئلہ نہایت پریشان کن ہے کیوں کہ ان کی کثیر تعداد خودروزگاری میں سرگرم ہے۔ لہٰذا قرضوں کی ناکافی فراہمی مسلمانوں کے حالات کے لحاظ سے دوررس اثرات اور مضرات کی حامل ہے۔

تعلیم کی کمی

تعلیم کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ملازمت دوسرا بڑا مسئلہ ہے۔ جیسا کہ پہلے دیکھا جاچکا ہے کہ تعلیم اور ملازمت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے فوائد مسلمانوں کو پہنچتے ہیں لیکن اس کے باوجود کم مسلم بچے ہی اسکول کی تعلیم کی چوکھٹ پار کرپاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ طلب کا بھی ہے (کیوں کہ مسلمانوں کو یہ احساس رہتا ہے کہ نوکری ملنے کے انکے امکانات کم ہیں) اور فراہمی کا بھی (کیوں کہ مسلم آبادی کے علاقوں کے آس پاس اسکول موجود نہیں ہیں)۔

کچھ حد تک سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کمتر شرکت کے لئے ان کے خلاف برتا جانے والا امتیازی سلوک ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ دراصل بہت سے مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ دوسرے سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں ان کی اقتصادی کمزوری کا سبب یہی ہے کہ مسلمانوں کے خلاف امتیازی سلوک کی وجہ سے انہیں نوکریاں نہیں ملتیں۔

چوں کہ مسلم والدین کو اس بات کی امید نہیں ہوتی کہ ان کے بچوں کو نوکریاں ملیں گی تو وہ تعلیم کو اقتصادی ترقی کے ایک ذریعہ کے طور پر اہمیت بھی نہیں دیتے۔ مسلم آبادی میں تعلیم کی کمتر سطح پسندیدہ اور باضابطہ تنخواہ دار ملازمتیں حاصل کرنے میں بھی رکاوٹ بنی ہے۔

2001 میں مسلمانوں کی شرح خواندگی ملکی اوسط سے بہت کم تھی۔ اعلیٰ تعلیم میں حصہ داری بھی مسلمانوں میں کمتر تھی۔ 2001 میں

جب کہ بیس سال سے زیادہ عمر کے 6.7 فیصد لوگ گریجویٹ تھے تو مسلمانوں میں صرف 3.6 فیصد گریجویٹ تھے۔ 30-20 سال کی نوجوان آبادی میں یہ فرق اور زیادہ نمایاں ہے۔ اونچی ذات کے ہندو 19 فیصد گریجویٹ تھے جب کہ مسلمان صرف 4.5 فیصد تھے۔

1999 اور 2005 کے درمیان تمام سماجی طبقوں میں ناخواندگی میں سب سے زیادہ گراوٹ یعنی 9.6 فیصد SC/ST آبادی میں ہوئی۔ مسلمانوں میں یہ گراوٹ صرف 4.8 فیصد تھی۔ اس دوران اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں بھی خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالیہ زمانہ میں مسلمان دیگر سماجی طبقوں کی حد تک اپنی تعلیمی حیثیت میں بہتری نہیں لا پائے ہیں۔

تعلیم میں اتنی کم شرکت اور خاطر خواہ بہتری نہ آنے کے سبب مسلمانوں میں غریب کارکنوں کا بڑا تناسب متوقع ہے کیوں کہ حالیہ عرصہ میں مسلم قوم دوسری قوموں کی حد تک ناخواندگی میں کمی لانے یا اعلیٰ تعلیم میں دخول میں کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

معاشی مسائل اور اعداد وشمار کے تجزیہ میں شماریاتی (statistical) تکنیک کے استعمال (Econometric analysis) سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم کنبہ سے تعلق رکھنے والوں کے لیے باضابطہ تنخواہ دار ملازمت حاصل کرنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قوم غربت وافلاس سے باہر نکلنے کے لیے تعلیم کا راستہ نہیں اختیار کر پائی ہے۔

ثانوی یا دسویں جماعت (matric or 10th) سے زیادہ یا پیشہ وارانہ تعلیم کے پائے جانے کے امکانات مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں پائے گئے۔ فرق کچھ اس طرح ہے

میٹرک سے زیادہ یا پیشہ وارانہ تعلیم کے امکانات	1987 میں	1999 میں
ہندوؤں میں	21 فیصد	38 فیصد
مسلمانوں میں	10 فیصد	22 فیصد

دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کے کارکنوں کے مقابلہ میں مسلم کارکنوں کے کام کے حالات زیادہ غیر یقینی اور ابتر ہیں۔ مسلمانوں میں ایسے کارکنوں کی تعداد زیادہ ہے جو طویل مدتی یا تحریری معاہدوں کے بغیر کام کرتے ہیں۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوؤں میں غیر مستقل یا اتفاقی اجرت دار کام کے تعین میں ذات ایک اہم عنصر ہے اور یہ امکان کم ہوتا ہے کہ اونچی ذات کے ہندو ایسے کام میں لگے ہوں لیکن مسلمانوں میں ایسا نہیں ہے۔ اونچی ذات کے کہلائے جانے والے مسلمانوں کے لیے زراعتی یا غیر زراعتی اتفاقی کام میں لگے رہنے کے امکانات اتنے ہی ہیں جتنے کہ تمام مسلمانوں کے ہیں۔

23.6.3 خودروزگاری

خودروزگاری کے زمرہ میں زراعت سے وابستہ مسلم کارکنوں کی تعداد دیگر قوموں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دوسرے سماجی و مذہبی قوموں کے مقابلہ مسلمانوں میں بھومہینوں کی تعداد زیادہ ہے اور دوسرے یہ کہ دوسروں کے مقابلہ میں مسلم آبادی کا زیادہ بڑا حصہ شہری علاقوں میں رہتا ہے۔

دوسروں کے مقابلہ میں مسلم کارکن بالخصوص خواتین زیادہ تر خودروزگاری میں لگے ہوئے (self-employed)اور گھروں میں مرکوز(home-based) ہیں۔

2004-5 میں دیکھا گیا کہ شہری ہندوستان کے تقریباً نصف ہندو اور عام خواتین اپنے گھروں میں مرکوز رہ کر اقتصادی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جب کہ مسلمانوں میں ایسی خواتین کا تناسب 70فیصد پایا گیا۔مسلم مردوں میں 14فیصد ایسے تھے جو گھر میں رہ کر کام کر رہے تھے۔

آج بھی اکثر روایتی پابندیاں خواتین کے گھر سے باہر کام کرنے میں حائل ہیں۔یہ مسلم خواتین کے لیے بطور خاص درست ہے اور ہندو اعلیٰ ذات کی خواتین کے لیے بھی ایسا ہی کچھ معاملہ ہے۔مزید یہ کہ خواتین پر بچوں سمیت گھر کی دوسری ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اس لئے ان کے لیے گھر سے باہر جا کر کام کرنا دشوار ہوتا ہے۔

جب کہ مسلم خواتین زیادہ تر گھر میں کام کرتی ہیں، مسلم مردوں کے لئے کام کے خاص مقامات یعنی کارخانوں، دفاتر اور دکانوں میں کام کرنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

مسلم عورتوں کے مقابلہ میں مسلم مردوں کے سڑکوں پر کام کرنے کے امکان زیادہ ہیں۔یعنی 8فیصد ایسے مسلم مرد ہیں جو کسی مقررہ جگہ پر کام نہیں کرتے۔یہ زیادہ تر ٹرانسپورٹ کے کارکن یا خوانچہ فروش ہیں۔دوسروں کے مقابلہ میں خوانچہ فروشی میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے۔

تقریباً دیگر تمام سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلہ میں غیر مستقل زمرہ (informal sector) میں مسلمانوں کی شرکت کہیں زیادہ ہے۔دیگر سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کے مقابلہ میں مسلم کارکنوں کا زیادہ بڑا حصہ صنعتی پیداوار (manufacturing)، خردہ فروشی (retail trade) اور خود اپنے طور پر کی جانے والی تجارت (own account trade) میں لگا ہوا ہے۔

شہری علاقوں میں آدھے سے زیادہ مسلم کارکن بے ضابطہ (informal) غیر زرائتی خودروزگاری میں لگے ہوئے ہیں۔وہ یا تو خود اپنا کام کرتے ہیں یا بلا اجرت گھریلو مددگار کی حیثیت سے جبکہ قومی سطح پر ایسے کارکنوں کا تناسب 37فیصد ہے۔

ذاتی کام یا کاروبار کے زمرے میں ایک چوتھائی (1/4) سے زیادہ مسلمان یا تو خود اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں یا پھر ایسی چھوٹی اکائیوں (units) میں جو صرف گھریلو کارکنوں کی مدد سے یا ایک شخص کی ملکیت میں چلتی ہیں۔

24.6.4 باضابطہ کام میں کم حصہ

دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں کے مقابلہ میں مسلم کارکنوں کا باضابطہ اور مستقل (regular) کام یا نوکریوں میں حصہ بہت کم ہے۔ اگر تعلیم اور دوسری خصوصیات کو بھی جوڑیں تب بھی یہ فرق بنا رہتا ہے مگر ان تخمینوں کی بنا پر امتیازی سلوک کا دعویٰ کرنا مشکل ہے۔

شہری علاقوں میں باضابطہ تنخواہ یا اجرت دار ملازمت میں سماجی و مذہبی گروہوں (SRCs) کی آبادی کا تناسب کچھ اس طرح ہے۔

اونچی ذات کے ہندوؤں میں سے 49فیصد

دوسرے مذہبی فرقوں میں سے 44فیصد

مسلمانوں میں سے صرف 25فیصد باضابطہ تنخواہ دار ملازمت میں لگے ہوے ہیں۔

اسی لئے دوسروں کے مقابلہ میں ایسے مسلم کارکنوں کا تناسب بہت زیادہ ہے جنھیں اجرت داروں کے فوائد حاصل نہیں ہیں۔اپنی گھریلوں ذمہ داریوں کی وجہ سے خواتین کوزیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ مقررہ وقت کی ملازمت نہیں کرپاتی ہیں اس وجہ سے مردوں کے مقابلہ میں وہ بے ضابطہ (irregular) کام میں زیادہ مصروف رہتی ہیں۔

دوسرے باضابطہ کارکنوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی آمدنی بھی کم ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ باضابطہ تنخواہ یا اجرت دار ملازمتوں میں حکومت/سرکاری زمرے کی ایسی ملازمتوں میں مسلمان بہت کم پائے جاتے ہیں جن کی مانگ عموماً زیادہ ہے۔یعنی ایسی نوکریاں جن میں اچھی تنخواہ کے ساتھ روزگار اور سماجی تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔اونچی ذات کے شہری مسلمانوں میں سے بھی صرف 9فیصد کے پاس ایسی نوکریاں ہیں۔

24.6.5 سرکاری ملازمتوں میں کم حصہ

حکومت کے/سرکاری زمرے میں بالخصوص اور بڑے نجی زمرے میں بھی مسلمانوں کی شراکت داری بہت کم ہے۔حکومت کے جملہ شعبوں/محکموں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بہت کم ہے۔مثال کے طور پر مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے جملہ ملازمین میں مسلمانوں کا تناسب صرف 4.9فیصد ہے۔مرکزی سرکاری زمرے کے اداروں (PSUs) میں مسلمانوں کا تناسب 3.3فیصد ہے جب کہ ریاستی سطح کے ایسے اداروں میں 10.8 فیصد ہے۔IAS میں مسلم نمائندگی 3فیصد، IPS اور ریلوے دونوں میں 4فیصد اور قومی تحویل والے (nationalised) بینکوں میں 2.2فیصد ہے۔ریاستی محکموں میں سے عدلیہ میں مسلم نمائندگی صرف 5فیصد ہے۔

24.6.6 اعلیٰ سرکاری عہدوں میں کم نمائندگی

حکومت کے مختلف شعبوں میں ملازمت کے متعلق تفصیلی جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں مسلمانوں کی نمائندگی بہت کم ہے اور ان کے پاس زیادہ تر نچلی سطح کی نوکریاں ہیں۔

سرکاری نوکریوں سے متعلق اعداد و شمار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اعلیٰ منیجری سطحوں پر مسلم نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ مسلمان سرکاری ملازمتوں میں زیادہ تر نچلی سطحوں پر، یونیورسٹیوں میں غیر تدریسی عملہ میں اور اس کے بعد ریلوے اور محکمۂ ڈاک وغیرہ میں کلرک جیسے عہدوں پر ملازم ہیں۔

مسلمانوں میں اکثر یہ سوچ پائی جاتی ہے کہ سرکاری نوکریوں میں ان کی کمتر نمائندگی کی وجہ ان کے خلاف برتا جانے والا امتیازی سلوک ہے۔کیوں کہ تقرر کرنے والی کمیٹیوں میں اقلیتوں کی نمائندگی نہیں ہوتی۔نیز اختیار و اقتدار کے عہدوں پر بھی مسلمان نظر نہیں آتے ہیں۔

ایک طرف حکومت کی بے توجہی اور دوسری طرف تعصب و امتیازی سلوک کا نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ نچلے درجے یعنی درجہ چہارم (Class

(IV یا Grade D کی سرکاری ملازمتوں میں بھی مسلم نمائندگی حد درجہ کم ہے حالاں کہ ان ملازمتوں کے لیے بہت زیادہ تعلیمی لیاقت درکار نہیں ہے۔

ایسی سرکاری نوکریوں میں مسلمان بہت کم ہے جو عوامی خدمات سے متعلق ہیں مثلاً صحت (Nursing)اور سیکورٹی (Police)وغیرہ۔اس سے مسلمانوں کی خوداعتمادی بھی متاثر ہوتی ہے اور عدم تحفظ اور بنیادی دھارے سے علیحدگی کے احساس کو بڑھاوا ملتا ہے۔

شہری علاقوں میں مسلمانوں کی با ضابطہ تنخواہ دار ملازمتیں زیادہ تر سرکاری نہیں بلکہ نجی تجارتی اداروں میں زیادہ ہیں اور یہ نوکریاں سرکاری نوکریوں کے مقابلہ میں کم معیاری ہیں اسی وجہ سے ان سے ہونے والی آمدنی اور فوائد بھی کم ہیں نیز ان میں روزگار اور سماجی تحفظ بھی حاصل نہیں ہے۔

24.6.7 غریب کارکنان

غریب کارکنوں (working poor) کی تعداد مسلمانوں میں زیادہ ہے۔مختلف سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) میں بے روزگاری کی شرح میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن ان کے درمیان غریبی کی سطحوں میں خاطر خواہ فرق پایا جاتا ہے۔2004-5 میں جب کہ ملکی سطح پر مجموعی غربت کی شرح 22 فیصد تھی لیکن مسلم آبادی میں یہ شرح 27 فیصد تھی۔

سرکاری اندازوں کے مطابق 1993 اور 2005 کے درمیان ہندوستان میں غربت میں کمی آئی لیکن یہ امر نہایت افسوس کن ہے کہ مسلم غربت میں گراوٹ بہت کم واقع ہوئی جو SC/ ST طبقے کی غربت میں آئی گراوٹ سے بھی کم ہے۔مختلف سماجی ومذہبی گروہوں میں بے روزگاری کی شرح میں زیادہ فرق نہ ہونے کے باوجود مسلمانوں میں غریبی کی سطح زیادہ اور اس میں آنے والی کم گراوٹ کا یہ مطلب ہے کہ مسلم کارکنان ایسے کاموں سے جڑے ہوئے ہیں جن میں بہت کم آمدنی ہے۔لہٰذا وہ 'غریب کارکنوں' میں شمار ہوتے ہیں یعنی وہ کارکن جو خط افلاس کے نیچے رہتے ہیں۔

شہری علاقوں میں با ضابطہ سرکاری زمرے کی ملازمتوں میں بھی غریب کنبوں میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ یعنی 14 فیصد تھا جب کہ جملہ کارکنوں میں یہ تناسب 4 فیصد اور ہندوؤں میں 7 فیصد تھا۔ایسے ہی نجی زمرے کے با ضابطہ تنخواہ دار کارکنوں میں مسلم اور دوسرے کارکنوں میں غربت کا اور زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔مسلم غریب کنبوں کا تناسب 30 فیصد ہے جب کہ ہندوؤں میں یہ صرف 20 فیصد ہے۔

عمومی طور پر با ضابطہ سرکاری اور نجی زمرے کے اداروں میں مسلم مرد وعورتیں کمتر کاموں سے وابستہ ہیں جیسے کلرک یا درجہ چہارم (Class (IV کے ملازمین جب کہ ہندوؤں کے منیجری اور پیشہ ورانہ عہدوں پر فائز ہونے کے امکان زیادہ ہیں۔

نجی زمرے میں ہندو و مسلم کارکنوں کی آمدنی کے درمیان فرق کے درج ذیل اسباب ہوسکتے ہیں:

- دونوں فرقوں کے ذریعہ کئے جانے والے کاموں کی نوعیت کا فرق
- خود نجی زمرے کے کاروباروں کی نوعیت

مسلمان چھوٹے، غیر باضابطہ اور کم پیداواریت والے کاروباروں میں زیادہ سرگرم ہیں جیسے چھوٹی ورکشاپ جہاں مسلم مردوں کی بڑی تعداد گیریجوں میں میکینکوں کی طرح کے کام کرتی ہے۔ ایسے ہی خواتین بھی چھوٹے پیداواری کاروباروں سے وابستہ ہوسکتی ہیں۔

نجی ملازمتوں میں مسلم کارکنوں کو ملنے والی کمتر تنخواہیں انکے کنبوں کی غربت کا سبب بنتی ہیں۔ اس طرح سے غیر باضابطہ ملازمت اور غریبی کے درمیان واضح تعلق نظر آتا ہے۔ اکثر کسی خاص سماجی و مذہبی گروہ سے وابستگی بھی حالات کو بدتر بنا دیتی ہے۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں میں تھوڑی آمدنی والے طبقہ میں کم لوگوں کے رہنے کے امکان ہیں۔

غیر زراعتی خودکار طبقے میں بھی ہندو و مسلم غریب کارکنوں کے تناسب میں واضح فرق پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ تناسب 45فیصد ہے جب کہ ہندوؤں میں صرف 26فیصد ہے۔ لیکن سب سے برے حالات خود اپنے لئے کام کرنے والی مسلم خواتین کے ہیں جن کا تناسب بھی بہت زیادہ ہے۔ ان کی بظاہر اقتصادی آزادی کے پیچھے ان کی مجبوریاں کارفرما ہیں۔ کم تعلیمی لیاقت، اساسوں تک عدم رسائی اور باہر نکلنے اور لوگوں سے روابط قائم کرنے پر پابندی کے سبب وہ اپنے کام سے ہونے والی کمائی سے بمشکل ہی گزر بسر کر پاتی ہیں۔ کیوں کہ ایسی مسلم خواتین کی تعداد بہت زیادہ ہے جو گھروں میں ذیلی ٹھیکیداری کے تحت کام کرتی ہیں اس وجہ سے اپنے طور پر کام کرنے والے مسلم غریب کارکنوں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔

24.6.8 مسلم خواتین کا WPR

روزگار سے جڑے پیشوں میں مسلم خواتین کی شرکت بہت کم ہے اور ان کی بڑی تعداد غیر باضابطہ زمرے میں لگی ہوئی ہے۔ عمومی طور پر بھی ہندوستان کے کارکنوں میں مسلمانوں کا حصہ بہت معمولی ہے۔

کارکنوں میں خواتین کی شراکت ان کی اقتصادی حیثیت کے اشاریوں میں سے ایک ہے۔ یہ توقع کی جاتی ہے کہ اس سے انہیں اقتصادی آزادی حاصل ہوگی جس کے نتیجہ میں انہیں روزمرہ کی زندگی میں کچھ اختیارات بھی حاصل ہوں گے۔

کارکنوں کے آبادی تناسب یا کام میں شرکت یا حصہ داری کی شرح (WPR) یہ اندازہ لگانے میں مدد دیتی ہے کہ کوئی آبادی اقتصادی سرگرمی میں کس حد تک شریک ہے۔ مسلم خواتین کا WPR یعنی کام میں شرکت کی ان کی شرح دوسرے سماجی و مذہبی گروہوں کی خواتین سے کافی کم ہے۔ اس سے ان کے اقتصادی طور پر اور زیادہ کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہندوستان میں کام میں شرکت کا تناسب کچھ اس طرح ہے۔

مردوں میں 87فیصد

خواتین میں 44فیصد

مسلم خواتین میں 25فیصد

دیہی ہندو خواتین 50فیصد

دیہی مسلم خواتین 28فیصد

دیہی مسلم خواتین کی کم شرکت کا ایک سبب یہ ہے کہ مسلم کنبوں کی زراعت سے وابستگی کم ہے۔شہری علاقوں میں مجموعی طور پر کام میں خواتین کی شراکت کم ہے اور ان میں مسلم اور اونچی ذات کی خواتین کی شرکت 15۔فی صد ہے جو کہ سب سے کم ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دوسرے فرقوں کی خواتین کے مقابلہ میں مسلم عورتو ں کے اجرت کمانے والے طبقے میں شامل ہونے کے امکان کم ہیں۔

24.6.9 خودروزگار مسلم خواتین کے مسائل

زیادہ تر ذاتی طور سے کام کرنے والی (self-employed) مسلم خواتین ٹھیکیداروں کے لیے کام کرتی ہیں اور ان کے معاہدوں کی شرائط (contractual conditions) بھی ابتر ہوتی ہیں۔شہری علاقوں میں گھر پر کام کرنے والی 56فیصد مسلم خودروزگار خواتین ہیں اس کے برعکس شہروں میں معاہدہ پر کام کرنے والی ہندو خواتین کا تناسب 42فیصد ہے۔

شہری مسلم خواتین کی ایک بڑی تعداد اپنے طور پر روزگار سے جڑی ہوئی ہیں۔اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی اقتصادی سرگرمی ان کے اختیار میں ہے لیکن اصل میں ان کی ایک بڑی تعداد گھر پر رہ کر ذیلی ٹھیکیداروں کے لیے پیداواری (manufacturing) سے جڑے کام کرتی ہیں۔باہر نکل کر دوڑ دھوپ کرنے اور برادری سے باہر لوگوں سے بات چیت کرنے پر ممانعت کے باعث یہ خواتین اکثر ایسے ٹھیکوں کے کام کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں جن میں زیادہ منافع نہیں ہے۔

اس قسم کے ذیلی ٹھیکیداروں کے کام کی اجرت زیادہ تر کام کے لحاظ سے (piece-rate) سے ادا ہوتی ہے اور یہ اکثر اتفاقی کام کی اجرت (casual wage rates) سے کم ہوتی ہے۔

اکثر مسلم خواتین کو کام فراہم کرنے والے ٹھیکیدار اور بیچ ۔لیے ان خواتین کے رشتہ دار یا پھر مسلمان ہوتے ہیں۔مذہبی اور سماجی بندشوں کی وجہ سے خواتین کو کام کی زیادہ سے زیادہ قیمت حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملتے۔کم اجرت کے باوجود مسلم خواتین اس قسم کا کام کرتی ہیں کیوں کہ پابندیوں،غربت اور تعلیم وتکنیکی مہارتوں کی کمی کے سبب ان کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔سلائی،کڑھائی،کشیدہ کاری، زری اور چکن کا کام،تیار ملبوسات،اگربتی،بیڑی اور پتنگ سازی وغیرہ ایسے پیشے ہیں جن میں بیشتر مسلم خواتین کارکن برسر کار ہیں۔

24.6.10 حل

قرضوں کی فراہمی

- سماجی ومذہبی گروہوں (SRCs) کے لحاظ سے قرضوں کی فراہمی کے متعلق تفصیلی اعداد وشمار دستیاب ہونے چاہئیں۔
- بینکوں کے لئے کسی شہر وعلاقہ میں قرضوں کی علاقائی تقسیم کے متعلق معلومات فراہم کرنا ضروری ہونا چاہئے۔اس سے مسلمانوں کو قرض نہ مل پانے کا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔
- بینک کے باضابطہ قرضوں تک مسلمانوں کی رسائی بہتر ہونی چاہئے۔کیوں کہ زیادہ تر قرضوں کی فراہمی ان ہی کے ذریعہ

ہوتی ہے۔اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اکثریتی پروگراموں کے ذریعہ بڑے پیانہ پر بھی مسلمانوں کی قرضوں تک رسائی ہو۔

خودامدادی گروپ (SHG)

- خودامدادی گروپوں (SHGs) اور دیگر مائکرو کریڈٹ پروگراموں میں مسلمانوں کی شرکت بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔مزید یہ کہ ان اسکیموں میں مسلمانوں کی حصہ داری سے متعلق اعداد وشمار مقامی سطح پر فراہم ہونے چاہئیں۔
- سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی بڑھانے کی کوششیں ہونی چاہئیں۔

جو محدود اعداد وشمار اور معلومات دستیاب ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر مسلمان نوکریوں کے لیے درخواست دیتے ہیں تو ان کی کامیابی کی شرح اوسط سے زیادہ مختلف نہیں ہوتی لیکن بظاہر بہت کم مسلمان نوکریوں کے لیے درخواست دیتے ہیں۔اس کے دو سبب ہیں

1۔ ان کا یہ احساس کہ ان کا انتخاب نہیں ہوگا۔اس کا یہ مطلب ہوا کہ مطلوبہ اوصاف ہونے کے باوجود امتیازی سلوک کے احساس کی وجہ سے مسلمان باضابطہ نوکریاں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

2۔ تعلیمی کمی کے سبب بہت کم مسلم افراد ان ملازمتوں کے اہل ہوتے ہیں۔

مجموعی طور پر تعلیمی سطح کی بہتری تو وقت طلب مسئلہ ہے۔فی الحال مختلف طریقوں سے ایسی کوششیں کی جانی چاہئے کہ جو لوگ ملازمتیں پانے کے اہل ہیں ان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو درخواستیں دینے کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔خاص طور سے ایسی نوکریوں میں مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے جن میں عوام سے رابطے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں جیسے کہ محکمۂ تعلیم،صحت،پولیس وغیرہ۔اس سے قوم کے اندر خوداعتمادی اور بنیادی دھارے میں شمولیت کے احساس کو بڑھاوا ملے گا اور عدم تحفظ کا احساس دور ہوگا۔

ایسے اقدامات کی ضرورت ہے جن کے تحت مسلم کارکنوں کی روایتی حرفتوں و دستکاریوں کو جدید مینجمنٹ کے طریقوں،نئی ٹکنالجی اور بازار کی ضرورتوں سے جوڑا جائے۔پالیسی کے لحاظ سے ان علاقوں،پیشوں اور کاروباروں پر زیادہ توجہ درکار ہے جن میں مسلمانوں کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے اور جن میں نمو کے امکانات بھی ہیں۔

چوں کہ مسلم کارکنان کی ایک بڑی تعداد غیر باضابطہ زمرے سے جڑی ہے لہٰذا ایسے کارکنوں کو سماجی تحفظ فراہم کرنے والا کوئی بھی قدم مسلمانوں کے لیے نہایت مفید ہوگا۔

مسلمانوں کی اقتصادی حیثیت بہتر بنانے،پسندیدہ باضابطہ ملازمتوں میں ان کے دخول اور خودروزگاری میں آمدنی اور پیداواریت (productivity) کو بہتر بنانے کے لئے ایک اہم عنصر بنیادی تعلیم اور نئی تکنیکی مہارتوں کا حصول ہے۔اس کے بغیر مسلم قوم ہندوستان کی بڑھتی ہوئی اقتصادی ترقی کے فوائد سے محروم ہوگی۔

معلومات کی جانچ

1۔ ایسے اسباب کی نشاندہی کریں جن کی وجہ سے مسلمان معاشی بدحالی کا شکار ہیں؟

2۔ مسلمانوں کو درپیش معاشی مسائل پر روشنی ڈالیں۔

3۔ مسلمانوں کی معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لئے کس طرح کے اقدامات اٹھائے جانے چاہئیں۔

24.7 سماجی صورت حال

24.7.1 تعارف

ہندوستانی مسلمان ذاتوں، ذیلی ذاتوں، اور سماجی طبقات کے علاوہ فرقہ وارانہ اور علاقائی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ان پر ملک کی ثقافتی روایات اور سماجی ساخت کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔

24.7.2 سماجی ساخت

ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی ساخت سے متعلق سماجیاتی مطالعوں میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں نسب اور توارث پر مبنی سماجی تفریقات موجود ہیں۔

ہندو ذات کے نظام کی خصوصیات مثلاً سماجی طبقوں کی درجہ بندی، اندرونی سلسلہ ازدواج اور موروثی پیشے، ہندوستانی مسلمانوں میں بھی کافی حد تک پائے جاتے ہیں۔

اسلام کے تصور مساوات کے باوجود ہندوستان کے مسلم معاشرے میں درجہ بندی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ایسا نظام بھی جو ہندو ذات کے نظام کے مثل ہے۔

1901 کی ہندوستان کی مردم شماری میں 133 ایسے سماجی طبقوں کی فہرست تھی جو پوری طرح یا جزوی طور پر مسلمان تھے۔

24.7.3 سماجی طبقات

آج کا ہندوستانی مسلم معاشرہ 4 بڑے طبقوں میں منقسم ہے۔

(1) اشراف جو اپنی جڑیں عرب، ایران، ترکی یا افغانستان سے جوڑتے ہیں۔

(2) وہ جو اسلام قبول کرنے سے پہلے اعلیٰ ذات کے ہندو تھے۔

(3) اسلام قبول کرنے والے درمیانی ذاتوں کے لوگ جن کے پیشے مذہبی رسوم کے لحاظ سے صاف ستھرے ہیں۔

(4) اسلام قبول کرنے والے سابقہ اچھوت ذاتوں کے لوگ مثلاً بھنگی، مہتر، چمار، ڈوم وغیرہ۔

یہ چاروں طبقے عموماً دو عمومی زمروں میں رکھے جاتے ہیں۔اشراف اور اجلاف

اشراف میں بیرونی خون والے اور اعلیٰ ذاتوں کے مسلمان ہو جانے والے لوگ شامل ہیں۔اشراف کے معنی ہیں شریف، معزز

یا برتر۔

اجلاف کے معنی کم مرتبہ یا ناپاک کے ہیں، یہ صاف ستھرے پیشوں اور نچلی ذاتوں کے مسلمان ہونے والے لوگوں پر مشتمل ہیں۔

اتر پردیش، بہار اور بنگال میں سید، شیخ مغل اور پٹھان اشراف میں شمار کیے جاتے ہیں۔

اجلاف میں بڑھئی، دست کار، رنگریز، چراوہے، چمڑہ تیار کرنے والے، گھوسی وغیرہ شامل ہیں۔

1901 کی مردم شماری کے مطابق اجلاف میں مختلف طبقوں کے مذہب تبدیل کرنے والے لوگ شامل ہیں جنھیں بہار میں نومسلم اور شمالی بنگال میں 'نیسیا' کہا جاتا ہے

ان میں مختلف پیشوں کے لوگ بھی شامل ہیں مثلاً جولاہے، دھنیے، کلو، کنجڑے، حجام، درزی وغیرہ۔

اکثر نومسلم اپنے سابقہ سماجی رسوم ورواجوں پر قائم رہتے ہیں۔ کچھ نے تبدیلِ مذہب سے قبل کے اپنے خاندانی نام نہیں بدلے جیسے کہ ہریانا اور راجستھان کے میو جنھیں اپنے راجپوت ورثہ پر فخر ہے اور گجرات کے پٹیل، دیسائی اور شاہ

1901 کی مردم شماری میں ارزال نام کے ایک تیسرے زمرے کا بھی ذکر ہے جس کے معنی ہیں نیچ۔

یہ کمترین ذاتوں مثلاً حلال خوروں، لال بیگوں، ابدالوں اور بیڈیوں پر مشتمل ہے۔

24.7.4 علاقائی سماجی تفریقات

وراثت پر مبنی سماجی تفریقات کا یہی قرینہ دیگر علاقوں میں بھی نظر آتا ہے۔

کیرل میں مالابار کے موپلا مسلمانوں کو پانچ درجات میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ تھنگل، عربی، مالاباری، پوسالا راور اوسان۔ تھنگل اعلیٰ ترین درجہ رکھتے ہیں۔ یہ اپنا نسب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہؓ سے جوڑتے ہیں۔

ان سے کمتر درجہ پر عربی ہیں جو خود کو عرب مردوں اور مقامی عورتوں کی اولادوں میں شمار کرتے ہیں اور اپنی عرب وراثت پر قائم ہیں۔

ان کے بعد مالاباری آتے ہیں۔ عرب کے ساتھ ان کا نسبی سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور وہ مادرانہ توریث کا نظام اختیار کر چکے ہیں۔

پوسالار، مکّوون کہے جانے والے ان ہندو مچھیروں کی اولاد ہیں جنھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کی حیثیت کم ہے۔ اوسان حجام ہیں اور اپنے پیشے کے لحاظ سے کمترین حیثیت رکھتے ہیں۔

1987 میں آندھرا پردیش میں کی گئی ایک فیلڈ سٹڈی میں مسلمانوں میں ایسے گروہ پائے گئے جو درجہ بندی کے حامل ہیں اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔

اس درجہ بندی میں اعلیٰ ترین مقام ان کو حاصل اپنے جو باہر سے آئے ہوئے ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یعنی سید شیخ، پٹھان اور لبّائی (مقامی خواتین سے شادی کرنے والے عرب تاجروں کی اولاد)

سب سے کم حیثیت ان کو حاصل ہے جن کے کام کو گندا تصور کیا جاتا ہے مثلاً دووے کولا (دھنیا) ،حجام اور فقیر ۔بڑبڑ کی ۔

اتر پردیش کے ایک گاؤں کے مطالعے سے 18 غیر اشراف طبقوں کی نشاندہی کی گئی جو OBC میں شامل ہیں اور اپنے روایتی پیشوں سے جانے جاتے ہیں ۔مثلاً جولا ہے ،میراثی ، درزی ،حلوائی ،منیہار وغیرہ ۔

1911 کی مردم شماری میں اتر پردیش کے مسلمانوں سے متعلق 102 برادریوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن میں سے کم از کم 97 کا تعلق غیر اشراف سے تھا۔

بہت سی ایسی برادریاں تھیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں موجود تھیں جیسے راجپوت ، کایستھ ، کوری ، کوری ،کمہار ، کرمی ، مالی موچی وغیرہ ۔

24.7.5 ذات ۔لچکر یا لچکدار؟

کچھ تحقیقات کی بنا پر یہ جتایا گیا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ مسلم ذاتی شناختیں وقت کے ساتھ بدلتی نہیں ہیں بلکہ ذات ،مذہب اور معیشت سے جڑی شناختیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور کافی حد تک بدلتی رہتی ہیں ۔مزید یہ کہ وقت کے ساتھ ذات سے جڑی شناختوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے کیوں کہ ان سے کوئی خاص سیاسی اور معاشی فوائد حاصل نہیں ۔سماجی دائرے میں بھی محض اعلیٰ ذات اونچا مرتبہ فراہم نہیں کرتی ہے جب تک کہ تعلیم ، پیشے یا آمدنی کے ذریعے اسے مزید تقویت نہ بخشی جائے ۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ اجلاف طبقے کے افراد کو سماجی برتری حاصل کرنے کے لئے اونچے طبقے میں داخل ہونے کے مواقع حاصل ہو سکتے ہیں ۔اور اکثر یہ اپنے سے اعلیٰ طبقوں میں جذب بھی ہو جاتے ہیں ۔

ہندوؤں میں مختلف ذاتوں میں آپس میں شادیاں کرنا تقریباً ناممکن تھا ۔مسلمانوں میں بھی اس پر پابندیاں اور رکاوٹیں ہیں ۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بلند رتبے کے لئے کوشاں مسلم خاندان کے لئے اپنے سے اعلیٰ سماجی حیثیت رکھنے والے گروہوں میں شادی کرنا مشکل تو ہے لیکن ناممکن نہیں ۔

کچھ لوگوں کا ماننا ہے کہ مسلمانوں میں ان کی مذہبی پہچان ذات کے اختلافات پر غالب آجاتی ہے ۔اسی وجہ سے مسلم اشراف اور ان سے بڑھ کر ہندوستان کے حکمران اشرافیہ نے مسلم ذاتوں کے اختلافات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اکثر ان اختلافات کو نظر انداز کیا ہے ۔

اس کے برعکس کچھ دیگر تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی سیاسی حمایت حاصل کرنے کی کوشش نے ذات کی بنیادوں پر انہیں سیاسی طور پر متحرک اور منظم کر دیا ہے کیوں کہ اجلاف اشرافیہ کی سیاست سے اپنے آپ کو نہیں جوڑ پاتے ۔

24.7.6 ذات اور سیاست

مسلم سماج میں پائے جانے والے اندرونی تفریقات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاسی جماعتیں ان کا استعمال لوگوں کو سیاسی طور پر متحرک اور منظم کرنے کے لئے کرتی ہیں ۔

مسلمانوں میں ذات کی بنیاد پر تفریقات سب سے زیادہ نمایاں طور پر بہار اور یو پی میں نظر آتی ہیں۔

ذات کی بنا پر مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحرک کرنے کی کوششوں نے ان تفریقات کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ہے۔ بظاہر بہار میں مذہبی شناختوں کے مقابلے میں ذات کی شناختیں زیادہ اہم نظر آتی ہیں۔ یہ واضح نہیں ہے کہ یہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر متحرک کرنے کی کوششوں کا نتیجہ ہے یا اس کی وجوہات کچھ اور رہیں۔

عام طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسلم سماج میں تفریقات پائی جاتی ہیں اور اس بات کی عکاسی حکومت کی تمام پالیسی اقدامات میں ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر مسلم ارزال اور اجلاف کو ایک عمومی OBC زمرے میں یکجا کر کے منڈل کمیشن نے ان دونوں طبقوں کو درپیش محرومیوں کے فرق کو نظر انداز کر دیا۔ ارزال سماجی درجہ بندی میں سب سے نیچے ہونے کی وجہ سے بدترین حالت میں ہیں اور ان کے ساتھ علاحدہ سلوک درکار ہے۔ زیادہ مناسب ہوگا اگر انہیں SC فہرست میں یا کم از کم OBC کے اندر بنائے گئے حد درجہ پسماندہ طبقوں میں شامل کر لیا جائے۔

24.7.7 مسلم OBC

اس وقت OBC میں شامل مسلم طبقوں کا تعلق مسلمانوں کے غیر اشراف طبقے سے ہے۔ یہ ان درمیانی اور چھوٹی ذاتوں کے ہندوؤں کی اولاد ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ انہیں ان کے روایتی پیشوں سے پہچانا جاتا ہے۔

آئینی (SC) حکم 1950 میں SC درجہ صرف 'غیر صاف ستھرے' کام کرنے والے ہندو طبقوں کے لئے مخصوص کیا گیا ہے (بعد میں مذہبی سکھوں' اور نو بودھوں کے لئے ترمیمات کی گئیں) ان کے جیسے غیر ہندو طبقوں کو مذہب تبدیل کرنے والے درمیانی ذاتوں کے لوگوں کے ساتھ یکجا کر کے OBC قرار دے دیا گیا۔

اس طرح مسلم OBC کے دو زمرے ہیں:

(1) ارزال سے متعلق 'اسلام قبول کرنے والے اچھوت' جو OBC فہرست میں شامل کر لئے گئے ہیں جیسے حلال خور، ہیلا، لال بیگی یا بھنگی، دھوبی، نائی، چکوے اور فقیر۔

(2) اجلاف یا مذہب تبدیل کرنے والے 'صاف ستھرے' پیشوں والی ذاتوں کے لوگ جیسے مومن یا جلاہے، درزی یا ادریسی اور راعین یا کنجڑے۔

اس طرح مسلمانوں میں 3 طبقے نظر آتے ہیں:

(1) اشراف جو کسی بھی سماجی محرومی کا شکار نہیں ہیں۔

(2) اجلاف جن کی حیثیت ہندو OBC جیسی ہے۔

(3) ارزال جو ہندو SC جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔

جنہیں مسلم OBC کہا جاتا ہے ان میں (2) اور (3) کے تحت طبقے شامل ہیں۔

2004-5 کے NSSO کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ 41% مسلمانوں نے خود کو OBC قرار دیا۔

1955 میں پہلے پسماندہ طبقات کمیشن نے پہلی بار مسلمانوں (اور دیگر مذہبی اقلیتوں) میں پسماندہ برادریوں کی موجودگی کو سرکاری طور پر تسلیم کیا۔ مگر کمیشن نے اس بنا پر ذات کے پیمانے کو منظوری نہیں دی کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مفروضہ طور پر ذات پات نہیں ہے۔

1980 میں دوسرے کل ہند پسماندہ طبقات یا منڈل کمیشن نے اصولی طور پر تسلیم کیا کہ ذاتوں یا ذات جیسی خصوصیات کے اثرات مسلم اور دوسرے غیر ہندو فرقوں میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن کمیشن نے غیر ہندو OBC کی نشاندہی کے لئے 'ذات' کا پیمانہ استعمال کرنے سے گریز کیا کیوں کہ یہ مذاہب مساوات اور انصاف پر مبنی ہیں۔

منڈل کمیشن نے مسلم ارزال اور اجلاف کو ایک عمومی زمرے میں یکجا کرتے ہوئے 82 سماجی گروپوں کو OBC قرار دیا۔

مسلم OBC کی ریاست وار آبادی

کیرل، تمل ناڈو اور ہریانہ میں تقریباً تمام تر مسلم آبادی OBC پر مشتمل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کیرل میں موپلا مسلمانوں کو جو ریاست کی مسلم آبادی کا تقریباً 90% حصہ ہیں، مرکزی فہرست میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اسی طرح ہریانا میں مسلم آبادی کا غالب حصہ میو مسلمانوں پر مشتمل ہے جو OBC ہیں۔

بہار، اتر پردیش، راجستھان، مدھیہ پردیش اور جھارکھنڈ کی ہندی۔اردو بولنے والوں کی پٹی میں OBC قرار دیے گئے مسلمان اکثریت میں ہیں۔

دوسری جانب مغربی بنگال اور آسام میں جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے مسلم OBC کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اس لئے ان ریاستوں کے بیشتر مسلمانوں کو OBC حیثیت سے وابستہ فوائد حاصل نہیں ہیں۔

مسلم OBC اور ریاستوں میں مثبت اقدام

مسلم پسماندہ طبقوں سے متعلق مثبت اقدام کے 3 ماڈل مختصراً یوں ہیں:

(1) بالائی سطح (creamy layer) کو چھوڑ کر پورے مسلم فرقے کے لئے سیٹوں کا رزرویشن: کیرل اور کرناٹک

(2) پسماندہ ذاتوں / برادریوں کے لئے رزرویشن جس میں بیشتر مسلم برادریاں شامل ہیں۔ لہٰذا 95 فی صد مسلم آبادی رزرویشن کے دائرے میں شامل ہیں: تمل ناڈو

(3) OBC کی پسماندہ طبقوں (BC-Backward Classes) اور MBC (Most Backward Classes) یعنی سب سے پسماندہ طبقوں میں تقسیم۔ بیشتر مسلم پسماندہ طبقے MBC فہرست میں شامل: بہار

مسلم OBC کے مسائل اوران کے حل

جیسا کہ دیکھا جاچکا ہے، سرکاری اورنجی زمرے کے روزگار میں مسلمانوں کی حد درجہ کم نمائندگی تشویشناک ہے۔ مسلم OBC کی نمائندگی اوربھی ابتر ہے۔

ملک کی کل OBC آبادی میں مسلم آبادی کا تناسب 15.7 فی صد ہے۔ لیکن اس کی عکاسی سرکاری ملازمتوں یا تعلیمی اداروں میں ان کی نمائندگی سے نہیں ہوتی۔ لہذا مرکزی حکومت کے ماتحت آنے والے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں منڈل کمیشن کی سفارشات نافذ کیے جانے کا مطالبہ بزور کیا جاتا ہے۔

پسماندہ مسلمانوں کے بچوں کے لئے وظائف، مفت یونیفارم اور ہاسٹلوں کی تعمیر کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

یہ بھی مانا جاتا ہے کہ تعلیم اور ملازمت میں مسلم OBC کی نمائندگی کو بہتر بنانے کے لئے OBC کوٹا میں مسلم OBC کے لئے ایک الگ کوٹا مقرر کرنا ضروری ہے۔

لیکن مسلمانوں کی طرف سے اکثر ذات کی سند حاصل کرنے میں آنے والی نوکرشاہی کی روکاوٹوں کی شکایت ملتی ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے یہ مسئلہ بھی بار بار اٹھایا جاتا ہے کہ بہت سی ایسی پچھڑی مسلم برادریاں ہیں جن کو مرکزی یا ریاستی یا دونوں ہی حکومتوں کی OBC فہرست میں اب تک شمولیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔

مسلم OBC اکثر روایتی پیشوں سے جڑے ہیں۔ لہذا عالمکاری کے نتیجے میں پیداشدہ صورت حال میں کاریگروں کی مہارتوں میں اضافہ اور ٹکنالجی کا معیار بلند کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

24.7.8 مسلم برادریوں کے لئے SC درجہ

مسلم سماجی ساخت میں اشراف اور اجلاف کو اعلیٰ ترین اور متوسط درجہ حاصل ہے۔ مگر ارزال کی کم ترین حیثیت ہے۔ یہ ان برادریوں پر مشتمل ہیں جن کے روایتی پیشے وہی ہیں جو درج فہرست ہندو ذاتوں (SC) کے ہیں۔ یہ مانا جاتا ہے کہ مسلم ارزال کی برادریاں اسلام قبول کرلینے والے ہندو 'اچھوتوں' پر مشتمل ہیں۔ مذہب کی تبدیلی سے ان کی سماجی یا اقتصادی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے روایتی پیشوں کی داغداری کے سبب وہ سماجی مقاطعہ کا شکار ہیں۔ اس کے باوجود انہیں اپنے ہندو ہم پیشہ لوگوں کی طرح SC کا درجہ نہیں دیا گیا۔

SC فہرست سے ان کا اخراج 1936 سے چلا آرہا ہے جب شاہی حکم (SC) کے تحت مسلمانوں کے محروم طبقے مثلاً حلال خور SC فہرست میں شامل کیے گئے مگر انہیں اس کے فوائد سے محروم کردیا گیا۔ نوآبادیاتی دور کے اس حکم کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کی حکومت نے اپنے آئینی حکم (SC) 1950 کے تحت ان برادریوں کو انہیں درپیش محرومیوں کے مطابق درجہ دینے سے محروم کردیا۔ بعد میں ہوئی ترمیمات کے تحت سکھوں کی بعض برادریوں اور نوبودھوں کو SC میں شامل کیا گیا۔ اس طرح اب صرف یکساں اصل کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہی اس درجہ سے محروم رکھا گیا ہے اس کی وجہ سے گدھیری، کورکن، مہتر یا حلال خور، مسلم دھوبی، جاکھو، نٹ، بمریا، لال بیگی اور دیگر مسلم برادریاں حد درجہ

غریبی اور محرومی کی شکار اور الگ تھلگ پڑی ہوئی ہیں۔

OBC فہرست میں ان کی شمولیت سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے کیوں کہ انہیں زیادہ ترقی یافتہ متوسط ذاتوں کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ کئی لوگوں کا کہنا ہے کہ 1950 کا حکم آئین کی دفعات 14، 15، 16 اور 25 سے ہم آہنگ نہیں ہے جن میں مواقع کی برابری ضمیر کی آزادی اور شہریوں کو مذہب، ذات یا عقیدے کی بنا پر ریاست کے ذریعے امتیازات سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دی گئی ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کی طرف سے اس بات پر زور دیا جاتا آیا ہے کہ ہندو SC جیسے کام کرنے والے مسلم طبقوں کو بھی SC فہرست میں شامل کیا جائے۔

SCs میں سے 1.7 فی صد خود کو مسلمان بتاتے ہیں۔

24.7.9 مسلم ST

ST آبادی میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم ہے۔ STs میں سے صرف 0.5 فی صد خود کو مسلمان بتاتے ہیں۔ ST مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد لکش دوییپ میں پائی جاتی ہے جہاں کی ساری ST آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہماچل پردیش کی ST آبادی میں مسلمانوں کا تناسب (7 فی صد) خاصا اہم ہے۔ دیگر مقامات پر مسلم ST کی تعداد بہت ہی کم ہے۔

مسلمانوں کی طرف سے بارہا ST حیثیت دیے جانے میں کارفرما امتیازات کا سوال اٹھایا جاتا ہے۔ مثلاً اتر پردیش میں ہندو بنجاروں کو ST فہرست میں رکھا گیا مگر ان کے مسلم ہم پیشہ لوگوں کو OBC فہرست میں ڈال دیا گیا۔

اگر چہ تمام ST لوگوں کو بلالحاظ مذہب تمام فوائد حاصل ہیں مگر قبائلی پس منظر کے تمام مسلمانوں کو یہ فوائد فراہم نہیں ہیں۔ ان فوائد سے محروم بہت سے مسلم طبقوں نے ST حیثیت دیے جانے کا مطالبہ کیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنی سماجی ساخت کے لحاظ سے اشراف، اجلاف اور ارزال کے 3 طبقوں پر مشتمل ہیں۔ ان تینوں کو مختلف قسم کے مثبت اقدام درکار ہیں۔ دوسرے گروپ یعنی اجلاف / OBC کو مزید توجہ کی ضرورت ہے جو ہندو OBC جیسی ہی ہو سکتی ہے۔ تیسرے گروپ کو جس کے روایتی پیشے ہندو SC جیسے ہی ہیں سب پسماندہ طبقوں (MBC) میں شامل کیا جاسکتا ہے کیوں کہ مجموعی طور پر مظالم کا شکار ہونے کی وجہ سے انہیں رزرویشن سمیت بہت سے فلاحی اقدامات کی ضرورت ہے۔

24.7.10 مسلم خواتین اور ان کے مسائل

اشراف میں عزت کا تصور بہت قوی ہے جو اکثر خواتین کی تعلیم اور ملازمت تک رسائی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اس کی وجہ سے خواتین اقتصادی سرگرمیوں اور عوامی زندگی سے بھی دور رکھی جاتی ہیں کیوں کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورتوں کے باہر نکلنے اور غیر مردوں سے ملنے جلنے سے خاندان کی عزت خطرے میں پڑ جائے گی اسی وجہ سے آج بھی جب کہ متوسط اور اعلیٰ طبقہ کی مسلم خواتین زیادہ سے زیادہ تعلیم اور ملازمت کی طرف رجوع کر رہی ہیں پھر بھی عوامی زندگی میں ان کی شرکت محدود ہے۔

تقسیم ہند کے بعد روزگار کے بہتر مواقع کی تلاش میں بہت سے مسلم نوجوان پاکستان منتقل ہو گئے۔ اس کے سبب کچھ عرصہ تک ہندوستان میں رکنے والی مسلم لڑکیوں کے لئے مناسب رشتے ملنا مشکل ہو گیا اور مجبوراً انہیں ملازمتیں اختیار کرنی پڑیں۔ آزادی کے بعد ہونے

والے فسادات میں پہچانے جانے کیے ڈر سے بہت سی مسلم خواتین نے برقعہ پہننا چھوڑ دیا۔ان اسباب کی بنا پر کچھ حد تک عزت کے تصور کی بنا پر عورتوں کے باہر نکلنے سے جڑی ناپسندیدگی کم ہوگئی۔لیکن حال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ عالمی اسلامی رجحانات سے متاثر ہو کر اور اپنی اسلامی شناخت کے اظہار کے طور پر مسلم خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد حجاب اختیار کر رہی ہے۔

پیشاورانہ ذاتوں میں عورتوں سے عزت کا تصور نہیں جڑا تھا کیوں کہ ان کی خواتین کو کسبابی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا ان میں بھی ان ذاتوں کو اعلیٰ درجہ حاصل تھا جن کی عورتیں صرف اشراف گھروں کی خواتین کی خدمت کرتی تھیں اور مردوں سے ان کا سابقہ نہیں پڑتا تھا جیسے منہیر، نائی اور میراسی۔اس کے برعکس نیچی ذاتوں کی خواتین کو غریبی کے سبب کھیتیوں میں مزدوری یا اس قسم کے دوسرے کام کرنے پڑتے تھے۔

یہ بھی دل چسپ بات ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جب نیچی ذات والے خاندانوں کی اقتصادی حیثیت بہتر ہوتی ہے تو وہ بھی اپنی خواتین کی اقتصادی سرگرمیوں پر پابندی لگا دیتے ہیں اور ان کو پردہ میں رکھنے لگتے ہیں۔یعنی ذات سے جڑی اپنی حیثیت کو بہتر بنانے کے لئے وہ اونچی ذاتوں کی تقلید کرتے ہیں۔

جہیز

جہیز کا جو نظام ہندوؤں میں رائج ہے اس پر ماضی میں شمالی ہندوستان کے مسلمان عمل نہیں کرتے تھے۔شادی سے قبل فریقین کے درمیان لین دین کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا تھا۔لڑکی کے والدین اپنی مرضی سے اور اپنی حیثیت کے مطابق بیٹی اور داماد کو تحفے دیتے تھے جو کپڑے اور زیورات کے علاوہ برتن اور گھر کے دیگر سامان پر مشتمل ہوتے تھے۔لیکن حال میں یہ دیکھا گیا ہے کہ دولہے اور اس کے گھر والوں سے توقعات کم ہوتی جارہی ہے اور لڑکی کے والدین سے بڑھتی جارہی ہیں، زیادہ سے زیادہ لین دین اشراف اور غیر اشراف دونوں میں سماجی مرتبے کی علامت بنتا جارہا ہے۔

خاص طور پر غیر اشرف طبقوں میں نہ صرف یہ کہ لین دین بڑھ رہا بلکہ یہ رجحان بھی بڑھتا جارہا ہے کہ پہلے سے ہی طے کرلیا جاتا ہے کہ لڑکی کے والدین کو کیا سامان دینا ہوگا جس کے متعلق لڑکے اور اس کے گھر والوں کی طرف سے مطالبے روز بروز بڑھتے جارہے ہیں۔مطالبے نہ پورے ہونے کی صورت میں شادی کے بعد لڑکی کے ساتھ بدسلوکی اور ازدواجی اختلاف کا پیدا ہونا عام ہے۔

یہ سب چیزیں اس بات کی علامت ہیں کہ بالخصوص غیر اشراف مسلم طبقوں میں باقائدہ طور پر جہیز کے نظام کو اپنایا جارہا ہے۔مزید افسوس کی بات ہے کہ اکثر بیٹی کی تعلیم پر پیسے خرچ کرنے کے بجائے والدین اس رقم کو اس کے جہیز کے لئے بچا کر رکھتے ہیں دراصل جیسے جیسے شادیاں سماجی حیثیت کی علامت بنتی جارہی ہیں اور ان میں دکھاوا اور زیادہ سے زیادہ خرچ کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔اس کے مضر اثرات لڑکے کے مقابلے میں لڑکی کے گھر والوں پر کہیں زیادہ پڑ رہے ہیں۔

مسلم خواتین کی باختیاری (Empowerment)

عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ مسلم خواتین ہندو خواتین کے مقابلے میں کم 'باختیار' ہیں لیکن اعداد و شمار سے اس رائے کی تصدیق نہیں

ہوتی۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ کسی کنبہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ بالغ شخص کے عورت ہونے کا امکان سب سے کم اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں ہے اور مسلم اور نیچی ذات کے کنبوں کے لئے اس کا امکان یکساں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں میں ایسے گھرانوں کی زیادہ کثرت ہے جو خواتین کی سربراہی میں ہیں۔

لیکن ساتھ ہی جیسا کہ پہلے دیکھا جا چکا ہے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے مقابلے میں کام میں خواتین کی شرکت مسلم کنبوں میں کم اور نچلی ذات کے ہندوؤں میں زیادہ ہے۔

صنفی انصاف

مسلمانوں کو اس بات کا احساس ہے کہ ان کے صنفی امور کو بھی مذہبی رنگ دے دیا جاتا ہے۔ مسلم خواتین سے متعلق چند منتخب واقعات و معاملات پر جس طرح حد درجہ توجہ دی جاتی ہے اور انہیں میڈیا میں نہایت جوش و خروش سے بحث کا موضوع بنایا جاتا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ہی مسلمانوں میں موجود صنفی ناانصافی کا واحد سبب ہے۔ نتیجتاً سول سوسائٹی اور ریاست مسلم خواتین کی محرومیوں کے اسباب سماجی امتیازات اور غلط ترقیاتی پالیسیوں میں نہیں بلکہ فرقے کے مذہب اور اندرونی معاملات میں تلاش کرتے ہوئے سارا الزام انہیں پر ڈال کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔

عدم تحفظ کا مسئلہ

فرقہ وارانہ تصادم کے واقعات کے نتیجے میں (خاص طور پر وہ جن میں مسلم خواتین کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے) مسلمانوں میں گہرا خوف، کمزوری اور عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس سے خصوصاً لڑکیوں کا ربط و تعلق (mobility) اور تعلیم بری طرح متاثر ہوتی ہے۔

رہائشی علاحدگی (Ghettoisation)

ملک کے بعض حصوں میں مسلمانوں کے سماجی بائیکاٹ نے انہیں ان مقامات سے نکلنے پر مجبور کر دیا ہے۔ جہاں وہ صدیوں سے رہ رہے تھے۔ اس سے ان کے روزگار اور آمدنی پر منفی اثر پڑا ہے۔

خاص طور پر فرقہ وارانہ طور پر حساس علاقوں کے مسلمانوں میں اپنے تحفظ کے خیال سے علاحدہ بستیوں میں رہنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ ان کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ میونسپل اور حکومت کے حکام مسلمانوں کے ان اکثریتی علاقوں کو بآسانی نظر انداز کرنے لگتے ہیں۔ پانی، صفائی، بجلی، اسکول، صحت کی سرکاری سہولتیں اور، بینک، آنگنواڑی، راشن کی دکانیں، سڑکیں، ٹرانسپورٹ کی سہولتیں یہ مسلم علاقوں میں کم سے کم ہوتی ہیں۔ ان خدمات کی ناموجودگی سب سے زیادہ مسلم خواتین کو متاثر کرتی ہے کیوں کہ انہیں یہ سہولتیں اپنے 'محفوظ محلوں' کے باہر سے حاصل کرنے میں جھجھک ہوتی ہے۔

مسلم فرقے کی بڑھتی ہوئی رہائشی علاحدگی اجتماعی زندگی میں اس کی شرکت کے دائرے کو تنگ کر رہی ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یہ ایک غیر صحتمند رجحان ہے جو بڑھ رہا ہے۔

معلومات کی جانچ

(1) ہندوستانی مسلم سماج میں پائے جانے والے طبقوں کی وضاحت کریے۔

(2) مسلم OBC میں کون سے طبقات شامل ہیں؟

(3) کیا ذات اور سیاست کا آپسی تعلق ہے؟ وضاحت کیجیے۔

(4) جہیز کے نقصانات بیان کیجیے۔

24.8 خلاصہ

آزادی کے بعد سے ہندوستان نے اہم پیش رفت کی ہے۔اس نے غریبی کم کرنے اور خواندگی، تعلیم اور صحت جیسے اہم انسانی ترقیاتی اشاریوں کو بہتر کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ تمام مذہبی وسماجی طبقوں کو ترقیاتی عمل کے ثمرات میں برابر کا حصہ نہیں ملا ہے۔

ان فرقوں (SRCs) میں مسلمان جو ملک کی سب سے بڑی اقلیت میں اور ملکی آبادی میں جن کا تناسب 14 فی صد ہے بیشتر انسانی ترقیاتی، اشاریوں کے لحاظ سے حد درجہ پیچھے ہیں۔لہٰذا مسلم صورت حال کو محض ایک اقلیتی مسئلہ نہیں بلکہ قومی مسئلہ سمجھا جانا چاہیے۔

اس کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر احساس محرومی پایا جاتا ہے۔مگر آزادی کے بعد سے مذہبی اقلیتوں کی سماجی و اقتصادی حالت کا تجزیہ کرنے کی کوئی منظم اور باضابطہ کوشش نہیں کی گئی۔سماجی ومذہبی طبقوں سے متعلق اعداد وشمار کی فراہمی کے معاملے میں نمایاں تبدیلی 1990 کی دہائی میں ظاہر ہوئی۔اس کی بنیاد پر ہی 2006 میں سچر کمیٹی کی رپورٹ ممکن ہوسکی جو ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں اعداد وشمار پر مبنی تحقیق کی اپنے طرز کی اولین کوشش تھی۔

مسلم آبادی اور صحت کے حالات کا تجزیہ کرنے سے بعض دلچسپ نتائج سامنے آتے ہیں:

☆ شرح پیدائش میں خاصی کمی ہونے سے مسلم آبادی میں اضافہ کا عمل ماند پڑا ہے۔آئندہ شرح افزائش اور بھی کم ہوگی۔

☆ عام خیال کے برعکس مسلمانوں میں بچوں کی پیدائش روکنے اور مانع حمل طریقوں کے استعمال کا سلسلہ خاصہ مضبوط ہے۔اس لئے ضروری ہے کہ مسلم جوڑوں کو ان کی مرضی کی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

☆ بچوں میں شرح اموات اور بچوں کی صحت کے معاملے میں مسلمانوں کی حالت اوسط سے قدرے بہتر ہے۔مگر چوں کہ صحت کے مجموعی حالات اطمینان بخش نہیں ہیں اس لئے انہیں بہتر کرنے کی ضرورت ہے۔شہری غریبوں کو صحت کی سہولتیں فراہم کرنے سے غریب مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا کیوں کہ جنوبی اور مغربی ریاستوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد شہری علاقوں میں رہتی ہے۔

☆ مسلمانوں کی علاقہ وار آبادی کی صورت حال یکساں نہیں ہے کیوں کہ ان کی خاصی بڑی تعداد ایسی ریاستوں میں رہتی ہے جو ترقی

کے معاملے میں پچھڑی ہوئی ہیں۔

☆مسلم والدین جدید یا بنیادی دھارے کی تعلیم اور اپنے بچوں کو قابل برداشت مصارف والے سرکاری اسکولوں میں بھیجنے کے خلاف نہیں ہیں۔وہ اپنے بچوں کو لازمی طور پر مدارس بھیجنے کو ترجیح نہیں دیتے۔مسلمان بھی اسی باضابطہ تعلیم کو ترجیح دیتے ہیں جو ملک کے بچوں کو دستیاب ہے۔مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریزی میں تعلیم کو ترجیح دیتا ہے جبکہ بعض لوگ اردو کو بطور ذریعہ تعلیم پسند کرتے ہیں۔سرکاری اسکولوں تک مسلم بچوں کی رسائی محدود ہے۔

☆عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ مسلم والدین کے نزدیک لڑکیوں کی تعلیم ضروری نہیں ہے اور یہ کہ اس سے ان میں غلط خیالات پیدا ہوسکتے ہیں۔مزید یہ کہ اگر لڑکیوں کو اسکولوں میں داخل بھی کرایا جاتا ہے تو نوعمری ہی میں شادی کے لئے انہیں اسکول سے اٹھالیا جاتا ہے جس کی وجہ سے مسلم لڑکیوں میں ترک تعلیم کی شرح زیادہ ہے۔لیکن اصل مسئلہ ابتدائی تعلیم کی سطح پر ایسے اسکولوں کا نہ ہونا ہے جہاں لڑکیاں آسانی سے جاسکیں۔اس کے علاوہ لڑکیوں کے ہاسٹلوں، خاتون ٹیچروں اور تعلیم کے اگلے مرحلوں میں تعلیمی وظیفوں کی ناموجودگی بھی اہم رکاوٹیں ہیں۔

دیگر فرقوں کے مقابلے میں مسلم کارکن زیادہ بڑی تعداد میں خود اپنے طور پر پیداواری اور تجارتی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ باتنخواہ ملازمتوں (بطور خاص حکومت یا بڑے سرکاری اور نجی زمرے کے اداروں) میں ان کا حصہ دیگر فرقوں کے کارکنوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔روزگار کے حالات کے لحاظ سے وہ نسبتاً زیادہ بے حفاظت ہیں کیوں کہ ان کی زیادہ بڑی تعداد کا غیر باضابطہ زمرے کے کاموں سے واسطہ ہے۔کام کے حالات (ملازمت کی مدت، سماجی تحفظ وغیرہ) باضابطہ کارکنوں میں بھی دیگر فرقوں کے مقابلے میں مسلمانوں میں بدتر ہیں۔

تعلیم میں اضافے کے فوائد مسلمانوں کے لئے کافی رہے ہیں۔اس کے باوجود اعلیٰ تعلیم میں مسلمانوں کی شرکت بہت کم ہے۔اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ تعلیم حاصل کرلینے کے بعد بھی باضابطہ ملازمت حاصل کرپانے کا امکان مسلمانوں کے لئے زیادہ نہیں ہے۔

مسلمانوں کو خاصی غریبی کا سامنا ہے بالخصوص شہری علاقوں میں ان کی حالت SC/ST سے بس کچھ ہی بہتر ہے۔مختلف ریاستوں اور طبقوں کے مسلمانوں کے حالات میں قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے۔مسلم فرقہ ترقی کے تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے۔مسلمانوں کی حالت کم وبیش SC/ST سے کچھ بہتر مگر ہندو OBC، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں سے بدتر ہے۔کثیر مسلم آبادی والی ریاستوں میں یہ صورت حال مغربی بنگال، بہار، اترپردیش اور آسام میں بطور خاص سنگین ہے۔لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان خساروں اور محرومیوں کے باوجود مسلمانوں میں نوزائیدوں کی شرح اموات اور صنفی تناسب بہتر ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے حالات میں نمایاں علاقائی فرق نظر آتا ہے۔جنوبی علاقہ کی کارکردگی بہتر ہے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حالات علاقہ کی اقتصادی ترقی سے جڑے ہوئے ہیں۔دراصل یہ صرف کچھ حد تک صحیح ہے۔اس کے علاوہ کچھ اور عوامل بھی ہیں جو مسلم صورت حال پر اثر انداز ہوتے ہیں جیسے مثبت اقدامات، سیاسی طور پر متحرک اور منظم ہونا، تاریخی پس منظر اور حکمرانی کی نوعیت۔

24.9 نمونے کے امتحانی سوالات

درج ذیل سوالات کے جواب تیس سطروں میں لکھیے۔

(1) ہندوستان کی مسلم آبادی کی نمایاں خصوصیات کیا ہیں؟

(2) مسلمانانِ ہند کی تعلیمی صورت حال مختصراً بیان کریے۔

(3) ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی صورت حال کا خاکہ پیش کریے۔

(4) مسلم سماج کی ساخت کی بنیادی خصوصیات بیان کریے۔

درج ذیل سوالات کے جواب پندرہ سطروں میں لکھیے۔

(1) آزادیٔ ہند کے بعد مسلمانوں کے حالات کا اجمالی تعارف پیش کریے۔

(2) مسلم نوزائدوں کی شرح اموات کم ہونے کے کیا اسباب ہیں؟

(3) کس سطح کی تعلیم کو سب سے اہم بتایا گیا ہے اور کیوں؟

(4) معاشی صورت حال کے کچھ اشاریے بیان کریے۔

(5) مسلم خواتین کے مسائل اور ان کے حل پر روشنی ڈالیے۔

24.10 مخففات

BC(s) Backward Class(es)	پسماندہ طبقہ (طبقے)
GAR Graduate Attainment Rate(s)	گریجویٹ تعلیم یابی
HCR Head Count Ratio	خط افلاس سے نیچے رہنے والے لوگوں کی تعداد
IAS Indian Administrative Service	
IPS Indian Police Service	
MBC(s) Most backward Class(es)	سب سے پسماندہ طبقہ (طبقے)
MPCE Mean Per Capita Expenditure	اوسط فی کس اخراجات
OBC(s) Other backward Class(es)	دیگر پسماندہ طبقہ (طبقے)
PSU(s) Public Sector Undertaking(s)	سرکاری زمرے کا ادارہ (ادارے)
SC(s) Scheduled Caste(s)	درج فہرست ذات (ذاتیں)

SHG(s): Self-help Group(s)	مائکروفائنینس کا طریقہ ،دیہی غریبوں کا گروہ جو رضا کارانہ طور پر تشکیل دیا جاۓ ۔ تمام اراکین پیسے بچا کر ایک مشترکہ فنڈ میں جمع کرتے ہیں جس میں سے ان کو چھوٹے قرضے آسان شرائط پر ملتے ہیں۔
SRC(s) Socio-religious community(ies)	سماجی و مذہبی طبقہ،گروہ یا زمرہ
ST(s) Scheduled Tribe(s)	درج فہرست قبیلہ (قبائل)
WPR Worker Population/ Work Participation Rate/ Ratio	کارکن آبادی تناسب/کام میں شرکت یا حصہ داری کی شرح ۔ یہ اندازہ کرنے میں مدد دیتی ہے کہ کوئی آبادی اقتصادی سرگرمی میں کس حد تک شریک ہے۔

24.11 مطالعہ کے لئے معاون کتابیں

(1) ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی، اقتصادی اور تعلیمی حالت (سچر کمیٹی رپورٹ) حکومت ہند، نومبر 2006

http://www.zakatindia.org/images/Sachar%20Report%20Urdu%20-%201.pdf

2) Rakesh Basant and Abusaleh Shariff (ed.) (2010) *Oxford Handbook of Muslims in India: Empirical and Policy Perspectives. New Delhi: OUP.*